افکارِ عالم

فکر اسلامی کی روشنی میں

علمی، ادبی تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

جلد دوم

مولانا نظام الدین اسیر ادروی

شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم دیوبند

تفصیلات

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر انتظام

بدرالدین اجمل علی القاسمی، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلۂ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی (　　)

نام کتاب　:　افکارِ عالم فکر اسلامی کی روشنی میں (جلد دوم)

تالیف　:　مولانا اسیر ادروی

سن اشاعت　:　شعبان ۱۴۲۹ھ اگست ۲۰۰۸ء

صفحات　:　۴۱۶

تعداد اشاعت:　بارِ اول، گیارہ سو

کمپیوٹر کتابت:　محمد عیاض قاسمی، دیوبند

ہدیہ　:　=/

ناشر

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

فون: 01336-222429

ترتیب

حرفِ اول

مولانا اسیر ادروی بہت اچھا لکھنے والوں میں ہیں، ان کی متعدد کتابیں مختلف موضوعات پر آ چکی ہیں، جنہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، موصوف جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتے ہیں، زیرِ نظر کتاب ان کے لکھے ہوئے مضامین کا اہم مجموعہ ہے، یہ تمام مضامین ماہنامہ ''ترجمان الاسلام'' میں شائع ہو چکے ہیں، مولانا ہی اس رسالہ کے ایڈیٹر بھی ہیں، موصوف کی خواہش تھی کہ ان کے یہ مضامین شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیو بند سے کتابی صورت میں شائع کر دئے جائیں، حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب مفتی مدرسہ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس اور رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم، نے ان کی یہ خواہش اپنی سفارش کے ساتھ مجلس شوریٰ میں پیش کر دی، مؤقر اراکین شوریٰ نے کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کو منظور کر لیا، اور اکیڈمی کو ہدایت دی کہ مولانا اسیر ادروی کے یہ مضامین جو علمی بھی ہیں، ادبی بھی اور تاریخی اہمیت کے حامل بھی، کتاب کی صورت میں شائع کر دیئے جائیں، کتاب ۲۳×۳۶=۱۶ سائز میں آٹھ سو صفحات سے آگے جا رہی تھی، اس ضخامت کی وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ اس کو بجائے ایک جلد میں طبع کرنے کے دو جلدوں میں لایا جائے، بعض دوسرے حضرات کی بھی یہی رائے تھی، اس لئے مضامین کے اس مجموعے کو دو جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ کتاب کسی ایک موضوع پر مسلسل نہیں ہے بلکہ مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا ایک اچھا اور مفید مجموعہ ہے، اس لئے دو جلدوں میں ہونے کے بعد بھی ہر جلد بجائے خود مکمل ہے، جس سے پوری طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ بھی فاضل مؤلف کی دوسری کتابوں کی طرح قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور یہ بھی امید ہے کہ زندگی کی علمی و ادبی شاہراہ پر مولانا کا سفر جاری رہے گا۔

کفیل احمد علوی

انچارج شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیو بند

۹ر شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۲ر اگست ۲۰۰۸ء

''عرفانِ محبت'' کا مطالعہ

آیئے آج ہم کچھ دیر کے لئے شعر وادب کی گلریز وادی میں چلتے ہیں، جہاں زعفران زار کشمیر کی مشکبار ہوائیں چلتی ہیں، جہاں تاج کی چاندنی نور برساتی ہے اور مالوہ کی سہانی سلونی رات کی زلف معنبر خوشبوئیں لٹاتی ہے۔

''شعر وادب'' چمکتے ہوئے صاف وشفاف بلور کا پیمانہ ہے، کوئی اس میں کوثر وتسنیم اور زمزم کے لطف لیتا ہے اور روحانی کیف وسرور کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، کوئی اس میں وھسکی اور رِم کی چسکیاں لیتا ہے اور اس کی نگاہوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں، جہاں رقص وسرور کی محفلیں جمی ہوئی ہیں اور حسن وشباب کے عریاں نظارے دعوت نظر دیتے ہیں، یہ جام بلور کسی کو عشق حقیقی کی لطافت و پاکیزگی کی مقدس فضاؤں میں لے جاتا ہے اور کسی کو عریانی وفحاشی اور ہوا وہوس کی کثافت ہی کثافت دیتا ہے، یہ اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنا اپنا ذہن ومزاج۔

آج ہم صہبائے محبت کا ایک ایسا پاکیزہ چھلکتا ہوا جام پیش کرنا چاہتے ہیں جو ''مئے طہور'' سے لبالب بھرا ہوا ہے کہ اگر چھلک کر زمین پر اس کے چند قطرے گر جائیں تو ان حیات بخش قطرات سے چمن زار عشق حقیقی لہلہا اٹھے اور وہ گل بوٹے کھلیں کہ زمین لالہ زار بن جائے، اور جو اس کے چند گھونٹ پی لے تو اس کی نگاہوں کے سامنے سے وہ حجابات اٹھ جائیں جو ''حسن مستور'' کی تجلیوں کے لئے حجاب بنے ہوئے ہیں۔

عشق ومحبت جیسا پاکیزہ لفظ عشق مجازی اور بوالہوسی کی دنیا میں اپنے کثرت استعمال کی وجہ سے اپنی پاکیزگی، اپنا تقدس اور اپنی لطافت ونفاست کھوتا جارہا ہے یہ لفظ زبان پر آتے ہی دل ہوا وہوس کے ایمان سوز نظاروں میں کھو جاتا ہے، اب یہ ایک ایسا پامال اور فرسودہ لفظ بن چکا ہے کہ زبان سے اس کا اظہار بھی ثقاہت کے خلاف محسوس ہونے لگا ہے۔

البتہ کچھ اہل دل نے اس کی آبرو کو بچائے رکھا ہے مگر ان کو کتنا خون جگر جلانا پڑا ہے، سوز و گداز کی کیسی کیسی بھٹیوں میں اپنے افکار و خیالات کو تپا کر کندن بنانا پڑا ہے اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سلوک و معرفت کی راہوں سے گذرے ہیں، جنہوں نے عشق حقیقی کے تپتے ہوئے صحراؤں کی رہ نوردی کی ہے اور محبوب حقیقی کی طلب میں شب بیداری، تہجد گذاری، ذکر و فکر کی خارزار وادیوں سے گذرتے ہوئے اپنے تلووں کو لہولہان کیا ہے۔

ایسے لوگ کہیں کہیں پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں جو عشق حقیقی اور محبت کے چراغ کو اپنے خون جگر سے روشن کرتے ہیں لیکن جب اس چراغ کی روشنی فضا میں پھیلتی ہے تو روشنی کے دیوانے اس پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے ہیں، ایسی ہی ایک عظیم ترین شخصیت قدوۃ العارفین شیخ المشائخ مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی ؒ کی تھی جن کا مجموعہ کلام ''عرفان محبت'' اس وقت میرے سامنے ہے، ان کی ذات مرجع خلائق ہی نہیں مرجع علماء و مشائخ بن گئی تھی، ان کی خدمت میں ہندوستان کے مشاہیر علماء، محدثین اور مشائخ کی حاضری و استفادہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے، بڑے بڑے مدعیان علم و فن کو ان کی مجلس میں سر جھکائے ہوئے دیکھا گیا ہے، اس لئے ان کے کلام کی حلاوت میں روح کی لطافت، اور قلب کی پاکیزگی، عشق کی شوریدگی، جوش و سرمستی شامل ہے، اس کا ظاہری لباس بڑا شوخ اور رنگین ہے لیکن ذرا ٹھہر کر اس کی گہرائی اور معنویت پر غور کیجئے تو عشق حقیقی کا سوز و گداز، باطنی کیف و درد کی ایک دنیا نظر آتی ہے۔

شعر و ادب میں جب محبت کا لفظ آتا ہے تو مادی نگاہوں کے سامنے شادابی و رعنائی کا ایک پیکر جمیل آجاتا ہے، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لب، میخانہ بدوش آنکھیں اور گھٹاؤں سے چشمک زنی کرتی ہوئی زلف شبگوں کہ جس کو چھو لینے، پا جانے اور چوم لینے کا ایک شدید جذبہ ایک جوان دل میں جاگ جائے، ہوسناک نگاہوں کے اس کھیل کو محبت کا نام دیا جاتا ہے، شعراء اس کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں اس طرح عشق

ومحبت کے ایک پاکیزہ جذبے کو رسوا کیا جاتا ہے، اس کے تقدس کو پامال کیا جاتا ہے، مرزا غالبؔ کو بھی اس کا احساس تھا اس نے اس کا ماتم بھی کیا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مولانا پرتاپ گڈھی کے یہاں محبت ایک پاکیزہ اور مقدس ترین جذبے کا نام ہے تصوف وسلوک اور معرفت کی کٹھن راہوں کی ایک منزل ہے اور عارفین کا ایک بلند ترین مقام ہے جہاں تک رسائی کچھ آسان نہیں، اس محبت یا عشق حقیقی کی وادی میں وہی قدم رکھ سکتا ہے جو آبلہ پائی کی شکایت نہ کرے، پاؤں کے چھالوں کی اذیت کا احساس نہ ہو اس کی ساری کائنات لٹ جائے تو اس کو کوئی غم نہ ہو، اپنے اور یگانے بیگانے ہو جائیں تو اس کو اس کا کوئی ملال نہ ہو، دنیاوی زندگی کے سارے سہارے ٹوٹ کر بکھر جائیں تو اس کو صدمہ کے بجائے خوشی ہو کیوں کہ اس کے دل میں محبوب حقیقی کی بے پناہ محبت کے سوا اور کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے مولانا موصوف نے خود اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

نہ کوئی راہ پا جائے، نہ کوئی غیر آ جائے حریم دل کا احمد اپنے ہر دم پاسباں رہنا

اگر آپ نے بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہے، ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر کچھ استفادہ کیا ہے تو آپ نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ کہیں رنگ جلال غالب ہے، ہر بات میں سختی، ہر قدم پر داروگیر، ہر لغزش پر تنبیہ اور سرزنش، مسترشدین ہر قدم پر لرزاں وترساں، اس کے برعکس کہیں رنگِ جمال غالب ہے ہر ایک سے شفقت ومحبت، ہر ایک کی دلداری ہر ایک سے قربت ومحبت، اظہار ندامت پر مسرت، غلطیوں اور لغزشوں پر عفو وکرم، ہر مسترشد کو یہ یقین کہ مجھے قربت واختصاص حاصل ہے، یہ ان مشائخ کے یہاں ہوتا ہے جن پر جلال کے بجائے جمال کا غلبہ ہے، خطا کاروں کی نازبرداری اسی محبت کی وجہ سے ہوتی ہے جو محبت مرشد کو محبوب حقیقی سے ہوتی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدرت نے ان کے دلوں کو پھولوں میں بسا دیا ہے، ان کے تنفس سے محبت کی خوشبو پھوٹتی ہے ان کے الفاظ اتنے شیریں ہوتے ہیں کہ دلوں میں

اتر جاتے ہیں، یہ ان مشائخ کی غیر اختیاری کیفیت ہوتی ہے ان کی مجلس میں جانے والے ہر شخص کو اس سے کیف و سرور حاصل ہوتا ہے، اس کا دل کھنچتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کے قدموں پر سر رکھ دے، اسی کا نام ''فیضان محبت'' ہے مرکز محبت تو مرشد کا دل ہوتا ہے اس سے فیوض و برکات کا صدور غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے اور ہر شخص اس سے فیضیاب ہوتا ہے لیکن خود طالب کا دل محبت کا مرکز بن جائے اس بلند مقام کا حاصل کرنا کچھ آسان نہیں اسی لئے ایک شاعر نے کہا ہے ع

فیضان محبت عام تو ہے، عرفان محبت عام نہیں

مولانا موصوف کے دیوان میں سیکڑوں اور ہزاروں بار لفظ محبت کا استعمال ہے یہاں تک کہ ان کے مجموعۂ کلام کا نام بھی ''عرفان محبت'' ہے جہاں جہاں بھی موصوف نے لفظ محبت استعمال کیا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ارضی اور مادی محبت سے ماورا کوئی دوسری شئے ہے جو نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

'عشق مجازی'' میں محبت و رقابت لازم و ملزوم ہیں لیکن مولانا موصوف کے کلام مین اس کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ وہ محبت کے مفہوم کو اتنا وسیع اور اتنا بلند بنا دیتے ہیں کہ وہ اس کائنات پر چھا جاتی ہے اس محبت میں نہ کوئی حریف ہے اور نہ رقیب، بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ''محبت'' ایک مسلک زندگی ہے جس کی طرف دعوت دی جاتی ہے، اور جو محبت میں شاعر کا شریک ہوتا ہے وہ ان کا ہم مسلک ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو ان کی محفل میں عزت و وقار حاصل ہوتا ہے، مندرجہ ذیل اشعار پڑھیئے اور لفظ محبت کی معنوی وسعت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے وہ فرماتے ہیں۔

ہاتھوں میں ہے ہر وقت ہی دامانِ محبت | کچھ اور ہی عالم میں ہیں خاصانِ محبت
جو بھی ہوا سو جان سے قربانِ محبت | واللہ وہی ہو گیا سلطانِ محبت
حاصل نہیں جب تک تجھے عرفانِ محبت | کامل نہیں ہرگز ترا ایمانِ محبت
کیا کہنا ہے، اللہ رے فیضانِ محبت | ہر آن نظر آتی ہے اک شانِ محبت
ہر حال میں رہتے ہیں غزل خوانِ محبت | فردوس بہ داماں ہیں غلامانِ محبت

رونا کبھی ہنسنا کبھی، جلنا کبھی بجھنا الوان محبت ہیں، یہ الوانِ محبت

خاصانِ محبت، سلطان محبت، غلامانِ محبت کے قوافی پر نظر ڈالئے، کیا غزل کے کسی شاعر کے یہاں یہ قافیے استعمال ہو سکتے ہیں، مقطع میں بھی اہل محبت سے خطاب ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رقابت کا تصور بھی اس محبت میں ممکن نہیں، محبت ایک مسلک زندگی ہے جس کی ایک علیحدہ دنیا ہے، فرماتے ہیں:

فرماتے ہیں یہ اہل محبت، ہو مبارک احمد! تیرا دیوان ہے، دیوانِ محبت

ایک دوسری غزل میں بھی مفہوم محبت کی جو وضاحت پیش کی گئی ہے اسی کے شواہد ملتے ہیں، اس غزل کی بھی ردیف، محبت ہے، اس غزل کا مقطع ہے۔

ادھر ہی ہوا میں بھی احمد روانہ چلا جس طرف کاروانِ محبت

ارضی اور مادی محبت میں تنگ دلی، تنگ نظری ہوتی ہے اور رقابت کی اتنی چنگاریاں راہوں میں ہوتی ہیں کہ وہاں کاروانِ محبت کی ترتیب ہی ناممکن ہوتی ہے، موصوف کے ساتھ پورا کاروانِ محبت ہے جس میں سے ہر ایک فرد کو محبت کا دعویٰ ہے اور سب کا محبوب بھی ایک ہی ہے ورنہ کارواں کیسے مرتب ہوتا، یہ کاروانِ محبت ایسا کارواں ہے کہ اس میں راستے کے ہر موڑ پر لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

شاعر کے نزدیک دعوائے محبت درحقیقت عہد نامہ کی پابندی کا نام ہے، محبت کی شریعت کے اوامر و نواہی ہیں اس کے احکام اور اس کی شرائط کی پابندی ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو محبت کا دعویٰ کرتا ہے شاعر کو اس کا احساس ہی نہیں، یقین ہے، وہ فرماتے ہیں:

بھولے ہیں نہ بھولیں گے کسی حال میں ہرگز ہر وقت نگاہوں میں ہے پیمانِ محبت

جو لوگ مقام جمال پر فائز ہیں، وہ ہر وقت اپنے حال میں مست رہتے ہیں، ان کے باطن کی نگاہیں اتنی روشن ہوتی ہیں کہ وہ ہمہ وقت جلوۂ محبوب سے اکتساب فیض میں مصروف رہتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے پورے وجود پر جوش، کیف و سرمستی چھائی رہتی ہے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہر حال میں رہتے ہیں غزل خوان محبت فردوس بداماں ہیں غلامانِ محبت
ہروقت جہاں ہیں ترے جلووں کی بہاریں فردوس کہیں یا اُسے زندانِ محبت

ہے ہر وقت اک کیف ومستی کا عالم جہاں سے الگ ہے جہانِ محبت
محبت محبت زباں پر ہے جاری ہماری زباں ہے زبانِ محبت

شاعر کو اپنے مقام ومرتبہ کا احساس ہے اس کو محبت کا عرفان حاصل ہے، لیکن سلوک ومعرفت میں اس راز کا زبان پر آنا اپنے مقام ومرتبہ کا دوسروں کو احساس دلانا جرم ہے، اس کا زبان پر آنا ناممکن ہے، اس لئے جب بات کہی جاتی ہے تو استعاروں اور کنایوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

کبھی عرش پر ہیں کبھی فرش پر ہیں یہ شانِ محبت یہ آنِ محبت

اس محبت کے کچھ آداب ہوتے ہیں، کچھ تقاضے ہوتے ہیں، تواضع، خاکساری خود کو اس راہ میں مٹادینا، خودی کو پامال کردینا اس محبت کی پہلی منزل ہے، اس راہ میں انانیت اور پندار سم قاتل ہے خود اپنی ہستی اور وجود پر مالکانہ تصرف بھی جائز نہیں، کیوں کہ محبوب حقیقی نے محبت کرنے والوں کی جان اور مال سب خرید لیا ہے **اِنَّ اللّٰہ اشْتَریٰ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَھُمْ** ہمارا وجود ہماری جان بھی ہماری کہاں رہی، موصوف فرماتے ہیں:

محبت تیری یہ برکت، محبت تجھ پہ صد رحمت نہیں پندار دیکھا میں نے سرشار محبت میں
کوئی نازاں نہ ہو گر جان بھی ان پر فدا کردے نہیں کچھ جان کی قیمت ہے بازار محبت میں

محبت میں ایک مقام وہ آتا ہے جب محبت کرنے والے میں خود شان محبوبیت پیدا ہو جاتی ہے یہ کمال محبت کی دلیل ہوتی ہے یہ مقام کاملین کو حاصل ہوتا ہے پھر عوام وخواص کا رجوع ان کی طرف ہونے لگتا ہے جس طرح محفل میں شمع روشن ہو جاتی ہے تو پروانے از خود اس کے گرد آجاتے ہیں، لیکن وہ اپنی ذات کی منزل نہیں منزل نما بنائے رکھتے ہیں دوسروں کو ان کی ذات سے محبوب حقیقی کی طرف رہنمائی حاصل ہوتی

ہے موصوف کہتے ہیں:

پکڑ لے ہاتھ جوان کا وہی محبوب تک پہنچے خوشا، یہ شان محبوبی، فدا کار محبت میں
خدا کا فضل ہے ورنہ میں اس قابل نہ تھا احمد کہ میں نے آگ جو بھردی ہے اشعار محبت میں

مولانا موصوف نے سلوک و معرفت کی مئے طہور کو پیش کرنے کے لئے غزل کا پیمانہ استعمال کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ اس پیمانے کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی ہے بات وہی ہے، انداز بیان بھی وہی ہے، لب ولہجہ بھی غزل کا ہے مگر ان کی غزل پڑھتے ہوئے ذرا رُک کر شعروں پر غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسری دنیا کی بات ہے۔

محبوب سے ملاقات، سوال و جواب، کیف و سرور کا ایک نیا عالم ہوتا ہے اور محبت کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ بن جاتا ہے، پھر محبوب حقیقی کا مقام عرش بریں ہے اس لئے محبوب حقیقی جس جگہ کو اپنی تجلیات کا مرکز یا اپنی جلوہ گاہ بنالے وہ جگہ خود عرش بریں بن جاتی ہے، محبوب سے قربت محبت کی معراج ہے اگر اس مقام پر فائز ہو جانے کی وجہ سے سالک پر کیف و سرمستی طاری ہو جائے تو یہ عین فطرت ہے، درج ذیل اشعار کو دیکھئے، اور پڑھئے، اور روحانی سرور وانبساط حاصل کیجئے، اور یہ بھی سوچئے کہ اس سے خوب صورت غزل اور کیا ہوسکتی ہے۔

ہے کیف سے لبریز سوالات کا عالم جنت کی بھی جنت ہے جوابات کا عالم
واللہ، نرالا ہے، تیری بات کا عالم بالا ہے تخیل سے، تری ذات کا عالم
محسوس لگا ہونے کہ دل عرش بریں ہے اللہ رے یہ ان کی ملاقات کا عالم
دل جھومنے لگتا ہے مسرت سے ہمارا یاد آتا ہے جب ان کے خطابات کا عالم

معرفت وسلوک میں سالک کا ایسے مقامات سے گذر رہوتا ہے کہ عقل وخرد کی دنیا جو مادیات کے مشاہدے کی عادی ہے اس کو محال سمجھتی ہے، کرۂ زمہریر، کرۂ نار اور خرقِ التیام کی بحث کرنے لگتی ہے اور کبھی اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، ہر قدم پر عقل وخرد کا ہاتھ رہوار فکر کی لگام کھینچ لیتا ہے لیکن حقیقت حقیقت ہی رہے گی، مادی اسباب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عقل وہاں تک نہ پہنچ سکے تو اس کا قصور ہے،

موصوف نے اس کا اظہار ایک شعر میں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

کہنے کی نہیں بات یہ، کہتا ہوں مگر خیر پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم

لاکھ مشاہدۂ حق کی گفتگو ہو مگر بادۂ و ساغر کہے بغیر بات بنتی نہیں عشق مجازی اور عشق حقیقی کی واردات و کیفیات کے بیان میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کی جاسکتی اور اگر بیچ میں کوئی دیوار کھڑی کردی جاتی ہے تو غزلیت مجروح ہوتی ہے انداز بیان میں وہ جاذبیت اور دل کشی باقی نہیں رہتی اور سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ سالک اگر اپنی واردات و کیفیات کا اظہار اشارات و کنایات کے پردوں میں بیان کرنے کے بجائے غیر مبہم الفاظ میں بیان کرے تو دعویٰ محبت کے خام ہونے کا الزام آجاتا ہے، رازِ عشق کا افشاء بذات خود محبت کی شریعت میں ناقابل معافی جرم ہے اس لئے غزل ہی کا لب ولہجہ اور انداز بیان مستعار لینا پڑتا ہے، مولانا موصوف مرشد کامل اور شیخ المشائخ ہیں، اہل دل ہیں، شان جمالی کے مظہر ہیں، ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے اور ان اشعار کو پڑھئے۔

اب رفتہ رفتہ ہوش میں کچھ آرہے ہیں ہم محفل سے ان کی روتے ہوئے جارہے ہیں ہم
جب آرہے تھے دل کا تھا عالم ہی اور کچھ عالم ہی دل کا اور ہے جب جارہے ہیں ہم
یہ راز وہ ہے جس کو سمجھتے ہیں اہل عشق کچھ کھورہے ہیں شوق سے کچھ پارہے ہیں ہم

آخری شعر کی معنوی وسعتوں پر نگاہ ڈالئے محبوب حقیقی کو پانے کے لئے دنیاوی عزت و شہرت، دولت و ثروت، اعزاز و افتخار، آرام و آسائش، عہدۂ و منصب سب کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے تب کہیں جاکر اگر قسمت نے یاوری کی تو اس کی محفل مین بار پاسکتے ہیں، اپنی ساری کائنات کو ٹھکرا دینے کو کچھ کھو رہے ہیں شوق کے لفظ سے تعبیر کررہے ہیں گویا اپنی ساری کائنات لٹا کر خوش ہیں اپنی بے سرو سامانی پر نازاں ہیں لیکن اس کے صلے میں محبوب حقیقی کی محبت و قربت جیسی دولت بے بہا حاصل ہوئی اس کو ''کچھ پارہے ہیں ہم'' کے پردۂ ابہام میں چھپا لے گئے کیونکہ اس کے اظہار کی اجازت نہیں، سچی بات یہ ہے کہ کسی شخصیت بالخصوص اللہ والوں کی شخصیات اور ان کے مقام

ومرتبہ کو سمجھنا کچھ آسان نہیں موصوف نے بڑا مزہ لےلیکراس کو خود بیان کیا ہے۔

احمد! تجھے نہ جانا، نہ سمجھا تمام عمر گوساتھ جارہے ہیں ترے، آرہے ہیں ہم

بہت سے قرآنی حقائق کو غزل کے لباس میں اتنا خوشنما بنا کر پیش کیا ہے کہ پہلے مرحلہ میں نگاہ اس کی تہ تک نہیں پہنچتی ہے اور جب ذہن اس معنی کا ادراک کر لیتا ہے تو اس کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے تو لیلائے حقیقی بےحجاب سامنے آجاتی ہے، قرآن میں خدا نے کہا ہے **نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الوَرِيْد** ہم انسان کی رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ہم نے خدا کو دیکھا ہے، اسی طرح قرآن نے اپنے مخلص بندوں کے متعلق کہا ہے **فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ** مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، ظاہر ہے کہ دونوں کی یاد میں زمین آسمان کا فرق ہے خدا بندے کو یاد کرے یہ معراج عبدیت ہے، اور یہ مقام بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے موصوف کی غزل کے یہ چند اشعار پڑھئے۔

قیامت ہے ترا نزدیک ہوکر دور ہو جانا نظر کے سامنے رہتے ہوئے مستور ہو جانا

یہ اکرام محبت ہے، یہ انعام محبت ہے کہ اس کے فضل سے ذاکر کا بھی مذکور ہو جانا

یہ محبت ہی کا فضل ہے کہ خدا بندے کو یاد کرتا ہے غالب نے بھی اس نکتہ کو پالیا تھا اور اس نے کہا تھا۔ ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اگر چہ اس میں ایک نئی بات کہی گئی ہے مگر مولانا موصوف نے اس کو انعامِ محبت اور اکرام محبت سے تعبیر کر کے دونوں کے یاد کرنے کے فرق کو ظاہر کر دیا ہے گویا محبوب کی طرف سے طالب کے جذبہ محبت کا اعزاز بھی ہے اور محبت کی طرف سے انعام بھی، اور یہی حقیقت واقعہ بھی ہے۔

سالک کی دنیا ہی اور ہوتی ہے اسکی خوشی وغم کے اسرار کو کون سمجھے گا یہ تو باطنی کیفیات کے زیر اثر ہیں اور وہاں تک کسی نگاہ کی رسائی بہت مشکل ہے موصوف فرماتے ہیں۔

ارے ناداں نہ سمجھے گا یہ اسرار محبت ہیں کبھی رنجور ہو جانا، کبھی مسرور ہو جانا

جو ہیں اہل محبت بس وہی اس کو سمجھتے ہیں　　　کسی کا دیکھ لینا، درد کا کافور ہو جانا

شریعت کی پابندیوں کو خدا کی نعمت تصور کرتے ہیں کیونکہ اگر یہ پابندیاں نہ ہوتیں تو انسان اور حیوان میں کیا فرق رہ جاتا جب کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، موصوف کہتے ہیں۔

اگر آزاد ہم ہوتے، خدا جانے کہاں ہوتے　　　مبارک عاشقوں کے واسطے دستور ہو جانا

سلوک وطریقت کی راہوں میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سالک تجلیات کی پھوار میں نہا جاتا ہے، کیف وسرمستی کے ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہے کہ اس کا لفظوں میں بیان دشوار ہو جاتا ہے لیکن تزکیۂ نفس کے لئے کبھی کبھی کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔

قیامت ہے ترے عاشق کا مجبور بیاں رہنا　　　زباں رکھتے ہوئے بھی، اللہ اللہ بے زباں رہنا

اگر دل میں قوت تحمل ہے اور آنکھوں کو تاب نظارہ ہے تو محبوب حقیقی کی قربت اسے نصیب ہو جاتی ہے موصوف کا شعر ہے۔

مبارک تجھ کو اسرار کرم کا راز داں رہنا　　　مبارک ہو زمیں پر تیرا بن کر آسماں رہنا

زمین وآسمان کے تقابل نے شعر میں جو حسن پیدا کر لیا ہے وہ تو اپنی جگہ ہے، اب اسی غزل کے چند اشعار اور۔

یہ فیضانِ محبت ہے یہ احسانِ محبت ہے　　　سراپا داستاں رہتے ہوئے بے داستاں رہنا

یہی ضبط محبت ہے، یہی شرط محبت ہے　　　تڑپنا رات دن اور پھر بھی بے آہ وفغاں رہنا

یہ معراجِ محبت ہے، یہ اعجاز محبت ہے　　　ہزاروں زخم کھا کر مسکرانا، شادماں رہنا

آخری شعر کا صحیح مفہوم وہی لوگ زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جو حضرت موصوف کی نجی زندگی سے واقف ہیں، ان کی جلوت وخلوت کی مصروفیتوں سے آشنا ہیں اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے ہے، موصوف کی زندگی کو یقیناً محبت کا اعجاز اور آپ کو محبت کی معراج حاصل تھی۔

ارضی اور مادی محبت جن مراحل سے گذرتی ہے ہر غزل گو شاعر اس کا اظہار کرتا ہے، کیفیات، واردات اور اس کے اظہار میں عشق حقیقی وعشق مجازی دونوں میں

یکسانیت ہے، لیکن جس کا دل عشق حقیقی کی لذتوں سے آشنا ہوتا ہے اس کی بات ہی اور ہوتی ہے سطحی محبت کے غزل گو شعرا جو کچھ کہتے ہیں یہاں بھی اس سے مختلف لب ولہجہ نہیں ہے، اب درج ذیل اشعار اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر پڑھئے کہ اس کا کہنے والا شیخ وقت ہے، مرشد کامل ہے ساری دنیا سے کٹ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا ہے، لباس چہرہ ہر چیز سے جذب وجنوں کیف وسرمستی شوریدگی وارفتگی نمایاں ہے اس لئے اس کی زبان سے جو بات نکلی ہے وہ یقیناً اس دنیا کی نہیں، اس کا عالم ہی اور ہے موصوف کا ایک شعر ہے، یہ یاد رکھئے کہ ''وعدۂ فردا'' اردو غزل کا خاص لفظ ہے۔

بنا دیا مجھے بے کیف یاد فردا نے   گذر رہی ہے جو دل پر، وہ کوئی کیا جانے

یادفردا اس شعر کی جان ہے کل میدان حشر قائم ہونے والا ہے، حساب وکتاب کا مرحلہ درپیش ہوگا محبوب حقیقی کی بارگاہ میں حاضری ہوگی، ہم نے محبت ادا کرنے میں جو کوتاہیاں کی ہیں اس کی جوابدہی کرنی ہے، ظاہر ہے یہ فکر جاں سوز اور روح گداز ہے اس لئے آج کی زندگی بے کیف ہوجائے تو یقیناً یہی ایک فطری ردعمل ہے، اسی غزل کے چند شعر اور سنئے، اردو غزل میں ایک ذات شریف حضرت ناصح کی بھی ہوتی ہے شعراء نے اس پر خوب طبع آزمائی کی ہے موصوف نے جو کچھ کہا ہے وہ سب سے جداگانہ ہے، آپ کا ایک شعر ہے۔

خدا کی شان، وہ آئے ہیں ہم کو سمجھانے   نہیں جو شمع محبت کے ہائے پروانے

ہمارے پاس پہنچتے ہیں اڑ کے پیمانے   کہیں بھی ہم ہوں مگر فیض ہے یہ ساقی کا

پیمانے کا اڑ کر پہنچنا اردو غزل میں ایک نیا خیال ہے، مگر دوسری طرف یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ سالک کا وہ مقام ہے جو پوری زندگی کو تج دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

وہ بدنصیب بھلا کیف درد کیا جانے   نہ جس کے دل پہ لگی چوٹ ہو محبت کی

جس کا دل محبت آشنا نہیں، وہ درد محبت کی لذت سے ناواقف ہے وہ تو بدنصیب

ہے پھر اسے کسی اہل محبت کو سمجھانے اور نصیحت کرنے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے۔

کمال عشق یہ ہے کہ ساری کائنات لٹادو، متاع زندگی کو محبوب کے قدموں پر نچھاور کردو مگر لب کو سی رکھو، زبان خاموش ہو، یہ سبق پروانے سے حاصل کرو، موصوف کہتے ہیں۔

کمال یہ ہے کہ آواز تک نہیں آتی　　وفور شوق میں یوں جل رہے ہیں پروانے

پھر اس شعر کے بعد مقطع نے پہلے شعر کو مئے دو آتشہ بنادیا ہے، کہتے ہیں۔

نثار جان حزیں کردے شوق سے احمد　　کھڑا ہے کون؟ ذرا دیکھ، تیرے سرہانے

محبت کی معراج یہی ہے کہ محبوب کے قدموں میں حیات مستعار کو ڈال کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوجائے، مولانا پرتاپ گڈھی کی شاعری تفریح طبع کے لئے نہیں تھی بلکہ ان کی زندگی کا مشن تھا اس مشن کے لئے اپنی شاعری کے ذریعہ انہوں نے کچھ رہنما اصول بنائے ہیں، ان کا کوئی شعر قافیہ پیمائی کے لئے یا قافیہ سے مجبور ہوکر نہیں کہا گیا ہے، وہ نثر سے زیادہ اپنے اشعار سے اپنی مجلسوں میں کام لیتے تھے، وہ بہ تکلف یا مشق ومزاولت سے شاعر نہیں بنے بلکہ قدرت نے ان کی زبان پر الہامات کی بارش کردی اور قدرت نے خود ہی ان سے شعر کہلوائے ہیں، آپ خود غور کریں کہ ایک انتہائی پسماندہ اور دور افتادہ گاؤں میں نشو ونما پائی، گاؤں کی سادہ زندگی گذاری، دیہاتی زبان اور دیہات کے لباس میں زندگی کا بڑا حصہ گذارا چالیس سال کی عمر سے پہلے آپ کی زبان سے ایک شعر نہیں نکلا نہ کسی شاعر کے دیوان کا مطالعہ کیا اور نہ شعر وشاعری کی طرف طبعی رجحان تھا، نوجوانی ہی میں تصوف کی طرف میلان ہوا اور ہندوستان کے مشہور شیخ مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے ایک خلیفہ سے بیعت ہوگئے وہ بزرگ اگر چہ جامعہ از ہر مصر میں سترہ سال تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور پوری بخاری شریف نوک زبان تھی مگر تصوف کا اتنا غلبہ ہوا کہ دیہاتی زندگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، اتنی سادہ زندگی بسر کی کہ یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ عالم فاضل ہیں، مولانا پرتاپ گڈھی ان سے بیعت تھے، مرشد کا رنگ مسترشد پر لازمی طور پر پڑتا

ہے، ان حالات میں مولانا موصوف کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نظر نہیں آتا کہ یہ کہا جا سکے کہ اس نے رہوار شاعری کو مہمیز کیا ہوگا اور ان کی شاعری کی قوت خوابیدہ کو بیدار کر دیا ہو، بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری الہامی ہے اور عطیہ خداوندی، اسی راہ سے قدرت ان سے اصلاح وتزکیہ باطن کا کام لینا چاہتی تھی خود کہتے ہیں۔

یہ دل کی ہے آواز جو آتی ہے زباں پر　　توبہ کریں، کیا کہتے ہیں؟ شاعر میں نہیں ہوں

ان کی مجلسوں میں حاضری دینے والے بتاتے ہیں کہ حضرت پرتاپ گڈھی پر جب ایک خاص طرح کا کیف طاری ہوتا تو اپنی مجلس میں اشعار پڑھتے اور ترنم سے پڑھتے تھے، سننے والوں کا تاثر یہ ہوتا تھا کہ جیسے الفاظ زبان سے نہیں دل سے نکل رہے ہیں، اور سامعین پر وہی کیف طاری ہو جاتا تھا جس میں وہ خود ڈوبے ہوئے رہتے تھے، سلوک ومعرفت کے اسباق اپنے اشعار کی زبان میں پڑھاتے تھے ذرا آپ صورتِ حال کا تصور کیجئے ایک عمر رسیدہ سیدھا سادہ انسان معمولی لباس میں نصف ساق تک چڑھا ہوا پاجامہ، موٹا ڈھیلا ڈھالا لنبا کرتا دو پلی یا گول سادہ ٹوپی، دائم المریض، ہر دم دوا کا سلسلہ جاری جو دوا چاہے کھلا دیجئے وہ یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے تھے کہ یہ دوا کیوں کھلائی جارہی ہے، ایسا شخص ترنم سے اشعار پڑھے، ترنم بھی ایسا نہیں کہ قوت سامعہ کے لئے اس میں کوئی دلکشی ہو لیکن ان کے اشعار پر پوری مجلس سر دھنتی تھی، رقت قلب سے آنکھیں بھر آتی تھیں دل بولنے لگتا تھا اور رجوع الی اللہ کے جذبے کو ایک غیر مرئی ہاتھ بیدار کر دیتا تھا۔

عرفان محبت کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں جہاں نگاہ رک گئی، کچھ ٹھہر کر سوچا پھر پڑھا، دل نے جو اثر قبول کیا وہی تاثرات آپ کے سامنے میں نے پیش کر دیئے ہیں، اردو شاعری کے نقاد ''عرفان محبت'' کو کس نگاہ سے دیکھیں گے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، ہوسکتا ہے لفظوں کے بازیگر اس کے بعض ثقیل الفاظ پر اعتراض کریں، تعقید لفظی پر انگلیاں اٹھائیں، ترکیبوں اور جملوں کی بندش کے بارے میں نکتہ چینی کریں، میں اس طرح کی تنقید کو اس لئے بے محل سمجھتا ہوں کہ یہ شاعری اپنی قادر الکلامی کے

اظہار کے لئے نہیں ہے بلکہ شاعری کو اپنے بلند مقاصد کے لئے ذریعہ بنایا گیا ہے اگر اوپر کی منزل پر جانے والے زینے کی ایک دو اینٹیں خستہ ہوں تب بھی وہ دوسری منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

حضرت پرتاپ گڈھی شیخ المشائخ اور قطب الاقطاب کہے جاتے تھے ہندوستان کے مشاہیر علماء ومشائخ ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، عارفین ان کے مقام ومرتبہ سے واقف تھے وہ ان کی شاعری کے پردے میں چھپے ہوئے حقائق محسوس کرتے تھے اور سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ عشق حقیقی کی جو آگ ان کے سینے میں بھڑک رہی تھی غزل کے ذریعہ اسی آتش شوق کی گرمی ان لوگوں کے دلوں تک پہنچا رہے تھے جو عشق کی حرارت سے خالی تھے، مولانا موصوف کی شاعری کو صرف اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے، انہوں نے خود بھی کہا ہے۔

تنہا نہ چل سکیں گے، محبت کی راہ میں ۔۔۔ میں چل رہا ہوں آپ مرے ساتھ آیئے
میں چل رہا ہوں منزل مقصود کی طرف ۔۔۔ چلنا ہو آپ کو بھی تو ہمراہ آیئے

حضرت نانوتوی کا قصیدہ بہاریہ

در نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسن کاکوروی کا قصیدہ ’’سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل‘‘ کافی مشہور ہے کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے سلسلہ میں یہ ایک نیا تجربہ تھا، لیکن اس قصیدہ پر ہندو مذہبیات کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ دیر تک رہوارِ فکر کاشی اور متھرا کی فضاؤں میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ وحدانیت اور توحید کا پیغام لیکر آنے والے شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال ایسے ماحول اور ایسی فضا میں کیا جانا چاہئے تھا جو آپ ﷺ کے منصب نبوت کے شایان شان ہے۔

اس کے برخلاف مولانا قاسم نانوتویؒ کے قصیدہ بہاریہ میں ایک ایسی لطیف و پاکیزہ، عشق ومحبت کے جذبات میں آگ لگا دینے والی فضا کی منظر کشی اور مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہے جو دلوں کو بدمست اور سرشار کر دیتی ہے، احساسات پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے، شوریدگی و آشفتگی اور ایسی بیتابی کا ماحول بن جاتا ہے جو محبوب رب العالمین کے استقبال اور خیر مقدم کے شایان شان ہے عشق میں دیوانگی کا ظہور بہار کی آمد سے وابستہ ہے، گریبان کے چاک کرنے اور دامن کو تار تار کرنے کا یہی موسم ہے، پوری اردو شاعری اس کی عکاس ہے اس لئے حضرت نانوتوی کا یہ نعتیہ قصیدہ بہاریہ ہونے کی وجہ سے بڑا وجد آفریں اور احساسات کو مہمیز کرنے والا ہے اور جب بہار کی منظر کشی کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل آتا ہے تو روح عشق ومحبت کے جذبات سے سرشار ہو جاتی ہے۔

حضرت نانوتوی شاعر تھے؟ میرے ذہن میں اسکا تصور بھی نہیں تھا، کیوں کہ میں ان کو تحصیل شاملی کے محاذ پر تلوار چلاتے ہوئے دیکھتا ہوں، میلہ خدا شناسی میں پادریوں اور آریہ سماجیوں کو ایسے گھاٹ پر مارتے پاتا ہوں جہاں ان کو پانی بھی نہ مل

سکا، رڑکی میں دیانند سرسوتی کی پناہ گاہ مین گھس کران کی چرب زبانی کے لبادہ کو تار تار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، فرسودہ اور بوسیدہ علم کلام کی جگہ ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال کراس پر ایک شاندار محل تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے دار العلوم دیو بند کا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں آخر انہوں نے شعر وشاعری سے کب دلچسپی لی؟ ان کی شخصیت اور ان کے گرد وپیش کے ماحول سے شاعری کا کوئی جوڑ اور ربط نظر نہیں آتا، وہ تنہائی پسند، تقشّف کی حد تک زاہد مرتاض نظر آتے ہیں لیکن ان کے کاغذات میں یہ قصیدہ بہاریہ نعتیہ ملا تو یقین کرنا پڑا کہ یہ کلام انہیں کا ہے اور یہ جوہر بھی ان کی تہ در تہ شخصیت میں کہیں پوشیدہ تھا جس کا ظہور بعد میں ہوا۔

حضرت نانوتوی غالب، مومن اور میر کے ہم عصر ہیں یہ تینوں اردو شاعری کے اکبر، جہاں گیر اور شاہجہاں ہیں، اقلیم سخن پر ان کی حکمرانی تھی، حضرت نانوتوی اس حکمراں طبقہ میں نہیں تھے وہ تو عبد الحق محدث دہلوی شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبد العزیز محدث کی صف میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ذہین وفطین انسان اپنے گرد وپیش پر ناقدانہ نظر رکھتا ہے، اپنے گرد وپیش کے حالات سے بے تعلق ہوکر بھی اس کا مزاج شناس ہوتا ہے، شاعری بھی اس دور میں ذریعہ اظہار کا بہت مؤثر وسیلہ تھا اگر علماء کی صفوں میں بھی اس ذریعہ اظہار کو اپنانے والے کچھ لوگ ملتے ہیں تو یہ کوئی حیرتناک بات نہیں ہے، حضرت نانوتوی کا شمار بھی انہیں علماء میں تھا جن کی فطرت میں جوہر شاعری پوشیدہ تھا، اور اس کا کبھی کبھی ظہور بھی ہوا۔

حضرت نانوتوی کا وہ قصیدہ (۱۵۱) اشعار پر مشتمل ہے، اس کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپ کہنہ مشق اور ایک قادر الکلام شاعر تھے، لیکن اس کمال کا ظہور اس لئے نہیں ہوا کہ آپ کے سامنے ایک طوفانی زندگی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی جو آپ کے شاعرانہ جذبات کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی اس سے نبرد آزمائی وقت کا پہلا اور بڑا فریضہ تھا، اس طوفانی دور میں شاعری ''تیز آندھی میں

چراغوں کا سفر ہو جیسے‘‘ لیکن یہ حیرت انگیز حقیقت کیسے تسلیم کی جائے، اتنے طویل قصیدہ کہنے میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب سالہا سال مشق سخن کا سلسلہ رہا ہو، یک بیک اتنا مرصع کلام تخلیق کرنا تجربات کی دنیا میں قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا لیکن حضرت نانوتوی کا کلام ہم کو کہیں نظر نہیں آتا سوائے اردو و فارسی کی چند نظموں کے، اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے آپ نے نظمیں لکھی ہونگی لیکن نہ کسی کو سنایا نہ اس کی اشاعت ہونے دی پھر وہ ضائع ہو گئیں اس کی حفاظت آپ نے مناسب نہیں سمجھی ہوگی لیکن ان تمام شکوک وشبہات کے باوجود یہ قصیدہ بہاریہ آپ کی تخلیق ہے اور اس کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت نانوتوی میں قوت تخیّل وہبی تھی، ہر ذہین وفطین انسان کی فطرت میں یہ جوہر موجود رہتا ہے اور اس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوتا ہے لیکن طائر تخیل کی بلند پروازی کو اپنے حدود میں رکھنے کے لئے قوت ممیّزہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ بے سمت پرواز کو روک سکے اور یہ جوہر تجربات ومشاہدات پر گہری نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ کسبی ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں حضرت نانوتوی میں یہ دونوں قوتیں بدرجہ اتم موجود تھیں صرف الفاظ کا صحیح استعمال جو تخیل کی بنائی ہوئی تصویر متشکل کر کے دوسروں کے سامنے پیش کر سکے اسی کا نام شاعری ہے حضرت نانوتوی کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر پوری قدرت حاصل تھی اس لئے وہ اس طویل قصیدہ کے کہنے میں کامیاب ہوئے، قصیدہ پر غائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا ہے کہ الفاظ کی گہرائی معنویت اور ان کی وسعتوں پر آپ کی نگاہ تھی آپ کی نثری کتابوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس لئے یہ طویل قصیدہ آپ کے قلم کا شاہکار بن کر ظاہر ہوا تو کوئی تعجب خیز انکشاف نہیں بلکہ ایک صداقت تھی جو دیر میں ظاہر ہوئی۔

ایک بات اور حضرت نانوتوی کا ابتدائی دور اردو کے عنفوان شباب کا دور تھا ابھی اس میں پختگی نہیں آئی تھی بہت سے الفاظ اس زمانہ میں مستعمل تھے جو بعد میں متروک ہوئے، یہ الفاظ اردو شاعری میں ہر شاعر کے یہاں ملتے ہیں اسی طرح بہت سے

الفاظ کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی آج سے مختلف تھا بعد کے دور میں اس کی بھی اصلاح کردی گئی، اس لئے حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ میں بھی ایسے الفاظ، تلفظ اور لب ولہجہ کو اختیار کیا گیا ہے جو بعد کے دور میں متروک ہوئے اس قصیدہ کا مطالعہ اسی دور کے چوکھٹے میں رکھ کر کرنا چاہئے۔

قصیدہ میں تخیل کی بلند پروازی، تجربات ومشاہدات کی خوب صورت منظر کشی مظاہر فطرت کا مطالعہ اور اس کی تصویر کشی اتنے دل کش انداز میں ہے کہ پڑھتے ہوئے طبیعت پھڑک اٹھتی ہے، قصیدہ کا عنوان ہے ''قصیدہ بہاریہ درنعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

نہووے نغمہ سرا کس طرح سے بلبل زار — کہ آئی ہے نئے سر سے چمن چمن میں بہار
ہر اک کو حسب لیاقت بہار دیتی ہے — کسی کو برگ، کسی کو گل اور کسی کو بار
کیا ہے بھیج کے سیل آب چاہ کو معزول — بجائے بادصبا، بوئے گل ہے کار گذار
کریں ہیں مرغ چمن سارے مشق موسیقی — کہ گانے ہیں انہیں اس سال شکر حق میں ملار

حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ بہار کی آمد آمد کا شہرہ ہے، آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے پھولوں کی خوشبو فضا میں ہر طرف دڑتی پھرتی جیسے بادصبا کے ہاتھ سے چمن کی آرائش کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور بوئے گل چمن کو سنوارنے اور سجانے میں لگی ہوئی ہے تمام مرغان چمن نے جو خوش الحان ہیں ابھی سے موسیقی کی مشق شروع کردی ہے کیونکہ جب بہار کی سواری اس سال آئے گی تو اس کے استقبال میں استقبالیہ ترانے گانے ہیں اس کی بعد حضرت نانوتوی کہتے ہیں۔

بہار گل کی خبر سن کے چھڑکے ہے پانی — سحاب، سبزۂ پژمردہ پر کہ ہو ہوشیار
پھریں ہیں کھیلتے آب رواں و بادصبا — کھلے ہیں غنچے ہنسیں ہیں گل وخوش ہیں ہزار
خوشی سے مرغ چمن ناچ ناچ گاتے ہیں — کفِ ورق سے بجاتے ہیں تالیاں اشجار
اچھلتے ہیں کہیں دیکھ اک طرف کو فوارے — کہیں ہیں کودتے اونچے سے آب پر ابشار
چمن کو دیکھ کے پھولا پھلا ہوا قمری — کرے ہے سرو پہ تسبیح حق پکار پکار

آدمی کی آنکھیں جب نیند سے بوجھل ہونے لگتی ہیں تو پانی کے چھینٹے ڈال کر اس کو ہوشیار کیا جاتا ہے اس تجربہ سے کام لیکر حضرت نانوتوی نے کہا: دھوپ کی شدت کی وجہ سے سبزے مرجھا جاتے ہیں جو چمن میں اداسی پیدا کرتے ہیں بادل کو خیال آیا کہ موسم گل کی آمد آمد کا شہرہ ہے اور کائنات کی ہر چیز کو سنوارنا سجانا اور اس کو استقبال کے لئے چاق و چوبند کرنا میری ذمہ داری ہے اس لئے اس نے اونگھتے ہوئے پودوں پر پانی چھڑک کر ان کو ہوشیار کردیا یہ ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ جوں ہی پہلی بارش ہوتی ہے سبزوں میں تازگی آجاتی ہے سکڑے سمٹے ہوئے سبزے پانی پی کر کھڑے ہوجاتے ہیں، پھر حضرت نانوتوی بتاتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی تشریف آوری کی خبر کائنات میں پھیلی ہوئی ہے اس لئے ہر طرف بہجت و مسرت کے نظارے نظر آتے ہیں، جب کہیں خوشی کی کوئی تقریب ہوتی ہے تو بچے بچیاں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے ہر طرف بے مقصد دوڑتے پھرتے ہیں ہنستے کھیلتے نظر آتے ہیں ہر دیکھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہاں کوئی جشن خوشی کی کوئی تقریب ہونے والی ہے، اس طرح کائنات کی ہر چیز فرط مسرت سے کھیل کود کررہی ہے آب رواں، بادصبا خوشی سے دوڑ بھاگ کررہے ہیں، چمن میں غنچوں اور پھولوں کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل رہی ہے، بلبل ہزار داستان اپنی جگہ "حق سرہٗ" کہہ کر اپنی خوشی کا اظہار کررہا ہے کہ اب جلدی بہار کا روح افروز دور آنے والا ہے جب اس کو نغمہ سرائیوں کا سنہرا موقعہ ہاتھ آئیگا۔

باغوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ ان کا گانا ہے ادھر ادھر پھدکتے پھرنا ان کا رقص مسرت ہے اس محفل طرب میں درختوں کے پتے ہوا کے جھونکوں سے تالیاں بجاتے ہیں پانی کے فوارے وفود مسرت سے اچھل رہے ہیں آبشار کا پانی پچاسوں فٹ کی بلندی سے نیچے پانی کی سطح پر کود کر اپنی مسرت کا اظہار کررہا ہے، قمری سرو کے اونچے اونچے درختوں پر بیٹھ کر بہجت و مسرت کے موقعہ پر "سبحان تیری قدرت" کے نغمے الاپ رہی ہے گویا پوری کائنات فرط مسرت سے جھوم رہی ہے، ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں ہر چیز سے مسرت نمایاں ہے، حضرت نانوتوی کا طائر فکر

کن کن وادیوں کی خبر رکھتا ہے درج ذیل اشعار دیکھئے۔

ہوا ہے چرخ کا سب، اب کے صرف بارش آب — زمین سے اسے ہووے گی حاجت امطار
چمن میں کثرت گل سے رہی نہ گنجائش — پھرے ہے چار طرف بوئے گل، خدائی خوار
عجب نہیں جو ممئیں آب تیغ سے پھر سر — کہ نام آب ہی نشو ونما کو ہے درکار
سمجھ کے تخم بشر، کیا عجب جو مردوں کو — قوائے نامیہ دیں اب کی بار برگ و بار

استقبال بہار کے اہتمام میں پورے چمنستان عالم کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے آسمان نے اتنی فیاضی سے بارش کی ہے کہ اس کا سارا خزانہ آب ختم ہو گیا ہے، اگر اتفاقاً آسمان کو بھی پانی کی ضرورت پیش آ گئی تو اس کو زمین سے پانی مانگنا پڑے گا، اسی وجہ سے چمن میں پاؤں رکھنے کی بھی گنجائش نہیں رہ گئی، انتہا یہ ہے کہ جو خوشبو ہمیشہ پھولوں کے ساتھ رہی جہاں پھول رہا وہیں خوشبو بھی رہی مگر پھولوں کے اژدحام کی وجہ سے خوشبو کو پھولوں کی صحبت نصیب نہیں کیونکہ چمن میں پاؤں رکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے اس لئے خوشبو ہر طرف آوارہ و سرگشتہ گھوم پھر رہی ہے شاعر کو صرف یہ کہنا ہے کہ ہر طرف خوشبو پھیلی ہوئی ہے، لیکن اس اندازِ بیان نے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کر دیا ہے پھر حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ بہار کی آمد آمد کی خبر سے نشو ونما کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ''آبِ تیغ'' (تلوار کی دھار) جو انسان سے حیات چھین لیتی ہے اس کا وجود مٹا دیتی ہے لیکن اب بہار کی قوت اتنی طاقتور ہے کہ آپ میں چونکہ پانی (آب) کا ذکر ہے اور اب صرف پانی کا نام لینا نشو ونما کے لئے کافی ہے اس لئے آب تیغ سے انسان مرنے کے بجائے زندگی پا جائیگا ایسی زبردست قوت نمو کی وجہ سی مُردوں اور لاشوں میں جان پڑ جائیگی کیونکہ قوت نمو اس کو تخلیق انسان کے لئے بیج سمجھ لے گی اور بیج سے پیداوار ہوتی ہے اس لئے انہی لاشوں سے انسان از سر نو وجود میں آ جائیں گے، یہ بہار کی پیدا کردہ زبردست قوت نمو کا فیض ہوگا، اس کے بعد کے اشعار ہیں۔

یقیں ہے اب کے تر و تازگی کے باعث سے — بغیر آگ کے پکنا ہو کشت کا دشوار

جو بوئیں ہاتھ سے اپنے ہی زاہدان خشک　　تو نکلے شجرہ طوبیٰ زدانہ ہالے شمار
شرار دانۂ بارود کو لگے ہیں پھول　　عموم فیض بہاری سے آگ ہے گلزار

کھیتوں میں گندم کی بالیوں میں دانے اس وقت پکتے ہیں جب ان کو دھوپ کی تمازت ملتی ہے کھیتوں کو سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، اس سال موسم بہار کی شادابی اور تر و تازگی کا یہ عالم ہے کہ سورج کی حرارت ناکام ہوگئی ہے اور کھیتوں میں دانوں کو پکانے کی صلاحیت اس سے ختم ہوگئی ہے اس لئے آگ جلا کر کھیتوں کو حرارت پہنچانے کا نظم کرنا ہوگا تبھی کھیتوں میں دانے پختہ ہونگے ''زاہدان خشک'' میں لفظ خشک سے کام لیتے ہوئے حضرت نانوتوی نے کہا کہ خشکی اور طراوٹ تو دونوں متضاد ہیں سوکھی زمین میں کوئی پودہ جم نہیں سکتا اگر دھول اڑاتی ہوئی زمین میں پودے گاڑ بھی دیئے جائیں تو چند گھنٹوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو جائینگے لیکن اب کے موسم بہار کی طراوٹ اور تر و تازگی اور شادابی کا حال یہ ہے کہ خشک زمین میں بھی پودے لگا دیئے جائیں وہ شجرۂ طوبیٰ کی طرح ہرے بھرے ہونگے ''زاہدان خشک'' کی مناسبت سے یہاں شجرۂ طوبیٰ کا ذکر کیا گیا ہے حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں کہ موسم بہار کی شدت طراوت اس درجہ کی ہے کہ بارود کا ذرہ ذرہ جو ایک چنگاری ہوتا ہے وہ پھول بن گیا ہے، بارود ایک آتش کدہ اور آگ کا خزانہ ہے اور موسم بہار کے صدقے میں گل و گلزار ہوگیا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ پر آگ گلزار بن گئی تھی

یہ فیض عام ہے سر پر ہرن کی شاخیں ہیں　　بدن میں شیر کے گل، اور دم میں سیہہ کے خار
بجھائی ہے دل آتش کی بھی تپش، یا رب　　کرم میں آپ کو دشمن سے بھی نہیں انکار
بساط سبزہ، مشجر بنا ہے صحن چمن　　پڑا جو سطح پہ سبزہ کے سایۂ اشجار

بارہ سنگھا کے ہرن کے سر پر شاخ در شاخ سینگیں ہوں یا شیر کے بدن پر بالوں کے گچھے جو پھول کی شکل اختیار کر گئے ہیں یا ساہی کے بدن پر جو لمبے لمبے کانٹے ہیں وہ سب اسی بہار کا صدقہ ہے، اور شدت طراوت کا یہ عالم ہے کہ آگ کے سینے میں جو تپش اور جلن ہے وہ بھی بجھ گئی ہے حالانکہ آگ اور پانی میں ازلی بیر ہے اور ایک

دوسرے کے دشمن ہیں لیکن پانی کی شرافت اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دشمنوں سے بھی سلوک کرنے سے اس کا انکار نہیں ہوتا اس نے آگ کے دل میں جو تپش تھی اس کو ختم کر کے آگ کو راحت پہنچائی آخری شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس پر شاعر کی قوت مشاہدہ داد و تحسین کی مستحق ہے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کیا ہے، کہتے ہیں کہ صحن چمن میں سبزہ کا ہرا ہرا فرش بچھا ہوا تھا وہ شطرنجی یعنی پھول دار فرش بن گیا ہے کیونکہ درختوں کے سائے جب سبزے کے ہرے ہرے فرش پر آتے ہیں تو دھوپ چھاؤں کی وجہ سے یہ سبز فرش، معلوم ہوتا ہے کہ صحن چمن مین شرنجی بچھا دی گئی ہے، اور بہت پر تکلف فرش کا اہتمام نظر آتا ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں۔

ہوا کو غنچۂ دل بستہ کی ہے دل جوئی ادھر ہے آب تلک شاخ و برگ سب پہ نثار
کرے ہے سبزۂ نو خاستہ پہ گل سایہ اوڑھاتی آب رواں کی ہیں چادریں انہار
یہ قدر خاک ہے، ہیں باغ باغ وہ عاشق کبھی رہے تھا سدا جن کے دل کے پیچ غبار

فطرت نے چمن کی آرائش میں ہوا اور پانی سب کو لگا رکھا ہے تا کہ کوئی آزردہ خاطر نہ رہے غنچہ یا کلی جب تک پھول نہ بنے اس کی پتیاں سمٹی رہتی ہیں اس کو ''دل بستہ'' بجھے ہوئے دل کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور چمن میں کوئی آزردہ خاطر نہ رہے اس لئے ہوا غنچۂ دل بستہ کی خوشامدیں کر رہی ہے اس کو جھولا جھلا رہی ہے تا کہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگے، پانی کی پھواریں تمام درختوں، پودوں اور پھول پتیوں کو نہلا رہی ہیں، پانی ان پر نچھاور اور قربان ہو کر ان کی شادابی میں اضافہ کر رہا ہے، چمن میں جو سبزے نئے نئے اگ رہے ہیں اس کو نومولود بچے کی حیثیت میں رکھا گیا ہے جس طرح مائیں بچوں کو دھوپ کی تپش سے بچاتی ہیں، ٹھنڈے سائے میں رکھتی ہیں اور ان کے اوپر کوئی باریک کپڑا اُڑھا دیتی ہیں اسی طرح یہ مولود سبزے اور پودے ہیں ان کی راحت کے لئے پھولوں نے ان پر سایہ کر رکھا ہے کہ دھوپ کی تمازت سے مرجھا نہ جائیں نہروں نے آبِ رواں بھیج کر ان کو پانی کی چادر اوڑھا دی ہے، آبِ رواں اپنے لغوی معنی میں بھی ہے اور آب رواں ململ اور تن زیب کی طرح باریک کپڑا

ہوتا ہے گرمیوں میں اس کے کرتے اور انگر کھے پہنے جاتے ہیں، یہ مفہوم بھی یہاں مراد ہے یعنی نہروں نے بہت باریک کپڑے نومولود سبزوں کو اوڑھا دئے ہیں آگے شعر میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ سارے پودے زمین سے اگتے ہیں باغوں میں درختوں کی جڑیں اسی زمین ہی میں پیوست ہوتی ہیں جب باغ زمین کا مرہونِ منت ہے تو عاشقوں کا دل ''باغ باغ'' اور خوش کیوں نہ ہو جائے، رقیبوں کی طرف سے جو دل میں غبار ہے وہ غبار زمین کا ہی حصہ ہے اس لئے اس میں باغ پیدا ہو گیا تو غبار اس باغ کے درختوں کی جڑوں کی خوراک بن گیا تو عاشق کے دل میں اغیار کی طرف سے جو غبار تھا ختم ہو گیا اور دل صاف ہو گیا، حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں۔

نہ ہووے رشک سے لالہ کے دل پہ کب تک داغ ۔۔۔ کہ گل ہے سوختہ جاں، تھی جو شمع آتش بار

نہ ہووے دنگ کوئی کب تلک کہ لالہ وگل ۔۔۔ نکالیں سبز شجر سبزہ سرخ گل سے عذار

جلائے گر کہیں ہم شکل شاخ شمع کو بھی ۔۔۔ دھوئیں بکھیر دے آتش کے دم میں باد بہار

یہ ربط ہے گل وبو میں، اگر جدا ہو بو ۔۔۔ تو جان کھونے کو ہو اپنی، گل وہیں تیار

لالہ کا رنگ خوب سرخ ہوتا ہے اور پنکھڑیوں میں کہیں کہیں سیاہ داغ ہوتے ہیں اس کو لالہ کے دل کا داغ کہا گیا یہ داغ پھول اور شمع سے رشک کی وجہ سے پڑے کہ وہ سب دل جلے ہیں مرے دل میں عشق ومحبت کی وہ آگ نہیں اس لئے مارے رشک کے اس کے دل میں داغ پڑ گئے پھر کہتے ہیں کہ چمن میں سرسبز وشاداب درختوں کو دیکھا جاتا ہے کہ سب کا رنگ ہرا اور سبز ہے لیکن ان سے جو پھول نکلتے ہیں وہ معشوق کے رخساروں کی طرح سرخ ہیں حیرت ہوتی ہے کہ آخر سبز درختوں کی شاخوں میں یہ سرخ پھول کیسے پیدا ہو گئے، جوش بہار کا عالم یہ ہے کہ شمع جو ایک شاخ کے مانند ہوتی ہے اس کو جلا دیا جائے تو باد بہاری شمع کو شاخ سمجھ کر آگ کی حلق میں دھواں بھر کر اس کا وجود مٹا دے، پھول اور خوشبو دونوں کے عشق ومحبت کا یہ عالم ہے کہ اگر پھول سے خوشبو جدا ہو کر کہیں چلی جائے تو پھول خوشبو کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا وہیں دم توڑ دیگا کیوں کہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا، یہ بالکل مشاہدہ کی بات ہے۔

لگائے منھ بھی نہ گلدم، خدا کی قدرت ہے اور اس کی دم سے لگایوں پھرے گل بے خار
چنور سنہری بنائے ہیں ہر شجر کے لئے شعاع کی مہ و خور میں لگا کے چرخ نے تار
سمجھ کے غنچۂ لالہ کرے ہے گل ورنہ نسیم تیز کو کچھ شمع سے نہیں پیکار
بہ شکل شاخ بنا کرکے شمع کچھ مانگے تو منصب شجر طور ہی دلائے بہار
یہ سبزہ زار کا رتبہ ہے شجرۂ موسیٰ بنا ہے خاص تجلی کا مطلع انوار
اسی لئے چمنستان میں رنگ مہندی نے کیا ظہور ورق ہائے سبز میں ناچار

گلدم ولائتی بلبل کو کہتے ہیں جس کا رنگ سیاہ اور سر پر چوٹی ہوتی ہے اور اس کی دم کے نیچے کے پر سرخ ہوتے ہیں اس کو پھول کہتے ہیں، وہ پھولوں کی عاشق کہی جاتی ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کے اب کہ موسم بہار میں پھولوں کی اتنی کثرت ہے کہ بلبل پھولوں کو منھ تک نہیں لگاتی، الٹے پھول ہی اس کے دم کے پیچھے لگا ہوا ہے جب انسان کے پاس دولت کا انبار ہو جاتا ہے تو اس میں ایک طرح سے بے اعتنائی آجاتی ہے۔ ''چنور'' دیہاتی لفظ ''چنری'' دلہنوں کا لباس ہوتا ہے جس میں سلمہ ستارہ اور چمک دار تار ٹانکے جاتے ہیں، تمام درختوں اور پودوں کو دلہن کا لباس تیار کرنے کے لئے آسمان کو ذمہ داری دی گئی ہے وہ چاند سورج کی کرنوں میں تار ڈال کر، سنہری چنری بنا کر چمن کے سارے درختوں اور پودوں کو دلہن کی طرح سجا رہا ہے۔

جوش بہار کا یہ عالم ہے کہ اگر شمع جل رہی ہے اور باد نسیم کا ادھر سے گذر ہو جاتا ہے تو شمع اس لئے بجھ جاتی ہے، کیونکہ باد نسیم کو شمع سے کوئی عداوت نہیں ہے وہ کیوں بجھائے گی مگر غلط فہمی کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔

موسم بہار کی فیاضی اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ اگر شمع کہہ دے کہ میں درخت کی شاخ ہوں مجھ کو بھی فیضان بہار سے حصہ ملنا چاہئے تو شجر طور جس زمین پر ہے وہ زمین سفارش کریگی کہ جب اس بہار کا فیض سب کو پہنچ رہا ہے زمین کا ہر پودہ اس سے فیضیاب ہو رہا ہے تو شمع جو خود کو شاخ کہہ رہی ہے تو اس کو پھول پتیوں کی سوغات ملنی چاہئے تو شمع میں بھی پھول پتیاں پیدا ہو جائینگی،

حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ کائنات میں سب سے بڑا رتبہ تو سبزہ زار کا ہے کیونکہ شجرۂ طور بھی اسی میں سے ہے اس پر تجلی ربانی ہوئی جبکہ کائنات کی کسی اور چیز پر تجلی نہیں ظاہر ہوئی مہندی کی پتیاں جب پیس کر نرم و نازک ہتھیلیوں پر لگائی جاتی ہیں تو ان کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے جب کہ پتیوں کا رنگ سبز ہوتا ہے، چونکہ پتیوں کا ہرا رنگ ہی تجلی گاہ ربانی ہے اس لئے مہندی کے رنگ نے ہری ہری پتیوں میں حلول کر کے ظہور کیا سبز پتیوں کا احترام کیا اور ان کا رنگ نہیں بدلا، حضرت نانوتوی پھر فرماتے ہیں ؎

ہنود کو ہے گماں دیکھ کر یہ اعجوبے — کہ اب کے لیں ہیں جنم زار میں اوتار

یعنی یہ قوم تو ہر حیرت ناک چیز کو دیکھ کر اس کی پرستش کرنے لگتی ہے، اس سال موسم بہار نے وہ حیرت ناک جلوے دکھائے ہیں کہ یہ قوم پرست قوم کہے گی کہ اب کے اوتار نے سبزہ زاروں میں جنم لیا ہے اور پھر اس کی پرستش کرنے لگے گی۔

نزاکت چمنستان بیان کیا کیجئے — کہ صنع حق کے تئیں دیکھ عقل ہے بیکار
نہ شاخ گل کے تئیں تاب بار شبنم ہے — نہ کوئی لمحہ ہے شبنم کو دھوپ ہی کی سہار
ہوا کی ایک ٹھسک سے ہے چور چور حباب — رگڑ سے آب کی، ڈھانگیں ہیں آبجو کی فگار
پڑے پھپھولے حبابوں کی نرمی تن سے — بندھا جو بوندوں کی کثرت سے تن پہ ان کے تار
گرا دیا ہے تلے، گل نے بار سایہ کو۔ — کہ رنگ و بو کا اٹھانا بھی تھا اسے دشوار
نہ ہو کہاں تئیں آب رواں کا پتلا حال — خراش سبزہ بہ پا، سر پہ سایۂ گل بار
پچھاڑ کھا کے گرے ہے چمن میں چادر آب — ہوا ہے کثرت لغزش سے آب بھی ناچار
کمر پہ بار گراں بوئے گل، تلے پھسلن — نہ لڑکھڑائے کہاں تک ہوا دم رفتار
جو گر پڑے تو اٹھا جا نہ سایہ گل سے — نہ تھم سکے جو پھسل جائے موجۂ جوئبار

جب آدمی ناز و نعمت میں پلا ہوا ہوتا ہے تو معمولی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا، چھوٹی چھوٹی مصیبتیں اس کے لئے پہاڑ بن جاتی ہیں، بہار نے چمن کو بڑے ناز و نعم سے پالا ہے اس لئے اس کی ہر چیز میں نزاکت آ گئی ہے اس نزاکت کی کیا کیفیت ہے حضرت نانوتوی نے محسوس اور مشاہداتی مناظر دکھائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پھول تو پھول اس کی

شاخیں اور پتیاں اتنی نرم ونازک ہیں کہ وہ شبنم کے قطروں کا بار بھی اپنے اوپر برداشت نہیں کرسکتیں اور خود شبنم جو اسی چمن کے ہم نشینوں میں شامل ہے اتنی نازک اندام ہے کہ سورج کی معمولی حرارت بھی اس کے تن نازک کا وجود مٹا دیتی ہے چمن کی نہروں میں جو حبابوں کے تاج محل کھڑے ہیں ان کو ہوا کی ذرا سی بھی ٹھیس لگی تو وہ چور چور ہوجاتے ہیں، نہروں میں پانی چلتا ہے تو نہر کے کناروں سے رگڑ کھا کر اس کے پاؤں زخمی ہوجاتے ہیں، نہر کے حبابوں کا بدن اتنا نازک ہے کہ بارش کی بوندوں کا تار بھی ان کے بدن کو چھو جاتا ہے تو ان کے بدن میں چھالے پڑ جاتے ہیں، پھولوں کا عالم یہ ہے کہ ان پر رنگ وبو کا اتنا بڑا بوجھ ہے کہ اسی کو اٹھانا ان کے لئے دشوار ہے اس پر شاخوں کے سائے کا مزید باران کے لئے نا قابل برداشت ہوگیا، تو سر سے سایہ کے بوجھ کو اتار کر زمین پر ڈال دیا ہے، ظاہر ہے کہ سایہ زمین پر ہی پڑتا ہے مگر اس کی یہ تعبیر کتنی خوبصورت اور رومان انگیز ہے۔

چمن کی نہروں میں جو پانی رواں دواں ہے اس کا بھی حال بہت پتلا ہے یعنی بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہے کیوں کہ جب وہ چلتا ہے تو سبزے اس کے پاؤں تلے آتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں خراش آجاتی ہے اور قدم زخمی ہوجاتے ہیں پھر اس پر پھولوں کے سایہ کا بوجھ خود بارِ گراں، پاؤں زخمی اور اتنے بڑے بوجھ کو لیکر چلنا بہت دقت طلب کام ہے اس لئے اس کا حال بہت پتلا ہوگیا۔

پانی آسمان سے اترتا ہے تو ہوا کے تھپیڑے کھا کر زمین پر گرتا ہے تو ایک دھما کا سا ہوتا ہے پانی بھی چمن میں پھسل کر بے تحاشا گرتا ہے کیوں کہ بار بار اس کو ٹھوکر لگتی ہے اور پاؤں میں لغزش ہوتی ہے اس لئے برسات کی پھسلن میں جیسے آدمی بے تحاشا گرتا ہے اسی طرح پانی چمن میں بار بار گر جاتا ہے، چمن میں ہوا بھی لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہے ایک تو اپنی کمر پر خوشبو کا بھاری بوجھ لا درکھا ہے دوسرے زمین پر بارش کی وجہ سے پھسلن ہوگئی ہے بھاری بوجھ کی وجہ سے ہر ہر قدم پر پھسل جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب گری اور تب گری، خوشبو کے بوجھ کا تصور بڑا شاعرانہ تصور ہے، آگے کہتے

ہیں کہ پھولوں کا سایہ اگر زمین پر گر پڑے تو پھولوں کے لئے سائے کا اٹھانا بھی دشوار ہو جاتا ہے نہر میں چلنے والے پانی کی موج کو اگر ٹھوکر لگ گئی تو پھر اس کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا وہ پھسلتی ہوئی دور تک چلی جائے گی۔ حضرت نانوتویؒ کہتے ہیں۔

کہاں زمین، کہاں یاسمین ولالہ و ورد — فلک بھی گرد ہوا دیکھ کر چمن کی بہار
زمیں سے چرخ ہے ہر طرح اب کے شرمندہ — زمیں میں گڑ جا اگر چرخ کی بسے کچھ چار
دکھائے چرخ اگر اپنے چاند سورج کو — مقابلہ پہ ہر اک حوض باغ ہو تیار
کئے ہیں آپ زمیں نے جواب بارش میں — بجائے بوندوں کے فوارے اس طرف تیار

اب کی بار موسم نے زمین کو انتہائی حسین اور خوب صورت بنا دیا ہے ہر طرف چنبیلی گلاب اور گل لالہ اپنی بہار دکھا رہے ہیں جن کو دیکھ کر آسمان شرمندہ ہے زمین کی آرائش وزیبائش کے مقابلہ میں میری آرائش وزیبائش گرد ہو گئی ہے، مارے شرم کے وہ زمین میں گڑا جا رہا ہے اگر رفع خجالت کے لئے آسمان اپنے چاند سورج دکھائے کہ ہمارے پاس نور کا خزانہ ہے تو زمین بھی مقابلہ پر آجائیگی اور چمن کے حوض کو اس کے مقابلہ میں پیش کر دے گی جن میں پانی سیال چاندی کی طرح ہلوریں لے رہا ہے جس سے چاند سورج خود شرمندہ ہو جائیں، آسمان اگر بارش برسا کر اپنی برتری کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو زمین اپنے فوارے اس کے جواب میں پیش کر دے گی تم ننھی ننھی بوندیں برسا کر مغرور ہو اس کے مقابلہ میں یہ فوارے پورے جوش وخروش سے برستے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ نے زمین وآسمان کے تقابل میں زمین کی برتری دکھائی ہے زمین کو یہ برتری اسی موسم میں ملی ہے، یہاں ماضی کا کوئی ذکر نہیں، زمین وآسمان کے اسی تقابل سے گریز کے اشعار شروع ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد مدحیہ اشعار کا آغاز ہوتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے آگے کے یہ دو شعر کتنے معنی خیز کہے ہیں، ملاحظہ ہو۔

پہنچ سکے شجر طور کو کہیں طوبیٰ — مقام یار کو کب پہنچے مسکنِ اغیار
زمین وچرخ میں کیوں ہو نہ فرق چرخ وزمیں — یہ سب کا بار اٹھائے وہ سب کے سر پہ سوار

زمین کی فضیلت وبرتری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ شجر طور زمین پر شجر طوبیٰ

آسمان پر مگر زمین کا یہ درخت آسمان کے درخت سے کہیں زیادہ باعظمت اور بلند رتبہ ہے کیوں کہ شجر طور پر تجلی ربانی ہوئی اور وہ محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ ہے اور طوبیٰ کو یہ شرف حاصل نہیں، اس پر فرشتے رہتے ہیں ان کی حیثیت رقیب اور اغیار کی ہے، رقیب اور غیر کا گھر محبوب کے گھر سے افضل کیسے ہوسکتا ہے اسی لئے شجر طور کو شجر طوبیٰ پر فضیلت حاصل ہے آخر میں ایک مشاہداتی دلیل پیش کرتے ہیں کہ زمین آسمان میں تو زمین آسمان کا فرق ہے، یعنی بہت بڑا فرق ہے کیوں کہ زمین سب کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور آسمان سب کے سر کا بوجھ بنا ہوا ہے کیوں کہ اوپر ہے سب کے سر پر چھایا ہوا ہے۔

حضرت نانوتویؒ اب تک کائنات کی چمن بندی کرتے رہے اس کے بعد مدح کے اشعار آئینگے قصیدہ عربی زبان سے فارسی کے راستہ سے اردو میں آیا ہے اس لئے اس صنف سخن میں عربی شاعری کا انداز بیان پایا جاتا ہے، عربی زبان کے شعراء قصیدہ کے آغاز میں عشق ومحبت کے اشعار کہتے تھے اور پورا زور قلم صرف کرتے تھے اسی کو تشبیب کہتے ہیں، فارسی زبان میں جب قصیدہ آیا تو عشق ومحبت کے بجائے مناظر فطرت کی تصویر کشی، بہار اور موسم گل کی دل فریبیوں اور رعنائیوں کا ذکر تشبیب کی جگہ کہنے لگے، اردو قصیدہ نگاری میں بھی یہی طریقہ رہا، محسن کاکوروی کے قصیدہ نعتیہ میں یہی مناظر فطرت کی عکاسی ہے، حضرت نانوتویؒ نے فارسی شعراء سے متاثر ہوکر بہاریہ لکھنے کو ترجیح دی، تشبیب درحقیقت قصیدہ کی تمہید ہوتی ہے اور جب اصل مدح شروع ہوتی ہے اس سے پہلے گریز کا ایک یا دو شعر لکھ کر تشبیب اور مدح میں مکمل ربط پیدا کردیتے ہیں گریز کا شعر تشبیب اور مدح کا نقطۂ اتصال ہوتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے بھی گریز کے شعروں میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔

حضرت نانوتوی کا کمال فن ''بہاریہ'' مین پوری طرح عروج پر ہے جو ایک قادرالکلام شاعر ہونے کی سند ہے قوت تخیل انتہائی بلند پرواز، قوت مشاہدہ بہت ژرف بیں اور دقیقہ رس ضرب الامثال اردو زبان کے خوبصورت محاورے بہ کثرت

استعمال کئے ہیں، صنعت تجنیس کی رعایت نے اشعار کو حسین و جمیل بنانے میں اہم کردار انجام دیا ہے، جوش بہار کے خوبصورت مناظر کی عکاسی ہی کے سلسلہ میں زمین و آسمان کا تقابل کیا گیا اور زمین کی آسمان پر برتری دکھائی گئی اس کے بعد نعت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

کرے ہے ذرۂ کوئے محمدی سے خجل　　فلک کے شمس و قمر کو زمیں کے لیل و نہار

وہی زمین و آسمان کا تقابل، اگر آسمان کے چاند سورج اپنی روشنی اور آب و تاب پر فخر کرتے ہیں تو زمین سرکار دو عالم ﷺ کی گلی کوچوں اور گذرگاہوں کی خاک کے ذرے کو فضا میں اچھال دیتی ہے کہ ان خاک کے ذروں کی آب و تاب اور چمک دمک کو تمہاری آب و تاب کہاں پہنچ سکتی ہے، چاند سورج کو سوائے ندامت کے کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا۔

فلک پہ عیسیٰؑ و ادریسؑ ہیں تو خیر سہی　　زمیں پہ جلوہ نما ہیں محمد مختارؐ

فلک پہ سب سہی پر ہے نہ ثانی احمدؐ　　زمیں پہ کچھ نہ ہو، پر ہے محمدی سرکار

کئی پیغمبروں کا آسمان پر ہونا فلک کے لئے باعث افتخار ضرور ہے لیکن افضل الانبیاء والمرسلین ﷺ کا زمین پر ہونا ہی اس کی افضلیت و برتری کے لئے کافی ہے۔

نثار کیا کروں، مفلس ہوں، نام پر اس کے　　فلک سے عقد ثریا لوں، دے اگر وہ ادھار

ثنا کر اس کی فقط قاسم اور سب کو چھوڑ　　کہاں کا سبزہ، کہاں کا چمن، کہاں کی بہار

ثنا کر اس کی، اگر حق سے کچھ لیا چاہے　　تو اس سے کہہ، اگر اللہ سے ہے کچھ درکار

الٰہی! کس سے بیاں ہو سکے ثنا اسکی　　کہ جس پہ ایسا تیری ذات خاص کا ہے پیار

جو تو اسے نہ بناتا تو سارے عالم کو　　نصیب ہوتی نہ دولت وجود کی زنہار

کہاں وہ رتبہ؟ کہاں عقل نارسا اپنی　　کہاں وہ نور خدا، اور کہاں یہ دیدۂ زار

چراغ عقل ہے گل، اس کے نور کے آگے　　زباں کا منہ نہیں جو مدح میں کرے گفتار

جہاں کہ جلتے ہوں پر عقل کل کے بھی پھر کیا　　لگی ہے جان جو پہنچیں وہاں میرے افکار

مگر کرے مری روح القدس مددگاری　　تو اس کی مدح میں میں بھی کروں رقم اشعار

جو جبرئیل مدد پر ہو فکر کی میری | تو آگے بڑھ کے کہوں، اے جہان کے سردار

حضرت نانوتوی نے ان اشعار میں حضور ﷺ کے رتبہ بلند اور شان رفیع کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس کے وجود کے صدقہ میں ساری کائنات نے خلعت وجود پایا، جس خالق کائنات کے حضور میں کائنات کی ہر چیز سر بہ سجود ہے وہی ذات عالی جس ذات مقدس کو اپنا محبوب بنالے تو اس عظیم المرتبت شخصیت کی مدح وثنا میں زبان کا منہ ہے کہ گفتگو کرے جب کہ

ہزار بار بشویم دہاں زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

ہاں اگر جبرئیل مدد کریں تو میں زباں کھولوں، رسول اللہ ﷺ نے مداح رسول حسانؓ بن ثابت کے لئے دعا فرمائی تھی أَللّٰھُمَّ أَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسْ اے اللہ جبرئیل کے ذریعہ ان کی مدد فرما، پھر آگے حضرت نانوتوی خالص نعت کے اشعار کہتے ہیں۔

تو فخر کون ومکاں زبدۂ زمیں وزماں | امیر لشکر پیغمبراں، شہ ابرار
خدا ترا، تو خدا کا حبیب اور محبوب | خدا ہے آپ کا عاشق تم اس کے عاشق زار
تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی | تو نور شمس گر اور انبیاء ہیں شمس نہار
حیات جان ہے تو، ہیں اگر وہ جان جہاں | تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ دیدۂ بیدار
طفیل آپ کے ہے کائنات کی ہستی | بجا ہے کہئے اگر تم کو مبدء الآثار
جلو میں تیرے سب آئے عدم سے تا بہ وجود | قیامت آپ کی تھی دیکھئے تو اک رفتار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں | ترے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار
گرفت ہو تو تیرے ایک بندہ ہونے میں | جو ہو سکے تو خدائی کا اک ترے انکار

مشرکین مکہ کہا کرتے تھے کہ ہم مین ان میں فرق ہے، ہماری طرح وہ کھاتے پیتے ہیں بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں جیسے ہم ویسے وہ بھی ہیں یعنی حضور ﷺ کو اللہ کا بندہ کہتے اور آپ کے رسول ہونے سے انکار کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہنم رسید ہوئے رسالت سے انکار اور صرف بندہ کہنے پر گرفت ہوئی، حضور سے اگر کسی کمال کی

نفی کی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ آپ خدا نہیں ہیں بقیہ سارے کمالات آپ کی ذات میں موجود ہیں۔

بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال بغیر بندگی کیا ہے، لگے جو تجھ کو عار
جو دیکھیں اتنے کمالوں پہ تیری یکتائی رہے کسی کو نہ وحدت وجود کا انکار

صوفیا کا ایک طبقہ وحدت الوجود کا قائل ہے، وجود کا اطلاق صرف ایک ذات واجب الوجود پر کیا جا سکتا ہے باقی ساری کائنات اسی وجود کا پرتو اور اس کے مظاہر ہیں کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی کی جلوہ گری ہے بذات خود کائنات کا اپنا کوئی حقیقی وجود نہیں، صوفیا کا ایک طبقہ اس کا انکار کرتا ہے حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ اس نظریہ کا انکار کرنے والے سرکار دو عالم ﷺ کے کمالات میں یکتائی و بے مثالی کو دیکھ لیں کہ آپ کے کمالات کے سامنے کسی کمال کی کوئی حقیقت نہیں، دنیا کے سارے کمالات آپ کے کمالات کے سامنے گرد ہیں کائنات میں صرف آپ کا کمال ہی حقیقی کمال ہے جب آپ کی یکتائی اور بے مثالی اس درجہ کی ہے تو خالق کائنات کے بارے میں وحدت الوجود کے نظریے کی وہ خود تائید کرنے لگیں گے، آگے کہتے ہیں۔

یہ اجتماع کمالات کا تجھے اعجاز دیا تھا تا نہ کریں انبیاء کہیں تکرار
تو آئینہ ہے کمالات کبریائی کا وہ آپ دیکھتے ہیں اپنا جلوۂ دیدار
پہنچ سکا ترے رتبہ تلک نہ کوئی نبی ہوئے ہیں معجزہ والے بھی اس جگہ ناچار
جو انبیاء ہیں وہ آگے تری نبوت کے کریں ہیں امتی ہونے کا یا نبی! اقرار
لگاتا ہاتھ نہ پتلے کو بوالبشر کے خدا اگر ظہور نہ ہوتا تمہارا آخرکار
خدا کے طالب دیدار حضرت موسیٰ تمہارا لیجئے، خدا آپ طالب دیدار
کہاں بلندیٔ طور اور کہاں تری معراج کہیں ہوئے ہیں زمیں آسمان بھی ہموار
جمال کو تیری کب پہنچے حسن یوسف کا وہ دلربائے زلیخا، تو شاہد ستار
اگر قمر میں کچھ آجائے تیرے چہرہ کا نور تو رات دن ہو، اور آگے ہو اس کے دن شبِ تار

یہاں شاعرانہ تخیل پورے عروج پر ہے اور طائر فکر کی پرواز انتہائی بلند نظر آتی

ہے کہتے ہیں کہ اگر رات میں چوہویں رات کا چاند نکلا ہوا ور آپ کے چہرے کا نور، آب وتاب اور اس کی روشنی پا جائے تو چاند کی روشنی کا یہ عالم ہوگا کہ رات دن سے اتنی زیادہ روشن اور تاب ناک ہو جائے گی کہ جب صبح کو سورج طلوع ہوگا تو اس کی روشنی اس چاند کی روشنی کے مقابلہ میں جس مین حضور کے چہرۂ زیبا کا نور شامل ہوگیا ہے اتنی کمزور اور مدھم معلوم ہوگی کہ لوگ کہیں کے کہ دن نہیں بلکہ تاریک ترین رات ہے، اب چاند طلوع ہوگا تو دن ہوگا اور سورج نکلے گا تو رات ہوگی وہ بھی تاریک ترین رات، اس کے بعد حضرت نانوتوی نے استعارات کنایات تشبیہات وتمثیلات کا مینا بازار لگا دیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

جمال ہے تیرا معنی حسن ظاہر میں　　کیا ہے معجزہ سے تو نے آپ کو اظہار
رہا جمال کے تیرے حجاب بشریت　　نجانا کون ہے، کچھ بھی، کسی نے جز ستار
سوا خدا کے، بھلا تجھے کوئی کیا جانے　　تو شمس نور ہے، شپر نمط اولوالابصار
سما سکے تیری خلوت میں کب نبی وملک　　خدا غیور، تو اس کا حبیب اور اغیار
جو آئینہ میں پڑے عکس خالی کا تیرے　　تو اشک مہر کا ہو جائے مطلع الانوار
تمہارا خالِ قدم دیکھ رشک سے مہ کے　　جگر پہ داغ ہو، سورج کو ہے عذاب انصار
نہ بن پڑا وہ جمال آپ کا سارک شب بھی　　کمر میں گو کی کروڑ دل کئے چڑہاءاتار
اگر پڑے تیرے تلوے میں عکس سورج کا　　تو آگے نور قدم کے ہو تیرے خالی شمار
سفید دیدۂ بے نور سا ہے دیدۂ نور　　بصیرہ ہونے کو تلوے کا تل ہے تیرے بکار
بنا شعاعوں کی جاروب تیرے کوچہ سے مہر　　کرے ہیں دور اندھیرے کا روز گرد وغبار

کتنا خوبصورت شعر ہے، قوت مشاہدہ کی یہ معراج ہے کہ وہ دیکھتی ہے کہ سورج روز جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی لمبی لمبی کرنیں جھاڑو کے تنکے کی طرح معلوم ہوتی ہیں، اس سے خیال پیدا ہوا کہ شاید سرکار دو عالم ﷺ کی با برکت مقدس گلیوں کو چوں اور گذرگاہوں کی صفائی کے لئے سورج نے شعاعوں کا جھاڑو بنایا ہے اور اس سے اندھیرے کے گرد وغبار کو صاف کر رہا ہے، مقام کی عظمت واہمیت کے پیش نظر اسی

کے شایان شان ہر چیز استعمال ہوتی ہے اسلئے مدینہ کی گلیوں کی صفائی کے لئے تنکوں کا نہیں شعاعوں کا ہی جھاڑو زیادہ مناسب اور اسکی شایان شان ہے، پھر کہتے ہیں:

اگر ترے رخ سے گل کو دوں تشبیہ — شعاع مہر کو ہو آرزوے منصب خار
مربی مہ خور ذرّے ذرّے کوچے کے — معلم الملکوت آپ کا سگِ دربار
خوشا نصیب یہ نسبت کہاں نصیب مرے — تو جس قدر ہے بھلا، میں برا اسی مقدار
نہ پہنچیں گنتی میں ہرگز ترے کمالوں کی — میرے بھی عیب شہ دوسرا، شہ ابرار
قبول جرم سے امت کے تیری کھا دھوکا — عجب نہیں ہے جو شیطان بھی نیکوکار
جو چھو بھی دیوے سگ کوچہ تیرا اس کی نعش — تو پھر تو خلد میں ابلیس کا بنائیں مزار
عجب نہیں، تری خاطر سے تری امت کے — گناہ ہوویں قیامت کو طاعتوں میں شمار
بکیں گے آپ کی امت کے جرم ایسے گراں — کہ لاکھوں مغفرتیں کم سے کم پہ ہوں گی نثار
کفیل جرم اگر آپ کی شفاعت ہو — تو قاسمی بھی طریقہ ہو، صوفیوں میں شمار
ترے بھروسے پہ رکھتا ہے غرّۂ طاعت — گناہِ قاسم برگشتہ بخت، بداطوار
گناہ کیا ہے، اگر کچھ گنہ کئے میں نے — تجھے شفیع کہے کون؟ گر نہ ہو بدکار
تمہارے حرف شفاعت پہ عفو ہے عاشق — اگر گناہ کو ہے خوف غصۂ قہار
یہ سن کے، آپ شفیع گناہ گاراں ہیں — کئے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار
ترے لحاظ سے اتنی تو ہوگئی تخفیف — بشر گناہ کریں اور ملائک استغفار
دعا تری مرے مطلب کی ہوا گر حامی — تو بخت بد کو ملے حق کے گھر سے بھی پھٹکار
یہ ہے اجابت حق کو تری دعا کا لحاظ — قضاء مبرم ومشروط کی سنیں نہ پکار
خدا ترا، تو جہاں کا ہے واجب الطاعۃ — جہاں کو تجھ سے، تجھے اپنے حق سے ہے سروکار
قضا کو تیری یہ خاطر، مگر تجھے وہ ہے — قضاء حق سے نیاز اور نیاز کا اقرار
اگر جواب دیا بیکسوں کو تونے بھی — تو کوئی اتنا نہیں جو کرے کچھ استفسار
کروڑوں جرموں کے آگے یہ نام کا اسلام — کریگا یا نبی اللہ! کیا مرے پہ پکار
دکھائے، دیکھئے کیا اپنا طالع بدبیں — نگاہ لطف تری ہو نہ گر مری غم خوار

برا ہوں، بد ہوں، گنہگار ہوں پر تیرا ہوں ترا کہیں ہیں مجھے، گو کہ ہوں میں نا ہنجار
لگے ہے سگ کو ترے، میرے نام سے گو عیب پر تیرے نام کا لگنا مجھے ہے عز و وقار
تو بہترین خلائق، میں بدترین جہاں تو سرورِ دو جہاں، میں کمینہ خدمت گار

اس کے بعد آٹھ دس شعروں میں حضرت نانوتوی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ قصیدہ حضرت نانوتوی نے اس دور میں لکھا ہے جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد آپ کے خلاف وارنٹ گرفتاری تھا اور آپ روپوشی کی زندگی گذار رہے تھے، انگریزوں نے ہر طرف مخبروں کا جال پھیلا رکھا تھا، آپ کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھیا اور آپ پولیس سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ گرفتاری کا مطلب پھانسی یا کالے پانی کی سزا تھی اس سے ہلکی سزا کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا روپوشی کا یہ دور ایک سال سے کم نہیں تھا سارا کاروبارِ زندگی معطل تھا، عزیز و اقارب سے رشتہ کٹا ہوا تھا سخت ذہنی اذیت میں آپ گرفتار رتھے انہی حالات میں یہ قصیدہ لکھا گیا، ممکن ہے مرا خیال صحیح نہ ہو، کیوں کہ حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ کے اشعار میں تہ در تہ معنویت ہے، اور درج ذیل اشعار سے ان کی منشا اور رہی ہو بہر حال اشعار حاضر ہیں:

بہت دنوں سے تمنا ہے کیجئے عرض حال اگر ہو اپنا کسی طرح تیرے در تک بار
وہ آرزوئیں جو ہیں مدتوں سے دل میں بھری کہوں میں کھول کے دل اور نکالوں دل کا غبار
مگر جہاں ہو فلک آستاں سے بھی نیچا وہاں ہو قاسم بے بال و پر کا کیونکہ گذار
نہ جبرئیل کے پر ہیں، نہ ہے براق کوئی جو اڑ کے در تئیں پہنچوں تمہارے یا ہو سوار
کشش پہ تری لئے اپنا بار بیٹھے ہیں تکے ہے تیری طرف کو، یہ اپنا دیدۂ زار
یہ میری جان نکمی سے تھی سواس کے بھی پڑے ہیں چرخ و زماں پیچھے، باندھ کر ہتھیار
مدد کر، اے کرمِ احمدی کہ تیرے سوا نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامیٔ کار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی کیا ہے سارے بڑے چھوٹوں کا تجھے سردار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا بنے گا کون ہمارا، ترے سوا غم خوار

کیا ہے سگ نمط ابلیس نے میرا پیچھا	ہوا ہے نفس، موا سانپ سا گلے کا ہار

پھر اس کے بعد اپنی بیکسی اور اپنے درد وکرب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی دلی تمناؤں اور جذبات کا اظہار کیا ہے چونکہ وہ تصوف وسلوک کی راہ کے راہی تھے ان کا رہوار فکر اسی جانب مڑ گیا ہے پھر دیر تک چلتا رہا عشق نبوی ﷺ کا سوز، دیارِ مدینہ پہنچنے کی تڑپ اور اس مقدس سرزمین میں اپنے وجود کے تحلیل ہو جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں یہ ساری باتیں اندرونی کرب کی وجہ بہت ہی موثر الفاظ میں کہی ہیں، اشعار دیکھئے:

وہ عقل بے خرد اپنی، یہ زور حرص وہوا	اسے بجھاؤں میں یا انسے آ کے ہوں دو چار
دکھائے ہے مرے دل کو لبھانے کو ہر دم	ہزار طرح کے دنیائے کہنہ سال سنگار
ادھر ہجوم تمنا، ادھر نصیبوں سے	کرے ہے، بخت زبوں، ہر امید سے انکار
رجاء وخوف کی موجوں میں ہے امید کی ناؤ	جو تو ہی ہاتھ لگائے تو ہووے بیڑا پار
امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ	کہ ہو سگان مدینہ میں میرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگان حرم کے تیرے، پھروں	مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار
جو یہ نصیب نہ ہو، اور کہاں نصیب مرے	کہ میں ہوں اور سگان حرم کی تیرے قطار
اڑا کے باد مری مشت خاک کو پس مرگ	کرے حضور ﷺ کے روضہ کے آس پاس نثار
ولے یہ رتبہ کہاں مشت خاک قاسم کا	کہ جائے کوچہ اطہر میں تیرے بن کے غبار
مگر نسیم مدینہ ہے، گرد باد بنا	کشاں کشاں مجھے لے جا جہاں ہے تیرا مزار
ہوس نہیں مجھے اس سے بھی کچھ رہی لیکن	خدا کی اور تری الفت سے میرا سینہ فگار
لگے وہ تیر غم عشق کا مرے دل میں	ہزار پارہ ہو دل خون دل میں ہو سرشار
لگے وہ آتش عشق اپنی جان میں جس کی	جلا دے چرخ ستم گر کو ایک ہی جھونکا
صدائے صور قیامت ہو اپنا اک نالہ	بجائے برق ہو اپنی ہی آہ آتش بار
چبھے کچھ ایسے مرے نوک خار غم دل میں	کہ پھوٹے آنکھوں کے رستہ سے اک لہو کی فوار
یا ناتواں ہوں، غم عشق میں کہ جائے نکل	ذرا بھی جان کو اوپر کا سانس لے جو سہار

تمہارے عشق میں رورو کے ہوں نحیف اتنا کہ آنکھیں چشمہ آبی سے ہوں درون غبار
یہ لاغری ہو کہ جان ضعیف کو دم نقل نہووے ساتھ اٹھانا بدن کا کچھ دشوار
رہے نہ منصب شیخ المشائخی کی طلب نہ جی کو بھائے یہ دنیا کا کچھ بناؤ سنگار
ہوا اشارہ میں دو ٹکڑے جو قمر کا جگر کوئی اشارہ ہمارے بھی دل کے ہو جا پار

دل کی آرزوئیں اور تمنائیں عشق کی تڑپ اور محبت کے سوز و گداز دلی اضطراب کے ساتھ دربار رسالت میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ کہاں میں اور کہاں وہ دربار عالی تبار جہاں فرشتے قدم رکھتے ہوئے پاس ادب کرتے ہیں درخواست اور فریاد کا یہ لب ولہجہ اس عظیم بارگاہ کی شایاں نہیں اس لئے وہ اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں دل اور زبان کو سرزنش کرتے ہیں اور درود وسلام پر بات کرتے ہیں۔

یہ کیا ہے شور وغل؟ اتنا سمجھ تو کچھ قاسم نہ کچھ ترا بڑا رتبہ، نہ کچھ بلند تبار
تو تھام اپنے تئیں حد سے پا نہ دھر باہر سنبھال اپنے تئیں اور سنبھل کے کر گفتار
ادب کی جا ہے یہ، چپ ہو تو اور زباں کر بند وہ جائے، چھوڑ اسے پر نہ کر تو کچھ اصرار
دل شکست ضروری ہے جوش رحمت کو گرے ہے باز کہیں جب تلک نہ دیکھے شکار
وہ آپ رحم کرینگے، مگر سنیں تو سہی شکست شیشۂ دل کی ترے کبھی جھنکار
بس اب درود پڑھ اس پر اور اس کے آل پہ تو جو خوش ہو تجھ سے وہ اور اس کی عترت اطہار
الٰہی! اس پہ اور اس کی تمام آل پہ بھیج وہ رحمتیں کہ عدد کر نہ سکے ان کو شمار

یہ قصیدہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اس وقت لکھا گیا جب اردو زبان تراش خراش کے مرحلے سے گذر رہی تھی، اس دور میں ایسے الفاظ کی بہتات تھی جو بعد میں متروک ہوئے، اس دور کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی کہیں ثقیل تھا، اسی تلفظ کی ادائیگی کے لئے املا بھی اسی کے مطابق تھا جو اب قطعاً متروک ہے، ہم نے اس قصیدے میں جو املا تھا، ہو بہو ٹھیک وہی لکھا ہے تا کہ اس عہد کی زبان سے مطابقت باقی رہے، قصیدہ میں تعقید لفظی نظر آئیگی لیکن یہ حضرت نانوتوی کی مجبوری تھی، وہ بہت ہی وسیع مفہوم کو صرف دو مصرعوں میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں اس لئے الفاظ اپنے مقام پر اکثر جگہ نہیں

رہے، یہ مجبوری ہر اس شاعر کو پیش آتی ہے جو دقیق مضامین کو شعروں میں پیش کرتا ہے، مگر بہر حال اس کی وجہ سے اشعار ثقیل اور بوجھل ہو جاتے ہیں۔

یہ قصیدہ اپنی معنوی وسعت، فکر کی گہرائی، ژرف بینی، بے مثال قوت مشاہدہ کا غماز اور مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی روح نواز تصویر کشی میں ایک مثالی اور لاجواب قصیدہ ہے، حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ کو شعر وشاعری سے ظاہری بے تعلقی اور ان کی کم سخنی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے، یہ قصیدہ پڑھ کر دل کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس سے پہلے آپ کو شعر وشاعری سے کوئی سروکار نہیں رہا ہوگا، قصیدہ صاف بتاتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق استاذِ فن کے قلم کا رہین منت ہے، اب یہ طویل قصیدہ اردو ادب کی تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقاء سے بحث کرنے والے ادیبوں اور نقادوں کی خدمت میں پیش ہے تا کہ وہ اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کرسکیں۔

اسیرؔ ادروی

بنارس ۲۰؍ جولائی ۱۹۹۹ء

تین رزمیہ مثنویاں

واقعہ ایک ہے جسکو تین شاعروں نے شعری لباس پہنایا ہے، آج سے ایک صدی قبل ۱۰/ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۵/جون ۱۸۹۳ء میں اعظم گڈھ ضلع کے ایک دم مشرقی حصہ میں ایک جانکاہ حادثہ ہوا تھا، اس دیار میں اس حادثہ کو ''گوپچھنی'' کہا جاتا ہے جو درحقیقت گئو رکھشنی کی تحریف ہے یا عوام کی تصرف لسانی ہے گایوں کی حفاظت کے لئے ایک تنظیم ضلع بلیا کے دیہاتوں میں قائم ہوئی تھی جیسا کہ لفٹنٹ گورنر نے بلیا میں منعقدہ دربار میں جو ۱۱/اگست ۱۸۹۳ء کو تقریر کی تھی اس میں انہوں نے بتایا کہ اس دیار میں سارے فسادات گئو رکھشنی سبھاؤں کی وجہ سے ہوئے، یہ تحریک بڑے شباب پر تھی، اس کا ایک مکمل نظام تھا اور تمام دیہاتوں میں اس کے کارکن پھیلے ہوئے تھے، جارحانہ اقدام کا آغاز میرے گاؤں ادری سے ہوا اس میں زیادتی اپنے ہی لوگوں کی تھی یہ گاؤں افغانی النسل یوسف زئی پٹھانوں پر مشتمل تھا جو ایک وسیع وعریض ٹیلے پر آباد ہے پھر بتدریج دوسری برادریوں کی آبادی ہوئی جس وقت یہ حادثہ ہوا اس کی آبادی دوڈھائی سوگھروں پر مشتمل تھی چونکہ جاگیردارانہ نظام تھا گاؤں کا حاکم ہوتا تھا دلاّ خاں مکھیا تھے وہ اپنے کھیتوں کی طرف سے آرہے تھے ایک جگہ ایک تنومند گائے بندھی ہوئی تھی یہ دیکھ کر اپنے کارندوں سے کہا کہ یہ گائے کھول لو بقرعید پر قربانی ہوگی گائے کھول کر آگئی اور آبادی میں زمیندار کے دروازے پر باندھ دی گئی، آسامیوں کو زمیندار سے بولنے کی ہمت نہیں تھی اس نے گئو رکھشنی تحریک کے لوگوں سے مل کر اپنی فریاد کی انہوں نے مدد کا وعدہ کرلیا اور ادری پر حملہ کا پلان بنالیا، ادری ایک چھوٹی سی آبادی تھی اور دوڈھائی سوگھروں پر مشتمل تھی، صورت حال انتہائی خطرناک ہوگئی جے جے کار کی، جب اطراف کے دیہاتوں کی طرف سے آواز آتی تو پورا گاؤں سہم جاتا ۹/ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ کو لوگوں کے بیان کے مطابق ایک لاکھ کے قریب مسلح مجمع جے جے کا نعرہ لگاتا ہوا ادری کے پوربی حصہ میں ایک پنڈت کے باغ میں جو یہاں مصر کا باغ

مشہور تھا، آکر ٹھہر گیا، یہ باغ گاؤں سے دو تین فرلانگ پر ہے ادری کے پوری آبادی پر انتہائی خوف وہراس طاری ہو گیا، مگر مصیبت تو سر پر آچکی تھی افغان برادری کو للکارا اور گاؤں کے مشرقی حصہ میں جوانوں کی صف بندی کر دی اور صف کے آگے گھوڑ سوار دوڑ لگا رہے تھے جیسے فوج حملہ کرنے کے لئے تیار ہے، دو پہر ہو گئی مگر حملہ نہیں ہوا ہمارے گھر کی روایت ہے کہ شب میں ایک فقیر آیا اور مسلمانوں سے کہا کہ آپ کورے مٹی کے برتن کی کنکریاں توڑ لیں اور ہر کنکری پر قرآن کی یہ آیت پڑھ کر دم کر کے رکھ لیں اور شب میں گاؤں کی چاروں سمتوں میں ایک ایک کر کے فاصلہ پر گراتے جائیں انشاء اللہ آپ محفوظ رہیں گے چنانچہ پورے گاؤں میں یہ کنکریاں پڑھی گئیں رات کے پچھلے پہر تمام کنکریاں چاروں طرف گرادی گئیں اسکا اثر یہ ہوا کہ حملہ آوروں میں سے بہتوں نے بتایا کہ ہم لوگ گاؤں کی طرف دیکھتے تھے ہر طرف ننگی تلواریں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں اس لئے پنڈتوں نے حملہ کی اجازت نہیں دی مجمع حملہ کے لئے تقاضا کرتا رہا لیکن پنڈتوں نے ان کو روکا اور بتایا کہ تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا عجیب کشمکش تھی ادری کے قرب وجوار کے معزز اور سر برآوردہ ہندو زمینداروں نے مجمع سے کہا کہ ہم مسلمانوں سے گفتگو کرنے جارہے ہیں آپ لوگ ہمارا انتظار کریں چنانچہ آدھے درجن سے زائد زمیندار صافہ باندھے انگرکھا پہنے لاٹھی ہاتھوں میں لئے مجمع سے نکلے اور وہاں آئے جہاں مسلمانوں نے صف بندی کر رکھی تھی انہوں نے آکر گاؤں کے مکھیا دلّا خاں سے مل کر کہا کہ ہم صلح کرنے کے ارادے سے آپ کے پاس آئے ہیں، دلّا خان نے تڑک کر کہا کہ تم لوگ لڑنے آئے ہو تو پہلے دو دو ہاتھ ہو جائیں صلح تو بعد کی بات ہے، مگر ہندو زمیندار سچے دل سے صلح کی نیت سے آئے تھے اس لئے انہوں نے کہا کہ خون خرابے سے پہلے ہو جائے تو بہتر ہے اور اپنی پگڑیاں کھول کر ان کے پاؤں پر رکھ دیں اور کہا: صاحب صلح ہو جائے تو بہتر ہے، بس ہماری ایک شرط ہے کہ جو گائے آپ کھول کر لائے ہیں وہ ہم کو واپس کر دیں تا کہ ہم مجمع کو دکھا سکیں کہ ہم نے جنگ جیت لی جس کے لئے ہم نے یہاں تک سفر کیا وہ یہی گائے ہے

جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جب بات یہاں تک آئی تو انصاری برادری کے دو چار پڑھے لکھے بزرگ تھے انہوں نے دلا خاں مکھیا سے کہا کہ آپ گائے ان کو دے دیں اس کی قربانی جائز نہیں یہ چھینا ہوا مال ہے قربانی اپنے جانوروں کی کرنی چاہیئے اور خود جا کر گائے کھونٹے سے کھول کر صلح کے لئے آنے والوں کے حوالے کردی وہ گائے لے کر مصر کے باغ کی طرف چلے اور گئو ماتا کی جے کے نعرے لگائے مجمع نے بھی گائے کو دیکھ کر گئو ماتا کی جے کے نعرے لگائے صلح والوں نے جا کر مجمع کو مطمئن کیا کہ اب ہم لڑائی جیت چکے اب ہمارا یہاں کے لوگوں سے لڑنا بے مقصد ہوگا مجمع میں اختلاف رائے پیدا ہوا کہ اب ہم سب گھروں کو لوٹ جائیں یا اور کوئی پروگرام بنائیں کچھ لوگ تو وہیں سے اپنے اپنے گاؤں چلے گئے بڑا حصہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک حصہ کوپا گنج کی طرف بڑھا اور دوسرا بڑا حصہ قصبہ مئو کی طرف چلا، جوادری سے مغربی جانب دو کوس کے فاصلہ پر تھا، رات میں چل کر صبح سویرے مئو میں داخل ہوگیا، گئو رکھشنی تحریک نے ہر طرف فضا گرم کردی تھی کوپا گنج میں کیا قیامت گذری اس کے متعلق صرف زبانی روایتیں ہیں، کسی شاعر نے اس واقعہ پر طبع آزمائی نہیں کی البتہ قصبہ مئو میں ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ کی صبح سے شام تک محاذ آرائی ہوئی دونوں طرف سے کچھ لوگ قتل ہوئے کچھ مسلمان شہید ہوئے ’’گوکچھنی‘‘ کا صرف اتنا واقعہ ہے اسی واقعہ پر قصبہ کے تین شاعروں نے طبع آزمائیاں کیں یہ تینوں مثنویاں میرے سامنے ہیں، اتفاق سے ان تینوں حضرات نے اس حادثہ جانکاہ میں شب و روز گذارے ہیں غم و غصہ اور خوف و ہراس کا جو ماحول تھا اس کے چشم دید مشاہد ہیں اس لئے ان کے انداز بیان غم و غصہ اور نفرت کے شدید جذبات کا شاہکار ہیں اور اس حادثہ کو میدان جہاد کی حیثیت دیکر اسی لب و لہجہ میں یہ مثنویاں قلم بند کی ہیں ہر ایک نے میدان جنگ کا ولولہ انگیز نقشہ کھینچا ہے بہادروں کی انفرادی لڑائیوں کی منظر کشی کی ہے، گئو رکھشنی تحریک نے جو نفرت کی فضا بنائی تھی اس کے ردِ عمل کے طور پر ان مثنویوں میں ان کے جوابات بھی ولولہ انگیز انداز میں دیئے گئے ہیں، تینوں مثنویوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پہلی مثنوی کے شاعر کا نام خلیفہ پیر محمد ہے جو قصبہ مئو محلّہ کیاری ٹولہ کے باشندے تھے کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں معلوم ہوتے شعر وشاعری سے تعلق ضرور ہے اردو زبان وادب سے واقفیت کم ہے، کلام پر قدرت معلوم ہوتی ہے میرا جہاں تک خیال ہے وہ یہاں کی علاقائی شاعری ''پچرا'' اور ''خیال'' کے شاعر ہیں اس لئے وہ جو سوچتے ہیں اس کو شاعری لباس پہنا دیتے ہیں صرف ایک شعر میں جنگ کا نتیجہ بتا دیتے ہیں۔

مر گئے دو تین سو کافر پلید اور چھ مومن ہوئے اس جا شہید

خاتمہ جنگ کو دو شعروں میں سمیٹ لیا ہے، انداز بیان شاعرانہ ہے اور اچھا ہے۔

غم سے دل ہر ایک کا شانہ ہوا خانۂ مومن عزا خانہ ہوا

اک عجب ڈھنگ کی پریشانی ہوئی اور دو گانہ، نہ قربانی ہوئی

پیر محمد خلیفہ کی مثنوی مختصر اور صرف ۱۴۴ شعروں پر مشتمل ہے البتہ اس ماحول اور درد کی غمنا کی کی ترجمانی مکمل ہے۔

(۲) دوسری مثنوی قدرے طویل ہے اس کے شاعر مولانا حکیم بشیر اللہ صاحب ہیں جو تعلیم یافتہ قصبہ کے محلّہ گھوناتھ پورہ کے رہنے والے تھے، بہت باوقار باعزت، شاہی جامع مسجد کٹرہ کے امام وخطیب تھے تین دہائیوں تک یہ فرائض انجام دیتے رہے، صاحب زہد وتقویٰ اور عوام میں ان کا بڑا احترام تھا، خلافت تحریک ۱۹۲۰ء میں جب مسلمانوں نے اپنی عدالتیں قائم کیں تو قصبہ مئو کی عدالت میں تین قاضی مقرر ہوئے ان میں ایک یہی مثنوی نگار تھے، انہوں نے اس مثنوی میں برادرانِ وطن کے مذہبی خیالات وعقائد پر ظریفانہ انداز میں نکتہ چینیاں کی ہیں اس وقت کا ماحول یہی تھا یہ مثنوی دلچسپ ہے انہوں نے چشم دید حالات لکھے ہیں ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بہت تحقیق سے لکھتا ہوں حالات نہیں مشکوک ہے اس میں کوئی بات

کہ خود موجود تھا بندہ وہاں پر یہ سب حالات گذرے ہیں جہاں پر

مثنوی نگار نے حادثہ کی ابتدا بتاتے ہوئے مثنوی میں ادری کے واقعہ کا ذکر کئے

شعروں میں کیا ہے اور یہ بھی وضاحت کی ہے کہ ادری میں صلح نامہ ہو جانے کے بعد وہاں کے مجمع کی بڑی تعداد قصبہ مئو آ گئی، البتہ یہ جارحانہ تحریک اس دیار میں ہر طرف تھی عام اشتعال پھیلا تھا اس لئے مئو میں کئی سمتوں سے حملہ آوروں کی بھیڑ پہلے سے اکٹھا تھی یہ مثنوی قدرے طویل ہے تقریباً چار سو اشعار پر مشتمل ہے اور جنگ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے، یہ کوئی با قاعدہ جنگ نہیں تھی نہ ملک گیری مقصد تھا قصبہ کے مدافعت کرنے والے حضرات شام تک اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تو باہری حملہ آور محلّہ میں گھس آئے اور گھروں کی کھپریل پیٹ ڈالی مسجد کے لوٹے اور دروازے توڑ ڈالے دن ڈوبتے حملہ آور کم ہوتے گئے اور پھر میدان جنگ خالی ہو گیا اعظم گڈھ مرکز سے فورس آ چکی تھی اس نے گھروں میں گھس کر قصبہ کے غیر مسلموں کو گرفتار کیا اور اپنے ساتھ ہتھکڑی لگا کر اعظم گڈھ لے گئے ان پر بلوہ اور فوجداری کا مقدمہ چلا بہتوں کو سزا ہوئی اور اس جھگڑے میں چھ مسلمانوں کے شہید ہونے کا ذکر ہے اور ہر ایک کا پورا تعارف کرایا ہے کئی مثنوی نگاروں نے عین ہنگامہ میں زوردار بارش کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے حملہ آوروں کی ہمتیں پست ہو گئیں کیوں کہ وہ کھلے میدان میں تھے شاعر نے کہا:

اسی کے بعد بجلی پھر جو کڑکی   سبھی کے دل کو اس نے پر خطر کی
ہوئے تب بھیگ کر کافر فراری   انہیں تھی پہلے ہی سے آہ وزاری
مسلماں نے کہا کافر بھگے اب   نہیں میدان میں کوئی رہے اب

مثنوی نگار نے بتایا کہ قصبہ کے لوگ اپنے گھروں پر آئے تا کہ کچھ کھا پی لیں مگر ابھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ اک شور بلند ہوا اور معلوم ہوا کہ ایک بڑا جتھہ کہیں سے آ گیا اور نئے جوش وخروش سے حملہ ہو گا مثنوی نگار لکھتے ہیں:

کہ اک موضع ہے ادری یاں سے دو کوس   وہاں کفار آئے چڑھ کے افسوس
کیا تب صلح ان سے واں کے افغاں   بچایا جان کو اپنی ہر اساں
چلے آئے مئو کفار اک دم   ہوئے سب جمع پھر اک بار باہم

اس کے بعد نئے جوش وخروش سے جنگ شروع ہوگئی یہاں بہادروں کے فرداً فرداً کارناموں کا ذکر کیا ہے اور ایک کرامت کا بھی ذکر کیا ہے حملہ آوروں کی طرف سے شدت سے حملہ ہوا:

ہوئے ظاہر بہت میداں میں لڑکے　　وہ دونوں ہاتھ میں شمشیر پکڑے
وہ کرکے قتل کفاروں کو اکثر　　درختوں پر چلے جاتے تھے چڑھ کر

قصبہ کے ایک مشہور بہادر خلیفہ رحیم اللہ کا ذکر تینوں مثنوی نگاروں نے کیا ہے وہ بہت جری تھے فن بنوٹ میں ان کو کمال حاصل تھا، وہ جس طرف حملہ آور ہوتے، دشمن ادھر سے چھنٹ جاتے، مثنوی نگار نے حملہ آوروں کو اعظم گڈھ عدالت سے سزا پانے کے واقعہ پر اپنی مثنوی ختم کی ہے۔

سزا پائی ہر اک حسب قوانین　　بجسب جرم سب کفار بے دین

مثنوی نگار نے ہر واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، شہید ہونے والوں کے نام مقام ومحلّہ کو بتایا ہے ان کے فن حرب میں کمال کو دکھایا ہے، مثنوی اپنے ماحول اور فضا کی ترجمان ہے اردو زبان وادب اور قوافی کی جو خامیاں نظر آتی ہیں وہ قصبہ کے ماحول کا اثر ہے وہ کہنہ مشق شاعر نہیں ہیں البتہ جذبات کی شدت ہر جگہ نمایاں ہے یہ اس وقت کے ماحول کا اثر ہے۔

(۳) تیسری مثنوی جس کو یہاں شہرت حاصل ہوئی وہ مولوی نور محمد صاحب کی ہے جو ایک خاندان میں محفوظ ہے اس کی نقلیں لوگوں نے حاصل کیں اور اپنے طور پر مطالعہ میں رکھا لیکن ان مثنویوں کی علمی سطح بہت پست ہے، نہ قوافی صحیح ہیں نہ الفاظ صحیح ہیں، بڑی حد تک اس کو تک بندی کہہ سکتے ہیں یہ مثنوی ضرور قابل مطالعہ ہے یہ اس دیار میں اردو اجنبیت کی وجہ سے ہے مولوی نور محمد صاحب کوٹھا کی ولادت ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء کو ہوئی یہ با قاعدہ سند یافتہ عالم تھے، دہلی جا کر میاں نذیر حسین سے حدیث پڑھی، فراغت کے بعد درس وتدریس کا بھی عرصہ تک سلسلہ رہا، اتر پردیش اور بہار کے کئی مدرسوں میں فرائض تدریس انجام دیئے، قصبہ کے مشہور مدرسہ فیض عام

میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں آپ کی وفات ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں ہوئی
ان کی یہ مثنوی حادثہ کے ایک سال بعد ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوئی، ان کا خاندان قصبہ میں
اسماعیل کوٹھا کے نام سے مشہور ہے ان کی مثنوی مکمل اور مفصل ہے مثنوی مخطوطہ کی شکل
میں خاندان میں محفوظ ہے، بہت سے لوگوں نے اس کی نقلیں حاصل کی ہیں میرے
سامنے مثنوی کی جو نقل ہے اس کی ابتداء میں تمہید کے عنوان سے بارہ تیرہ صفحات نثر
میں ہیں میرے معلوم نہیں مثنوی نگار کے قلم سے ہے یا ناقل نے یہ اضافہ کیا ہے اس
تحریر میں بہت مستند تاریخی حوالوں سے قصبہ میں صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے
قربانی کے مسئلہ پر یہاں جو اختلافات جھگڑے مقدمات چلے ہر ایک کا تاریخ وار
تذکرہ ہے یہ ساری تفصیل انہوں نے اردو گزٹ اعظم گڈھ کے حوالے سے لکھی ہے
چونکہ یہ تحریر اہم ہے اس لئے اختصار کے ساتھ اس کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

قصبہ میں کتوا برادری مالدار تھی اور یہاں کے انصاریوں پر حاوی بھی تھی کیوں
کہ یہاں کی صنعت پارچہ بافی میں اس دور میں ہاتھ سے کتا ہوا سوت استعمال ہوتا تھا
جو گاؤں میں تیار ہوتا تھا یہ برادری اس کو خرید کر محفوظ رکھتی اور فروخت کرتی تھی، اس
لئے ان کی مہاجنی قائم تھی قربانی کے مسئلہ پر یہ برادری بہت تشدد پسند تھی قصبہ کا پہلا
اور مشہور ترین واقعہ کمال شاہی کا قصہ ہے کمال نام کا ایک بنکر جو باز کی مسجد کے قریب
رہتا تھا اس نے اپنے گھر میں قربانی کی کتوا برادری کو اس کی خبر ہوگئی اور اس کا گھر گھیر
لیا اور گھر میں گھس گئے، وہ ایک مٹی کے بنے ہوئے کوٹھلہ میں چھپ گیا جو غلہ رکھنے
کے لئے بنایا جاتا ہے اس بھیڑ نے اس کو بلم برچھا اور لاٹھیوں سے قتل کر دیا یہ بڑا
دردناک واقعہ تھا پورے قصبہ پر اس کا بڑا اثر تھا، پھر ۱۸۸۴ء کے ایک مقدمہ کا مفصل
ذکر کیا گیا جو بیتی مصر بنام جیتن بیتن واسماعیل کے عنوان سے انگریز مجسٹریٹ ایف
میولاک جنٹ مجسٹریٹ بہادر ضلع اعظم گڈھ کی عدالت میں چلا اس کا فیصلہ جنوری
۱۸۸۴ء میں ہوا فیصلہ میں قصبہ مئو کی تاریخ ۱۸۰۶ء سے نزاع گئو کشی کو دکھایا ہے اور
بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں ایک بلوہ عظیم ہوا بہت سے لوگوں کو سزائیں ہوئیں تعزیری

پولیس قصبہ میں لگائی گئی کبھی ہندوؤں سے اور کبھی مسلمانوں سے رقم وصول کی گئی پھر اس تحریر میں ۱۸۶۴ء کے ایک مقدمہ کے فیصلہ کا ذکر کیا گیا ہے غرضیکہ قصبہ میں یہ نزاع تقریباً ایک صدی تک قائم رہا۔

مثنوی میں بہت سی زائد باتیں بھی ہیں، آغاز داستان کے عنوان سے شاعر نے اصل واقعہ کی ابتدا کی اور بتایا کہ دوہری گھاٹ کی طرف سے کچھ بوچڑ (جانور بیچنے والے نٹ) دیہاتوں سے گائیں خرید کر مسلم علاقہ میں فروخت کرنے کے لئے لا رہے تھے کل ۴۲ گائیں تھیں موضع بھدرسہ میں جب پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے جتھہ بنا کر ساری گائیں چھین لیں، ریوڑ والے فوراً تھانے گئے گائے چھننے کی رپٹ لکھوائی تھانے سے چند سپاہی موقعہ واردات پر پہنچے وہاں ایک مسلح مجمع موجود تھا پولیس نے جب گایوں کی واپسی کے لئے کہا تو مجمع نے پولیس پر حملہ کر دیا اور گائیں لے کر چلے گئے پولیس کچھ نہ کر سکی اور تھانے پر اطلاع دی، تھانیدار مسلح پولیس لے کر پہنچا مجمع سے آٹھ سرغنہ کو گرفتار کیا اور تھانے لایا اور ان پر مقدمہ چلایا عدالت نے ہر ایک کو ایک ایک سال کی سزا دی اور جیل بھیج دیا، ملزمان نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی وہاں کچھ دنوں مقدمہ کی سماعت ہوئی ملزموں پر مزید جرائم ثابت ہوئے ہائی کورٹ میں ڈکیتی، راہ زنی کے جرم میں جج نے سزا کم کرنے کے بجائے تین تین سال کی سزا کا حکم دیا اس طرح ان کی سزا ایک سال سے بڑھ کر چار سال ہوگئی مثنوی نگار نے لکھا۔

یعنی پہلے یہ سزا اک سال تھی ‎ ‎ اور بڑھ کر چار سالہ ہو گئی

مئو کے حادثہ عظیم سے متفرق واقعات جو اطراف میں ہوئے مثنوی نگار نے قاری کو اس سے بھی روشناس کرایا ہے ۱۹/اپریل ۱۸۹۳ء کو ضلع گورکھپور کا ایک واقعہ لکھا ہے جس میں خریدے ہوئے جانور تحریک کے ہم نواؤں نے چھین لئے ان کی کوئی داد وفریاد نہیں ہوئی۔

جب کہ وہ بازار سے گھر لے چلے ‎ ‎ راستے میں ہندوؤں نے آن کے

دل میں لائے کچھ نہ ڈر سرکار کا ‎ ‎ سب زبردستی انہوں نے لے لیا

واقعات متفرقہ میں سونا ڈیہہ کا واقعہ بھی لکھا ہے جس میں ایک بھینس چھین لی گئی تھی یہ ۲۲ اپریل ۱۸۹۳ء کا واقعہ ہے اسی طرح ایک قصاب کے ہاتھ سے بھی جانوروں کے چھیننے کا واقعہ لکھا ہے جو ۲۳ مئی ۱۸۹۳ء کو سکندر پور ضلع بلیا میں پیش آیا، مثنوی نگار نے تین ضلعوں میں گئو رکھشنی کی جارحانہ سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے مئو کے اطراف میں جو فضا گرم تھی اس کی اچھی عکاسی کی ہے اور بتایا ہے کہ عیدالاضحیٰ سے چند دنوں قبل ہی سے سرگرم تحریک شروع ہوگئی تھی اور حملہ شروع کر دیا گیا تھا مئو کے حادثہ عظیم سے ایک دن قبل موضع ادری میں بہت بڑا مجمع اکٹھا ہوا مگر وہاں مقابلہ نہیں ہوا وہاں وقت حالات ماحول اور صورت حال کی ہولنا کی کے مدنظر بڑی شان وشوکت کے ساتھ مجمع نے آکر صلح کی درخواست کی اور مسلمانوں نے صلح کر لی یہاں حملہ آوروں کی منشا کے مطابق خونریزی نہیں ہوئی تو مجمع کا ایک حصہ کوپا گنج کی طرف بڑھا اور بڑا حصہ مئو کی طرف چلا جو یہاں سے دو کوس پر تھا وہاں کے بلوے میں سرگرم حصہ لیا غرضیکہ یہ ایک طویل رزمیہ مثنوی ہے، کہیں کہیں نثر سے بھی وضاحت کی گئی ہے جب قصبہ مئو میں مقابلہ آرائی ہوئی تو اس جنگ کے ہیرو خلیفہ رحیم اللہ کے کارناموں کو بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے ان کے خاندان انکے علم و فضل اور ان سے اپنے تلمذ کا ذکر فخریہ انداز میں کیا ہے ان کے جنگی کارناموں کو ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تھا یہی اس رزم کا روح رواں	ساتھ ساتھ اس کے تھے باقی مردماں
تھا خلیفہ یہ بھی اپنے وقت کا	ہمت و مردانگی میں فرد تھا
قد میانہ اور دہرا تھا بدن	پہلواں روئیں تن واستاد فن
ان کی تھی پوشاک اس دن اے اخی	خاص اپنی آنکھ کی دیکھی ہوئی
پاؤں میں پاجامہ آدھی ساق تک	تھا عرب کے قطع کا بے ریب وشک
اس جری کے تن میں روز کار زار	تھا مزیب اک انگر کھا بند دار
ایک سیہ عمامہ تھا سر پر بندھا	دیکھنے میں کیا ہی دلکش خوشنما
جس طرح فرق رسول اللہ پر	تھا بروز فتح مکہ زیب سر

جوش میں شوق شہادت کے یہ تھے چاند پورہ کے پیاڑے میں کھڑے
غل ہوا نا گاہ، باغی آگئے بس وہیں سے رزم گہ میں آگئے
تھے پٹوکہ سے کمر باندھے ہوئے ہاتھ میں چھوٹی سی اک لاٹھی لئے

پھر شاعر نے جنگ میں ان کے کمالات اور مردانگی کے بہت سے پہلو دکھائے،

ایک موقعہ پر مثنوی نگار نے اس دور کے ایک مشہور عالم مولانا امام الدین پنجابی کا کردار بڑا شاندار لکھا ہے پورے لشکر میں ان کی ولولہ انگیز تقریر کو نظم کیا ہے، دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی موصوف کا تذکرہ کیا ہے لیکن مولوی نور محمد صاحب نے اس ذکر کا حق ادا کر دیا ہے اور میدان جنگ کا نقشہ کھینچ دیا ہے جیسا کہ صحابہ کرام میدان جہاد میں پر جوش تقریریں کرتے پھرتے تھے، بالکل وہی لب ولہجہ وہی جوش وخروش وہی ولولہ انگیز کہ سن کر مارے جوش کے مجاہدین کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور پوری قوت سے دشمنوں پر حملہ آور ہو جاتے مثنوی کا یہ حصہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، چونکہ مثنوی نگار قادر الکلام شاعر تھے اس لئے اس کا حق ادا کر دیا ہے مثنوی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دین داروں کے کمال افسر بھی تھے مولوی اک صوبۂ پنجاب کے
نام امام الدین، پنجابی لقب ہمت وجرأت میں یکتا، منتخب
دیتے تھے ترغیب اور تحریص جنگ تا بڑھیں دل اور پیدا ہو امنگ
شیر مردو! جیت لو میدان کو یا فدا کر دو تم اپنی جان کو
کر دو ٹھنڈی یا کہ نار کار زار یا کہ اپنی جان کو کردو نثار
یاد رکھو مومنان پاک دیں مژدۂ جاں بخش ختم المرسلیں
جنت الفردوس، باغ سرمدی تیغ کے سائے کے نیچے ہے دھری
ہے شہادت، آج گر مارے گئے اور اگر زندہ بچے غازی ہوئے
آج کے دن ہیں، در جنت کھلے شوق سے تم بے خطر، جاؤ چلے

یہاں نثر میں آیات قرآنی اور نظم میں جنت کی نعمتوں کی تفصیل بھی ہے آخر میں

مثنوی نگار کہتا ہے۔

کہہ رہا ہے آج رب العالمیں　　میرے پیارے غازیان پاک دیں
بیچتا ہوں آج فردوس بریں　　لے لے بدلے اس کے جان مومنیں
مول لیتا ہوں میں جان مومنیں　　اس کے بدلے دے کے فردوس بریں

شاعر نے پھر بتایا کہ اس تقریر سے مسلمانوں میں جوش وخروش بڑھ گیا اور بڑی بہادری سے لاکھوں حملہ آور مارے گئے اور مسلمانوں میں چھ حضرات شہید ہوئے پھر پولیس آئی قصبہ کے حملہ آوروں میں سے کچھ کی گرفتاری ہوئی اور شہدا کی لاشوں کو اٹھوا کر تھانے لائے اور یہاں اعظم گڈھ بھیجی گئیں مثنوی نگار نے شہیدوں کی تعداد نام بہ نام چھ بتائی ہے یہی دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی لکھا ہے، اعظم گڈھ میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوا دوسرے دن لاشیں ورثاء کو سپرد کردی گئیں، لاشوں کولیکر پا پیادہ اعظم گڈھ سے مئو آئے یہاں عامۃ المسلین نے جمع ہوکر اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ شہدا کو عیدگاہ کے قریب امام باڑے کے میدان میں یک جا ایک قبر میں دفن کیا جائے چنانچہ ایک وسیع وعریض قبر کھودی گئی جس میں ساری لاشیں بلا غسل وکفن خون آلود کپڑوں میں دفن کی گئیں پورے قصبہ میں حزن وغم کا عجیب عالم تھا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر گھر سے ایک جنازہ اٹھ رہا ہے۔

جن تینوں مثنویوں کا تعارف کرایا گیا ہے اس دور کی فضا کا ہر ایک پر پورا پورا اثر ہے مغلیہ دور سے لے کر اب تک بہت وقار باعزت رہے اس مظلومیت کا تصور بھی نہی تھا اس لئے یہ حادثہ عرصہ تک یہاں کے عوام کے دل ودماغ پر چھایا رہا یہ واقعہ جون ۱۸۹۳ء میں ہوا اور دوسرے سال ۱۸۹۴ء انگریز افسران نے دونوں فریق میں صلح کرائی۔

تینوں مثنویاں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں، تینوں میں واقعہ کی منظر کی کوشش کی گئی ہے، لیکن زبان وبیان شاعرانہ کم ہے بس وزن اور بحر کا لحاظ رکھا گیا ہے، قوافی اور ردیف میں بھی لغزشیں ہیں، پہلے مثنوی نگار خلیفہ پیر محمد معمولی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں، دوسرے مثنوی نگار عالم فاضل ضرور ہیں لیکن شعر وادب سے واسطہ کم معلوم ہوتا

ہے اس لئے غلیل کو گردیل اور مٹی کی گولی کو گلٹا کہتے ہیں اسی طرح مقامی بولی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں، تیسرے مثنوی نگار مولوی نور محمد کوٹھا مستند عالم اور درس وتدریس سے ہمیشہ وابستہ رہے اس لئے زبان وبیان پر قدرت لب ولہجہ عالمانہ محسوس ہوتا ہے۔

یہ تینوں مثنویاں مخطوطہ کی شکل میں کہنے والے کے خاندان میں محفوظ ہیں اور کوئی اب تک طبع نہیں ہوئی ہے، مثنوی میں انگریزی حکومت کی تعریف اور اس کے لئے دعا خیر کا ذکر پوری مرعوبیت کے ساتھ پایا جاتا ہے بات یہ ہے کہ ہندوستان گیر بغاوت ۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں انگریزوں نے جو بے پناہ مظالم کئے تھے اس نے پورے ملک کو تھرتھرا دیا تھا بالخصوص مسلمانوں کے پچاسوں ہزار افراد کو پھانسیوں پر چڑھا دیا گیا، کالے پانی بھیجا گیا ان کی یاد ابھی لوگوں کے ذہن میں موجود تھی اور بچھو کی طرح احساس کو ڈنک مار رہی تھی، یہ خیر خواہی وقت کی مجبوری ہے، مثنوی میں الفاظ سہل سادہ، روانی وسلاست قوافی وردیف میں برجستگی سے جان پڑتی ہے انداز بیان میں جاذبیت ضروری ہے ورنہ مثنوی خسرہ کھتونی بن کررہ جائیگی، بدقسمتی سے ان مثنویوں میں یہ خامیاں موجود ہیں۔

مولانا آزاد اور ہندوستان کی آزادی

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ سیاستدانوں کے حلقہ میں ایک ایسی قد آور شخصیت تھی جس کے سامنے سارے سیاستداں بونے معلوم ہوتے تھے، فہم وفراست نکتہ سی ومعاملہ فہمی، بصیرت ودوراندیشی، حالات وماحول کی نبض شناسی وہ کون سا جوہر ہے جو اس شخصیت میں نہ رہا ہو پیچیدہ تر مسئلہ کو اس کی عالی دماغی اس طرح حل کرتی جیسے اس سے سادہ اور کوئی مسئلہ ہی نہ ہو، سیاسیات کی الجھی ہوئی گتھیوں اور مسائل کے عقدۂ لاینحل کو ان کا ناخن گرہ کشا اس طرح کھول دیتا تھا جیسے اس کے نزدیک یہ گرہ بھی کوئی گرہ تھی، تقریر وتحریر دونوں مثالی، وہبی اور خداداد، اس کا قلم خارا شگاف، دلوں کی دنیا زیر وزبر کرنے والا، جس موضوع پر چل پڑا، پورے ملک میں تہلکہ مچادیا، اس کے اخبار کے صفحات طریقہ اظہار کی جدت وعظمت اور جوش تحریر کے دہکتے اور لودیتے ہوئے انگارے اپنے دامن میں لے کر عوام وخواص کی محفلوں میں جب آتے تو یہ آگ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے سینوں میں دہکنے لگتی تھی، اس کے قلم کی جادو نگاری اور جرأت نگارش نے اسے برطانوی حکومت کی نگاہ میں معتوب بنادیا اور اسے بنگال کی سرزمین سے جلاوطن کرایا، وہی شخصیت جب مسند خطابت پر متمکن ہوتی اور اس کی رعد آسا آواز فضا میں گونجتی تو برطانوی اقتدار کے شیش محل کے در ودیوار لرزنے لگتے تھے، تقریر سننے والوں کا تاثر یہ تھا جیسے کوئی طوفان گرجتا، اڈتا دھاڑتا، مایوسی وشکست خوردگی کے سارے خس وخاشاک کو اپنے تیز دھارے میں بہاتا ہوا آگے بڑھتا جارہا ہے، نپے تلے الفاظ، تیر ونشتر کی طرح تیز وتند جملے، دلوں کی دنیا میں ہیجان کرنے والا انداز بیان، آواز کا اتار چڑھاؤ، زیر وبم، تسلسل وروانی، سلاست بیان، جوش خطابت کی سحر آفرینی کی وجہ سے کچھ ایسا سماں بندھ جاتا تھا کہ سننے والوں کو اپنے

گردوپیش کا ہوش نہیں رہتا تھا، پورا مجمع جیسے مسمر بزم کا معمول ہو کر رہ گیا ہو۔

علم وفضل خداداد تھا، مطالعہ اتنا وسیع تھا جیسے اس کا دماغ ایک ایسی لائبریری ہو جس میں ہر موضوع پر تحقیقی مواد موجود ہے، اس قد آور شخصیت کی رفعت وبلندی کا جائزہ لینے کے لئے بڑے بڑے مدعیان علم جب اپنا سر اٹھاتے تھے تو ان کے سروں کی دستار فضیلت گر جاتی تھی اور نگاہیں احساس کمتری سے جھک جاتیں اسی عبقری، بے مثال عجوبۂ روزگار شخصیت کو سارا ملک پورے ادب واحترام کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کے پرعظمت نام سے یاد کرتا ہے اور ان کی خدمت میں عقیدت واحترام کے نذرانے پیش کرتا ہے، ان کی مرعوب کن مجلس میں بڑے سے بڑی علمی اور سیاسی شخصیتوں کو نہ جرأتِ گفتار تھی، نہ یارائے سخن، ان کے فضل وکمال عظمت وجلال کے آستانے پر ہر سر خم، ہر پیشانی وفور عقیدت واحترام سے جھکی ہوئی، اور احساس برتری سے تنی ہوئی گردنیں اس طرح جھک جاتیں جیسے وہ وبال دوش ہوں۔

قدرت کی فیاضی:

قدرت بھی مولانا آزاد کے سلسلہ میں کتنی فیاض تھی؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی ان کی عمر تیرہ اور چودہ سال ہی کی تھی کہ ان کے زور خطابت اور ان کے قلم کی سحر نگاری نے پورے ملک کے دانشوروں اور مفکروں سے اپنا لوہا منوالیا اور ان کی محفلوں میں اس نوعمر لڑکے کے لئے مسند صدارت خالی کر دی جاتی تھی، اسی کمسنی کی عمر میں بڑے بڑے مفکرین اور اہل علم نے ان کو ''مولانا'' اور ''ابوالکلام'' کا معزز خطاب دے دیا حالانکہ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے صرف فیروز بخت یا محی الدین تھے کیوں کہ ابھی وہ بچپن کے حدود سے نکلے بھی نہیں تھے۔

حالی کی حیرت:

مولانا آزاد فطرتاً انتہائی ذکی وذہین تھے، بارہ تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے

اپنی صلاحیتوں کا مظارہ کیا تو اس وقت کے مسلم الثبوت اہل علم انہیں دیکھ کر انگشت بدنداں اور حیرت زدہ رہ گئے ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس میں وہ نظر آنے لگتے ہیں اور ہندوستان کے معیاری رسالہ ''مخزن'' لاہور میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے ہیں، یہ مضامین زور بیان، شوکت الفاظ، صحافیانہ انداز نگارش کے شاہکار ہیں اور علمی مجلسوں مین ان کے دقیع تعارف کا ذریعہ بنتے ہیں اور جب ان مضامین کے پڑھنے والوں سے آزاد کا بالمشافہہ تعارف کرایا جاتا ہے تو حالی وشبلی جیسے اہل علم کو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ کمسن لڑکا ایسے مضامین لکھ سکتا ہے، لیکن سچائی یہی ہے، اس لئے لوگوں کو تجربات کے بعد یقین کرنا ہی پڑا۔

اخبار ''لسان الصدق'' ۲۰ نومبر ۱۹۰۲ء کو آزاد کی ادارت میں جاری ہوا اس وقت آزاد کی عمر صرف ۱۴ سال تھی، اخبار جلد ہی علمی حلقوں میں مقبول ہو گیا اس کی مقبولیت کی واحد وجہ یہی تھی کہ آزاد کے قلم سے اہم ترین مسائل پر محققانہ مضامین خطیبانہ زور بیان کے ساتھ شائع ہوتے تھے، مئی ۱۹۰۳ء سے حالی کی مشہور کتاب ''حیات جاوید'' پر تبصرہ شروع کر دیا اور کئی قسطوں میں مسلسل لکھتے رہے اس سلسلہ مضمون نے حالی اور ان کے حلقے کو بہت متاثر کیا اور جب مولانا آزاد انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے تو حالی بھی اس جلسہ میں موجود تھے، مولوی وحید الدین نے حالی سے آزاد کا تعارف کرایا کہ یہ ہیں ''لسان الصدق'' کے مدیر گرامی آزاد، تو حالی حیرت سے اس کمسن لڑکے کا منہ دیکھتے رہ گئے، اور بار بار پوچھتے رہے کہ، یہ آزاد ہیں؟ آخر حالی نے خود آزاد سے ان کی عمر دریافت کی، پھر اس کے بعد کہا، ابھی بہت کمسن ہو۔

آزاد کے لئے مسند صدارت خالی کر دی گئی:

آزاد لسان الصدق کے علاوہ دوسرے اخبارات میں بھی مضامین لکھتے رہے، ان کا ہر مضمون اہل علم کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتا تھا، کسی بھی اخبار یا رسالہ میں ان کا مضمون شائع ہوتا تھا تو لوگ ذوق وشوق سے اس کو حاصل کرتے اور بیساختہ داد

وتحسین دیتے، زور قلم کے ساتھ قدرت نے آزاد کو مزاج بھی خطیبانہ دیا تھا، ان کی تقریر کی جادواثری کے وہ تمام لوگ شاہد ہیں جنہوں نے ایک بار بھی آزاد کی تقریر سنی ہے۔

۱۹۰۴ء میں جب انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہوا تو اس کے ایک اجلاس کی صدارت سولہ سالہ آزاد کو دی گئی ان کی صدارتی تقریر زورِ بیان، شوکت الفاظ، روانی وسلاست، بیساختگی و برجستگی، حالات ومسائل پر بے لاگ اور مستحکم رائے کا اظہار کچھ اتنا پر اثر تھا کہ اس تقریر کے بعد کسی جوہر شناس نے اس نوعمر لڑکے کو ''ابوالکلام'' کہہ کر پکارا اور عالمانہ انداز بیان نے اس کمسنی ہی میں، مولانا کی دستار فضیلت ان کے سر پر باندھ دی اور پھر آپ پورے ملک میں ''مولانا ابوالکلام آزاد'' کے نام سے مشہور ہوگئے، یہ نام ہی ہندوستان کے لاکھوں انسانوں کے ساز دل کے لئے مضراب بن گیا، تحریروں سے لذت لینے والے ابھی سیر بھی نہیں ہوئے تھے کہ سامعہ نے آگے بڑھ کر انکے الفاظ کے موتیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کر دیا۔

علامہ شبلی اور آزاد:

علامہ شبلی ممبئ میں مقیم تھے، مولانا آزاد بھی انہیں دنوں ممبئ گئے ہوئے تھے اس وقت ان کی عمر کا سترہواں سال چل رہا تھا، دونوں کی ملاقات ایک مجلس میں ہوئی تو علامہ شبلی نے ان کو مولانا ابوالکلام آزاد کا بیٹا سمجھا اور ان سے کہا کہ ''ابوالکلام آزاد آپ کے والد ہیں؟ مولانا آزاد نے مسکرا کر کہا کہ میں خود ابوالکلام ہوں، علامہ شبلی کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ اس سے پہلے وہ اخباروں کے ذریعہ مولانا آزاد کی شعر وشاعری اور ان کی ساحرانہ انشاپردازی سے واقف تھے اسی واقفیت کی روشنی میں آزاد کو ایک کہنہ مشق اور عمر دراز آدمی تصور کرتے تھے لیکن علامہ شبلی کی یہ حیرت زیادہ دیر تک نہیں رہی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مجلس میں مولانا علی محمود اور پنجاب کے مولانا نظام الدین اور علامہ شبلی کی ایک صحبت میں مناظرہ کی کسی بحث میں ''رشیدیہ'' کے متن پر گفتگو ہورہی تھی، علامہ شبلی مولانا علی محمود کو رشیدیہ کے بعض مطالب کو سمجھانا چاہتے تھے

لیکن مولانا علی محمود ہر بار الجھ پڑتے تھے، کج بحثی بڑھتی چلی گئی تو مولانا آزاد نے بحث میں دخل دے کر مولانا علی محمود کو اپنے دلائل سے مطمئن کیا اور وہ خاموش ہو گئے، علامہ شبلی بہت محظوظ ہوئے اور کہا کہ اپنی تقریر پوری کرو، تب مولانا آزاد نے ایک زوردار تقریر کی جس سے خوش ہو کر علامہ شبلی نے کہا صاحبزادے! تمہارا دماغ عجائب روزگار میں سے ہے، تمہیں کسی علمی نمائش میں بطور عجوبہ پیش کرنا چاہئے، انہیں ملاقاتوں کا تاثر تھا کہ علامہ شبلی نے مولانا آزاد کو اس کم عمری کے باوجود ''الندوہ'' کا ایڈیٹر بنادیا۔

آزاد نے اپنی راہ خود بنائی:

مولانا آزاد انگریزی زبان کی اہمیت کے پیش نظر ۱۹۰۴ء میں مولوی محمد یوسف جعفری سے انگریزی سیکھنی شروع کی، چونکہ ذہن دراک اور ذہانت فطری تھی اس لئے بہت جلد انگریزی کتابوں کے مطالعہ کی ان کی استعداد پیدا ہو گئی، اور ہر موضوع پر انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھنی شروع کردی، اگرچہ زندگی میں کبھی بھی انہوں نے انگریزی کو اپنا ذریعہ اظہار نہیں بنایا جب کہ ان کو زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی، انگریزی زبان پر عبور حاصل کرنے کا جذبہ صرف اس لئے پیدا ہوا کہ مستقبل میں انہیں یورپ اور دوسرے ملکوں کا دورہ کرنا ہندوستان میں تیز تر سیاسی سرگرمیوں کے لئے ضروری تھا اس کا خاکہ وہ اپنے ذہن میں بنا چکے تھے، ہندوستان میں ان کی مقبولیت وشہرت بڑھتی جارہی تھی، امرتسر کے مشہور اخبار ''وکیل'' کے مالک نے بہ اصرار الندوہ سے استعفاء دینے پر آپ کو مجبور کیا اور اپنے اخبار وکیل کی پوری ذمہ داری آپ کے سپرد کردی، وکیل اس زمانہ میں اردو کا مشہور ترین اخبار تھا، آپ نے اس اخبار کے ذریعہ علی گڈھ اور ترکی کے مسائل پر اپنے خیالات کا پوری بلند آہنگی کے ساتھ اظہار کیا، اخبار کی اشاعت کئی گنی بڑھ گئی۔

مولانا آزاد انقلابیوں کے ہراول دستے میں:

آزاد کی عمر کا سترہواں سال تھا، اب وہ ہندوستان میں دور دور تک متعارف ہو

چکے تھے، اخبار کے صفحات اور اسٹیج دونوں سے ان کی صلاحیت وقابلیت ذہن ومزاج، عظمت فکر ونظر، استنباط مسائل، استخراج نتائج کی بے پناہ استعداد کا اب ہر شخص اعتراف کرتا جارہا تھا، اس کم عمری ہی میں آزاد ہندستان کی آزادی کے مسئلہ پر انتہائی سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ سوچنے لگے تھے اور مسلمانوں میں بیداری اور جوش جہاد پیدا کرنے کی راہیں سوچا کرتے تھے، اس وقت تک مسلمانوں کا کوئی طبقہ اجتماعی طور پر میدان میں نہیں آیا تھا جو براہ راست برطانوی اقتدار سے نبرد آزما ہو، برادران وطن کی بھی کوئی ایسی تنظیم نہیں تھی جس نے آزادی کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہو، انڈین نیشنل کانگریس ابھی سرکار پرستوں کے نرغے میں تھی، البتہ انڈرگراؤنڈ کچھ سیاسی سرگرمیاں بنگال میں جاری تھیں جس کا مقصد برطانوی اقتدار کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا تھا، تھانوں پر حملہ کرنا، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا اس کے پروگرام میں شامل تھا۔

مولانا آزاد بھی تیز تر سیاسی سرگرمیوں کے حق میں تھے لیکن ابھی تک ان کے سامنے کوئی واضح راستہ نہیں تھا اتفاق سے انہیں حالات میں ان کا تعارف بنگال کے مشہور انقلابی لیڈر شیام سندر چکرورتی سے ہو گیا، یہ جنوری ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے، مسٹر چکرورتی مولانا آزاد کے خیالات وجذبات اور گفتگو سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے دوسرے انقلابیوں سے مولانا آزاد کا تعارف کرایا، انڈرگراؤنڈ کام کرنے والے انقلابی ہر نئے آدمی کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ معلوم نہیں کون برطانوی ایجنٹ اور جاسوس ہے اس لئے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے اس لئے پہلے مرحلہ پر مولانا آزاد سے بھی ان کو بدگمانی رہی کیونکہ یہ وہ دور تھا جب بنگال کی سرزمین میں ہونے والی تیز تر سیاسی سرگرمیوں میں مسلمانوں کا وجود عنقا تھا اور عام طور پر ان کے ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ مسلمان انگریزی حکومت کا خیر خواہ ہے، سرسید اور ان کے ہم نواؤں کے خیالات، ان کی سرگرمیاں، غلامانہ ذہنیت کا اظہار ان کی نگاہوں کے سامنے تھا اس لئے انقلابی ہندو بنگالی کسی مسلمان پر قطعی بھروسہ نہیں کرتے تھے،

مولانا آزاد کے سامنے بھی یہی صورتِ حال آئی ہر انقلابی نے مولانا آزاد کو شبہہ کی نگاہ سے دیکھا، اس لئے انقلابیوں کی عام مجلسوں تک تو مولانا آزاد کی رسائی تھی لیکن ان کی خصوصی میٹنگوں میں ان کی شرکت کو وہ پسند نہیں کرتے تھے ان کے دلوں میں یہ کھٹک تھی کہ ممکن ہے یہ بھی سرسید کے ہم نواؤں میں سے ہوں مولانا نے اس صورت حال کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان کی خودداری کو ٹھیس لگ رہی تھی اس لئے انہوں نے انقلابیوں سے بحثیں کیں، گرما گرم گفتگوئیں کیں اور بالآخر ان کو اس صداقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ چند سرکاری مسلمانوں اور عہدہ داروں کو دیکھ کر پوری مسلمان قوم پر بداعتمادی کرنا غلط ہے، تمام اسلامی ممالک مصر، ایران، اور ترکی میں جمہوریت کی بحالی کے لئے مسلمان سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے دل آزادی کی تڑپ سے خالی ہوں یہ انقلابیوں کی غلطی ہے کہ وہ مسلمانوں میں کام نہیں کرتے اور قصداً ان کو سیاسی سرگرمیوں میں شریک نہیں کرتے، مولانا آزاد نے ان کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ اگر مسلمان قوم کو سیاست سے بے دخل کر دیا گیا اور ان سے علیحدہ ہو کر کوئی جدوجہد کی گئی تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، حصولِ آزادی کے لئے دونوں کی مشترکہ جدوجہد ضروری ہے اس کے بغیر آزادی کا تصور بھی محال ہے۔

پہلے تو وہ مولانا آزاد کی باتوں پر یقین نہ کر سکے لیکن بتدریج انقلابی مولانا آزاد کے ہم نوا اور ہم خیال ہوتے گئے، دوسری طرف مولانا آزاد نے مسلمان نوجوانوں میں کام کرنا شروع کر دیا، ان میں آزادی کا جذبہ اور جوش عمل پیدا کرنے کے لئے اپنی شعلہ بیانی اور آتش نوائی سے کام لیا اور مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں جوش عمل کی آگ بھڑکا دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد مسلمان نوجوانوں کی ایک پرجوش جماعت نے آزادی کے پرچم کو پوری قوت سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا، اس طرح ہندو بنگالی انقلابیوں کا ذہن ازخود صاف ہوتا چلا گیا، مسلمان بنگالی انقلابیوں نے بنگال میں اتنی تیز تر سیاسی سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا کہ پورے بنگال کو شعلۂ جوالہ اور

کو آتش فشاں بنا دیا، سیکڑوں نو جوانوں نے قید و بند کو کھیل سمجھ لیا اور کتنوں نے آگے بڑھ کر دار و رسن کو چوم لیا۔

یورپ اور مسلم ممالک کا دورہ:

۱۹۰۷ء کی ابتداء میں مولانا آزاد عراق، شام، ترکی اور مصر کے دورے پر گئے، اسی سال آپ نے یورپ کے بعض ملکوں کا بھی دورہ کیا، مقصد سفر کیا تھا؟ اس کے متعلق مولانا آزاد نے صراحتاً کوئی بات نہیں کہی ہے، البتہ قرائن سے ان کا مقصد سفر متعین کیا جا سکتا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مولانا آزاد انقلابیوں کے ہراول دستہ میں شامل ہو چکے تھے اور مسلمانوں کا انقلابیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، مستقبل میں اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کو آپ بصیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اس لئے آپ نے سب سے پہلے خود ان سے رابطہ پیدا کیا اور اس تحریک آزادی میں شمولیت کے بارے میں اپنے اخلاص کا پورا یقین دلا دیا تب آپ نے بڑی شدت سے یہ محسوس کیا کہ جلد از جلد آزادی کے دیوانوں کی صف بندی کی جائے پھر آپ نے اس کے لئے جدوجہد کی اور ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے مسئلہ پر ہندو اور مسلمانوں کا ملا جلا جو ردِ عمل حکومت کے سامنے آیا یہ نتیجہ تھا مولانا آزاد کی مسلسل جدوجہد کا۔

لیکن خود مسلمانوں میں مستقل طور پر کس نہج پر کام کیا جائے؟ اس کا کوئی واضح راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں تھا اسی راستہ کی تلاش میں مسلم ممالک اور یورپ کا دورہ کیا، کیونکہ اس سفر میں آپ نے انہیں لوگوں سے زیادہ ملاقاتیں کیں جو ان ملکوں میں انقلاب کے ہراول دستے میں شامل تھے، ترکی میں ''ینگ ٹرکش گروپ'' اور مصطفےٰ کمال کے ہم نواؤں سے ان کی ملاقات ہوتی ہے، عراق میں غزالی انقلابیوں سے راہ رسم پیدا کی جا رہی ہے، ترکی میں انقلاب کے چند اہم لیڈروں سے ان کی ملاقاتیں اہمیت کی حامل ہیں، اور جب آپ ہندوستان واپس آئے تو ان ممالک کے قائدین تحریک سے آپ کی خط و کتابت بھی رہی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان ممالک میں

ہندوستان میں لڑی جانے والی جنگ آزادی میں رہنمائی کی تربیت حاصل کرنے گئے تھے اور انہوں نے اس سبق کو خوب یاد رکھا کیونکہ بعد میں انہیں خطوط پر آپ نے کام شروع کیا جن کا آپ مشاہدہ کر چکے تھے حتی کہ وہی لب ولہجہ اور طرز فکر بھی اپنا لیا جو مسلم ممالک میں سکہ رائج الوقت بنا ہوا تھا۔

مولانا آزاد کی آواز بانگ درا بن گئی:

مولانا آزاد اگرچہ تیز تر سیاسی سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک ہیں لیکن وہ ابھی تک اپنا حلقۂ عمل صحیح طور پر نہیں بنا سکے ہیں، ان کی فہم وفراست تدبر وذہانت اور عبقری ذہن ودماغ نے جو عقدے حل کئے تھے اور آزادی کی تحریک کو صحیح سمت دینے اور اس کے لئے ایک پرجوش ٹیم تیار کرنے کے لئے ان کے ذہن میں جو خاکے تھے ان میں رنگ بھرنے کے لئے ان کو کوئی ایسا اخبار چاہئے تھا جس کو آزادی کے ساتھ ایک پالیسی پر چلا سکیں اور قوم کو مسلسل جھنجھوڑ کر بیدار کر سکیں اس مقصد کے لئے مسٹر محمد علی نے جنوری ۱۹۱۱ء میں جب کامریڈ نکالا تو مولانا آزاد کا یہ جذبہ جوالا مکھی بن گیا اور انہوں نے بڑی سرگرمی سے اس پہلو پر سوچنا شروع کر دیا، اس زمانے میں پنجاب اور یوپی سے بہت سے روزنامے، ہفت روزہ اور ماہنامے نکلتے تھے لیکن اردو کی کتابت وطباعت کی طرف سے وہ مطمئن نہیں تھے وہ اس میں جدت پیدا کرنے کے قائل تھے اس لئے خط نستعلیق کے بجائے اردو ٹائپ کو ترجیح دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ ایک ایسا پریس قائم ہو جس میں اردو ٹائپ میں اخبار چھپ سکے اور اخبار میں تصویریں بھی شائع ہو سکیں اسلئے انہوں نے کلکتہ میں الہلال نام سے ایک پریس قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مولانا آزاد کا ہر فیصلہ درحقیقت عمل کا نقطہ آغاز بن جاتا ہے، انہوں نے حسب منشا ٹائپ کا پریس قائم کر لیا، اور ۱۳؍ جولائی ۱۹۱۲ء کو ''الہلال'' نام سے اپنا منفرد اور ممتاز اخبار نکالا، جو اخباروں کی دنیا میں اس طرح رہا جیسے خزف ریزوں کے ڈھیر میں یاقوت وجواہر سے مرصع تاج زریں، اس نے پہلی ہی اشاعت میں پورے ملک کو

چونکا دیا اور آناً فاناً اس نے وہ مقبولیت حاصل کر لی جواب تک کسی اردو اخبار نے نہیں حاصل کی تھی، الہلال پڑھنے والے اس کی تاریخ اشاعت پر بڑی بے چینی کے ساتھ ڈاکیہ کا انتظار کرتے اور ہاتھ میں آتے ہی جب تک ابتدا سے انتہا تک اسے ختم نہیں کر لیتے دوسرے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، بہت جلد ہی اس کی اشاعت ۲۸ ہزار تک پہنچ گئی اور اس کے بہت سے شمارے دوبارہ سہ بارہ شائع کرنے پڑے، یہ اخبار ایسا تھا کہ اس کو رندان خراباتی سے لیکر علماء ومشائخ کی خلوتوں تک شرف باریابی حاصل تھا اس کے مصور ہونے کے باوجود اہل تقویٰ وفتویٰ سبھی پڑھتے تھے۔

ابھی تک سیاسی سرگرمیاں ایک مخصوص حلقہ میں تھیں اور ابھی تک سیاست اور سیاسی مسائل پر بحث ومباحثہ خلوت کدوں سے سڑکوں اور بازاروں میں نہیں آئی تھی، الہلال نے جذبۂ آزادی کی آگ کو اتنا دہکایا کہ لاکھوں سینے اس کی بھٹی بن گئے اور خواص سے گذر کر عوام تک ہر طرح کی قیامتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ سینوں میں رکھنے لگے، مولانا آزاد نے اخبار کے صفحات سے شعلہ بیان مقرر اور آتش نوا خطیب کا کام لیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی خلافت سے ہندوستانی مسلمانوں کا جذباتی رشتہ قائم ہو چکا تھا اور ہر دل ترکوں کی ہمدردی سے معمور تھا، یہاں کے غریب عوام ترکوں کے لئے چندے کرتے ہیں، جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور دوا علاج کے لئے یہاں سے طبی مشن بھیجے جاتے ہیں جیسے ترکوں کا مسئلہ خود اپنے گھر ہندوستان کا مسئلہ ہو اس طرح کا جوش وخروش پایا جاتا تھا، خدمت کا ایک نشہ ہر شخص پر سوار تھا، الہلال نے اس شراب کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا کیونکہ اس میں ایک پہلو انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کا بھی تھا اس لئے سیاسیات عالم پر نظر رکھنے والا وہی کریگا جو الہلال کر رہا تھا، اس لئے ہندوستان کا علمی حلقہ خصوصیت سے الہلال کا دیوانہ تھا یہ وقتی مسائل پر بڑی جچی تلی رائے پیش کرتا تھا، اس کے ہر آرٹیکل میں خلوص اور اظہار بیان سے تدبر وفراست کا نور جھلکتا تھا، جذباتی مسائل کے موقعوں پر برطانوی حکومت کے ایوان غرور پر نفرت وغصہ کے انگارے برسانے میں اس نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی، ایسے

موقعوں پر الہلال کا قلم خارا شگاف بن جاتا تھا۔

۱۹۱۳ء کے اہم ترین مسائل میں مسجد کانپور کے توڑے جانے کا واقعہ اور علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء کی سرد جنگ کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے ان موقعوں پر الہلال نے جو کچھ لکھا وہ قول فیصل تھا اور مسجد کانپور کے انہدام کے مسئلہ پر مسلمانوں کی غیرت وحمیت کی رگوں میں جوش انتقام کا گرم خون دوڑا دیا، الہلال کا آرٹیکل ''مشہد اکبر کا دردناک نظارہ'' نے ہزاروں شعلہ بیان خطیبوں، اور آتش نوا اسپیکروں سے زیادہ کام کیا، ایوان حکومت میں زلزلہ آگیا، اس کی پر غرور جبین اقتدار پر شکن پڑ گئی اور برطانیہ کی نادر شاہی حکومت نے الہلال کو پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ کرلیا، الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کرلی۔ ۸؍ستمبر ۱۹۱۳ء کو زرِ ضمانت طلب کیا گیا اور ۲۳؍ستمبر ۱۹۱۳ء کو دو ہزار کی ضمانت دیدی گئی جسے حکومت نے ضبط کرلیا، اس کے چند ہی دنوں بعد الہلال سے دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی مولانا آزاد نے یہ ضمانت بھی دیدی اور الہلال کو جاری رکھا، بعد میں یہ ضمانت بھی ضبط کرلی گئی۔

آپ نے البلاغ کے نام سے دوسرا پریس قائم کیا اور اخبار البلاغ جاری کیا ۱۲؍نومبر ۱۹۱۵ء کو اس کا پہلا شمارہ نکلا، یہ اخبار بھی الہلال کا نقش ثانی ثابت ہوا وہی لب ولہجہ، وہی تیور، وہی انداز بیان وہی جذبات وہی خیالات وہی پالیسی اس لئے معلوم تھا کہ اس کی زندگی بھی بہت مختصر ہوگی، چنانچہ ۳۱؍مارچ ۱۹۱۶ء کو پانچ مہینہ کی زندگی میں برطانوی سامراج کی بھینٹ چڑھ گیا اور اخبار ضبط کرلیا گیا۔

مولانا آزاد جلاوطن کئے گئے:

اخبار کی ضبطی کے ساتھ مولانا آزاد کا پورے صوبہ بنگال سے اخراج کردیا گیا، پنجاب اور یوپی میں داخلہ پہلے ہی سے بند تھا اس لئے آپ نے بہار کے ایک مقام رانچی کو منتخب کیا، بعد میں جلاوطنی نظر بندی میں تبدیل کردی گئی اور آپ پر ہر طرح کی قانونی پابندیاں عائد کردی گئیں، اسی قید خانے میں گاندھی جی نے مولانا آزاد سے ملنا

چاہا تو حکومت نے ان کو ملاقات کی اجازت نہیں دی کیونکہ ان کو گاندھی جی سے بھی بڑا حکومت کا دشمن سمجھتی تھی۔

مولانا آزاد کی خودنوشت سوانح:

اگست ۱۹۱٦ء میں مولانا آزاد کی خودنوشت سوانح حیات تذکرہ کے نام سے شائع ہوئی جب کہ رانچی میں نظر بندی کا سلسلہ جاری تھا، کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی، زبان وادب کی چاشنی، انداز بیان کی شوخی، استعارات وکنایات کا مینا بازار بادہ وساغر کی اصطلاح میں معارف وحقائق اور مشاہدۂ حق کی گفتگو، اندازِ بیان زبان وادب کا چٹخارہ رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب خوان صد ہزار نعمت ثابت ہوئی یوں تو کہنے کو یہ آپ بیتی ہے، نجی زندگی کے حالات ہیں لیکن استعارات وکنایات کے اتنے دبیز پردے ہیں کہ حقیقت وواقعیت کا پتہ لگانا کچھ آسان نہیں اور شاید دانستہ ایسا کیا گیا کیونکہ ہندوستان ہمیشہ سے عجوبہ پسند رہا ہے، کھلی ہوئی حقیقیت اسے دیر میں متأثر کرتی ہے لیکن جو بات علم وادراک کے حدود سے آگے ہو، اندھیروں کے لمس کی طرح اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے تو اس کی طرف دلوں کی عقیدت جھکتی ہے اور مرعوبیت سجدہ ریز ہوتی ہے، یا ان کے جدت پسند ذہن نے ایک نئے اسلوب کی آپ بیتی کہنے کا تہیہ کیا ہو، اور یہ بھی مدنظر رہا ہو کہ ہر شخص اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس کے مفہوم کو سمجھے، غرضیکہ پوری کتاب پڑھ جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ نرم اور ملائم، خوبصورت، حسین، رنگارنگ، جاذب نظر ریشم کے تھان پلٹے جارہے ہیں ریشم کی ملائمت کا لمس انگلیوں میں گدگدی پیدا کرے گا، آنکھیں سرور حاصل کریں گی، لیکن جب آخری پردہ اس ریشمی تھان کا اٹھ جائے گا تو اس میں اس عبت حریر کا وجود کا عنقا ہوگا جس کی آپ کو تلاش ہے، کیونکہ وہ اس میں مستور ہی نہیں تھی، ریشمی تھانوں کی دکان سے نگاہیں لذت اندوز ہوسکتی ہیں لیکن دل کی تشنگی اس سے دور نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆

رانچی نظر بندی کی یادگار:

مولانا آزاد کی رانچی میں نظر بندی دراز سے دراز تر ہوتی جارہی تھی لیکن مولانا آزاد جیسا قلم کا جادوگر اور کردار عمل کا رسیا اپنی دلچسپیوں کا سامان اسی بنجر علاقہ سے فراہم کرلیتا ہے تذکرہ کی ترتیب کے ساتھ رانچی میں ۱۴/۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو انجمن اسلامیہ کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا، اس انجمن کی بنیاد اپنے دل ودماغ کی تسکین کے لئے آپ ہی نے ڈالی تھی، آپ نے وہاں کے باشندوں میں کردار وعمل کی روح پھونکنے کا ایک ذریعہ اختیار کیا تھا آپ کی ہدایات اور مشوروں پر اس کے پروگرام بنتے رہے، بعد میں مقامی باشندوں نے اسی انجمن کو آزاد کی یادگار کے طور پر ایک کالج کی شکل دیدی جو آج بھی رانچی میں مولانا آزاد کی نظر بندی کی یاد دلاتا ہے۔

قفس میں رہ کے بہار چمن کا نظارہ:

مولانا آزاد رانچی کی چھوٹی سی دنیا میں محصور ہیں اور ادھر ہندوستان کی سیاسی فضا میں امس بڑھتی جارہی ہے جس سے لوگ بے چین ہوکر نئی آب وہوا کی تلاش میں دیوانہ وار سڑکوں پر آجاتے ہیں، خلافت کمیٹی بنجاتی ہے، جمعیۃ علماء ہند وجود میں آجاتی ہے، گانگریس پر بتدریج آزادی پسندوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہے، گاندھی جی افریقہ کی سرزمین سے ہندستان واپس آچکے ہیں، ہندو قوم تو اب تک ان کی قدر شناس نہ ہوسکی تھی لیکن مسلمانوں نے انہیں سر اور آنکھوں پر بٹھایا، خلافت فنڈ سے گاندھی جی کے دورے کرائے جارہے ہیں، مولانا محمد علی کے اخبار کا مریڈ کا لب ولہجہ شدت اختیار کرتا جارہا ہے، بلکہ کبھی کبھی آگ اگلنے لگتا ہے، حسرت موہانی انتہا پسندوں کے امام ہوتے جارہے ہیں اور ملک میں سیاسی بیداری عام ہوتی جارہی ہے لیکن مولانا آزاد اپنی چھوٹی سی دنیا سے جھانک کران حالات کو دیکھتے ہیں، دل تڑپتا ہے کہ آگے بڑھ کر لشکر سیاست کے اس ہراول دستے کو صحیح رخ پر لگادیں، نظر بندی

کے آلام ومصائب کے باوجود ذہن ودماغ نے جو لائحہ عمل مرتب کیا ہے اسکے مطابق ملک کی رہنمائی کا آغاز کریں لیکن نظر بندی کے کانٹے دار تاروں کی باڑھ کو چھلانگ لگا کر پار کرنے کی کوئی شکل نہیں اس لئے خاموش تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں۔

زندانِ رانچی سے رہائی:

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ مولانا آزاد کی رانچی کی نظر بندی ختم کی جاتی ہے اور چار سال کی گھٹن والی زندگی سے نجات حاصل ہوتی ہے، آپ سیدھے دہلی پہنچ جاتے ہیں اور حکیم اجمل صاحب کے مکان پر گاندھی جی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور پہلی ملاقات میں چوٹی کے ان دونوں لیڈروں کو مولانا آزاد مشورہ دیتے ہیں کہ فوراً وائسرائے سے ایک موقر وفد مل کر مسائل کو ان کے سامنے رکھے اور اس کے بعد ایک متعینہ لائحہ عمل پر کام کا آغاز کر دیا جائے، چنانچہ ۱۹؍جنوری ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وفد وائسرائے سے ملتا ہے، اس وفد میں چوٹی کے زعماء شامل ہوتے ہیں اور ۲۰؍جنوری کو کانگریس اور لیگ کا جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ہوتا ہے جس میں مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، لوکمانیہ تلک، مسٹر محمد علی، شوکت علی، گاندھی جی اور حسرت ہوہانی جیسے اکابر شریک اجلاس ہوتے ہیں، خطبہ صدارت کا لب ولہجہ اتنا گرم تھا کہ حکومت اس کو برداشت نہ کر سکی اور فوراً ضبط کر لیا گیا لیکن اجلاس نے حکومت سے عدم تشدد کی جنگ کا آغاز ترک موالات کے اسلحہ سے کرنے پر پوری سنجیدگی سے غور کیا، لیکن کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوسکا۔

اعلانِ جنگ کر دیا گیا:

مولانا آزاد نے ۲۹؍فروری ۱۹۲۰ء کو صوبائی پیمانے پر دہلی میں ایک اجلاس بلایا جس میں گاندھی جی نے اپنے ذہن ومزاج کے برعکس ایک گرم تقریر کی اور کہا کہ اب عرضداشتوں وفود کی خوشامدانہ ملاقاتوں کا زمانہ گذر گیا، اب راست اقدام کا وقت

آ گیا ہے ہمیں چاہئے کہ حکومت کے تمام خطابات ترک کردیں، نوکریاں چھوڑ دیں اور ترک موالات پر مضبوطی سے عمل شروع کردیں، بغیر ان ہتھیاروں کے آزادی کی لڑائی جیتی نہیں جاسکتی، گاندھی جی کا یہ پیغام بانگ جرس بن گیا اور کارواں کے آگے بڑھنے کا اعلان کردیا مسلمانوں کا سب سے محترم طبقہ علماء کا تھا وہ ابتدا ہی سے برطانوی اقتدار کو برداشت نہیں کررہے تھے اور آزادی کی تلاش میں ساری دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے اور کفن بردوش جنگ آزادی کے مختلف محاذوں پر صف بستہ تھے انہوں نے کانگریس کے اس فیصلہ کے بعد حکومت برطانیہ سے کسی طرح کے تعاون کو حرام قرار دیا اور پانچ سو سے زائد علماء کے دستخطوں سے ایک فتویٰ شائع کیا گیا، جس میں کہا گیا کہ سرکاری کونسلوں کا ممبر ہونا، عدالتوں میں وکالت کرنا، سرکاری ونیم سرکاری مدرسوں، اسکولوں، کالجوں، میں پڑھانا، اعزازی عہدے اور سرکاری خطابات رکھنا ناجائز ہے، باخصوص برطانوی حکومت کی تمام نوکریاں جن سے حکومت کو طاقت ملتی ہے وہ سب حرام ہیں، خاص طور سے پولیس اور فوج کی نوکری کرنا حرام ہے اور سخت گناہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے بھائیوں پر گولیاں چلاتے ہیں۔

یہ فتویٰ بڑے سائز میں طبع کراکے تمام شہروں اور قصبوں میں پہنچا دیا گیا، اس فتویٰ نے پورے ملک میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف نفرت اور غم وغصہ کی آگ دہکادی اور ہندوستان کی سیاست میں ایک بھونچال آگیا اور اسی تاریخ سے عوام وخواص نے اس پر عمل کرکے یہ ثابت کردیا کہ مسلمان آزادی کی تلاش میں کہاں تک جاسکتا ہے۔

مولانا آزاد کو امام الہند کا خطاب:

ترکِ موالات کی تحریک بتدریج آگے بڑھ رہی تھی، اسی زمانہ میں تحریک ریشمی رومال کے قائدین شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ۸/جون ۱۹۲۰ء کو ممبئی کے انڈیا گیٹ پر مالٹا کی قید سے رہائی پاکر اترے اور جب ہندوستان میں امام الہند کی تجویز پیش کرکے شیخ الہند سے اس اہم منصب کو قبول کرنے

کی درخواست کی گئی تو شیخ الہند نے فرمایا کہ موجودہ حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ اس عظیم منصب کا اور کوئی حقدار نہیں ہے، اگر چہ باقاعدہ اس منصب کا اعلان نہیں کیا گیا لیکن شیخ الہند کی زبان سے نکلی ہوئی بات ملک میں پھیل گئی اور اکثر اخبارات ورسائل مولانا آزاد کے نام کے ساتھ امام الہند لکھنے لگے۔

انگریزی حکومت سے عدم تعاون کی پہلی نشانی:

مولانا آزاد اور گاندھی جی نے مل کر کانگریس کے اجلاس میں تحریکِ خلافت کے ساتھ ہمدردی وتعاون کی تجویز پاس کرائی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ہندوستان گیر دورہ کیا، اس دورے میں حکومت سے عدم تعاون کے جذبے کو آتش سیال بنادیا گیا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڈھ میں شیخ الہند کی صدارت میں جلسہ ہوتا ہے، مولانا آزاد کی انقلاب آفریں تقریر ہوتی ہے اور فوراً فیصلہ کرلیا جاتا ہے کہ ایک نیشنل مسلم یونورسٹی قائم کی جائے، فیصلہ اور عمل دونوں ساتھ ساتھ وجود میں آتے ہیں اسی دن اس قومی یونیورسٹی کا یوم تاسیس منایا گیا جس کا مادی وجود دہلی میں ظہور پذیر ہوا اور حسب تجویز مولانا آزاد اس نئی قومی مسلم یونیورسٹی کا نام جامعہ ملیہ رکھا گیا، اسی طرح کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے مقابلہ میں جامعہ اسلامیہ قائم کیا گیا کیونکہ مدرسہ عالیہ میں اگر چہ مشرقی علوم پڑھائے جاتے تھے لیکن سارا دردبست حکومت کے ہاتھوں میں تھا، مولانا آزاد کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا اور ایک آزاد ادارہ مشرقی علوم کے لئے قائم کیا جس کے پہلے شیخ الحدیث ہندوعرب کے شیخ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ہوئے۔

وہ بھی کیا دن تھے؟

گاندھی جی مولانا آزاد کے قائم کردہ اس مدرسہ کو دیکھنے کلکتہ گئے، ان سے طلبہ کا تعارف کراتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ اس وقت طلبہ کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جن کی نگاہیں آپ کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں، یہ وہ جماعت ہے

جس نے حکومت سے مقاطعہ کے پہلے دن یہ عہد کیا تو آج تک اس عہد پر پوری قوت کے ساتھ قائم ہے اس کے جواب میں گاندھی جی نے طلبہ سے جو خطاب کیا یہ چند جملے ہی ان کی بڑائی کے اظہار کے لئے کافی ہیں انہوں نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اس وقت اسلام خطرے میں ہے، خلافت اسلامیہ تباہ کردی گئی، مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کرلیا گیا، اور ہندوستان کی قومی خودمختاری کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں شکست دی گئی، آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمربستہ ہوں اور جو فرائض آپ کے ذمہ اسلام اور ہندوستان کے ہیں انہیں ادا کریں''

مولانا آزاد کو ۲۶ ؍دسمبر ۱۹۲۰ء کے کانگریس اجلاس کے بعد گرفتار کرلیا گیا اور ایک سال کی سزا دے کر علی پور جیل بھیج دیا گیا۔

حکومت کے بائیکاٹ کا اعلان چیلنج بن گیا:

یہ وہ دور ہے جب تحریک خلافت شباب پر تھی، عوامی سطح پر سیاسی بیداری تحریک خلافت ہی کا ثمرہ تھی، سیاسی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مسلمان سیاست کے زینہ سے بغاوت کے منبر پر کھڑا ہوکر برطانوی حکومت سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار ہے، انہیں حالات میں کراچی میں ۱۸ ؍جولائی ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کی صدارت میں خلافت کمیٹی کا آل انڈیا اجلاس ہوا، اس اجلاس کی سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ کسی بھی ایماندار مسلمان کا برٹش فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے، انگریزی حکومت کو کسی طرح کی مدد پہنچانا بدترین گناہ ہے، مسلمانوں کو انگریزی فوج سے علیحدہ ہوجانا چاہئے اس تجویز کے پیش کرنے والے اور تائید کرنے والوں مین مولانا حسین احمد مدنی مولانا نثار احمد پیر غلام مجدد شنکراچاریہ، مولانا محمد علی وغیرہ تھے، اسی دوران کیرالہ اور مالابار ہل کے موپلا کسانوں نے تحریک خلافت اور ترک خلافت اور ترک موالات کے فتویٰ کی تبلیغ میں سرکاری کچہریوں اور عمارتوں میں توڑ پھوڑ اور آتشزدگی شروع کردی، کراچی اجلاس کے بعد مولانا محمد علی کیرالہ جارہے تھے

کہ حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا مولانا مدنی کو دیوبند سے اور دوسرے لوگوں کو مختلف مقامات سے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا، گاندھی جی ترچنا پلی میں تھے خبر ملتے ہی انہوں نے کراچی کی تجویز کو ہر جگہ دہرانے کا اعلان کر دیا اور مولانا آزاد سے کہا کہ آپ فوراً کلکتہ چلے جائیں اور اس تجویز کو آگے بڑھائیں، مولانا حسین احمد مدنی مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، پیر غلام مجدد اور مولانا نثار احمد پر مقدمہ چلا کر دو سال کی سزائے سخت تجویز کر کے سابرمتی جیل بھیج دیا گیا، ترک موالات کی تحریک میں روح پھونکنے کے لئے مولانا آزاد نے ۲۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو ''پیغام'' نام سے اپنا اخبار نکالا، جس کے ایک شمارے میں انہوں نے کیا آخری منزل آ گئی؟ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے ملک کے باشندوں کو مشورہ دیا کہ جیل خانوں سے یہ گھبرائیں نہیں کیونکہ جنگ آزادی کا فیصلہ میدان جنگ میں نہیں جیل خانوں میں ہوگا، موجودہ جدو جہد کی آخری منزل جیل خانہ ہے، اس کے دوسرے ہی مہینے مولانا آزاد کو پھر گرفتار کر لیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا، لیکن جلد ہی حکومت کا نشہ اترنے لگا اور اس نے پنڈت مدن موہن ملویہ کو بلا کر حکومت اور کانگریس میں مصالحت کرانے کے لئے مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی سے گفتگو کرنے کی بات کی، مالویہ جی پہلے مولانا آزاد سے جیل میں ملے، مولانا آزاد نے ان کو جواب دیا کہ جب تک پوری ورکنگ کمیٹی کی رہائی کی بات نہیں ہوگی تب تک میری رہائی کے کوئی معنی نہیں، پھر مالویہ جی وائسرائے سے ملے تو وائسرائے نے گاندھی جی سے ملنے کے لئے کہا، گاندھی جی نے مالویہ جی سے کہا کہ مولانا آزاد کی رائے اور فیصلہ حق بجانب ہے، اسی کے ساتھ ساتھ علی برادران کی بھی رہائی ضروری ہے، ان شرائط کو دیکھ کر وائسرائے نے براہِ راست گاندھی جی سے بات کرنا ضروری سمجھا، پھر گاندھی جی لارڈ ہارڈنگ وائسرائے سے ملے، اور سب کی رہائی ایک ساتھ عمل میں آئی، مولانا آزاد تو جیل سے رہا ہوتے ہی سیدھے لاہور چلے گئے جہاں ان کو جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنی تھی جو ۱۸ر نومبر ۱۹۲۱ء کو ہو رہا تھا۔

پرنس آف ویلز کی آمد:

اسی نومبر میں شہزادہ برطانیہ پرنس آف ویلز ہندوستان آیا مگر ناراض ہندستان اس کے شایانِ شان استقبال کے لئے کسی طرح راضی نہیں ہوا، کچھ زرخرید اور حکومت کے کاسہ لیس استقبال کے جلوس میں شریک ہوئے، جذباتی سیاسی ورکر اس جلوس پر ٹوٹ پڑے، بلوہ ہوگیا، پچاس آدمی مارے گئے، چار سو کے قریب زخمی ہوئے اس میں ایک چوتھائی کانگریس کے وَرکر تھے، حکومت نے کانگریس والینٹر کور کو خلافِ قانون قرار دے دیا، بے تحاشا گرفتاریاں شروع ہوگئیں، جواہر لال نہرو بھی اس زد میں آگئے، کیونکہ ہڑتال کرانے والوں میں یہ پیش پیش تھے، حکومت نے اپنی انتہائی برہمی کے اظہار کیلئے پنجاب، یوپی، بنگال، بہار ممبئی میں جلسے جلوس پر پابندی لگا دی۔

مولانا آزاد کی گرفتاری کی افواہ گرم تھی کیونکہ جب شہزادہ کلکتہ آیا تو عوام نے اتنا سخت بائیکاٹ کیا کہ کلکتہ جیسا مردم خیز گنجان شہر سائیں سائیں کر رہا تھا، ایک تنفس بھی سڑک پر نظر نہیں آرہا تھا، حکومت ہند کی سخت توہین ہوئی کہ شہزادے کے شایانِ شان خیر مقدم نہ کرا سکی، اس لئے مولانا آزاد کو یقین تھا کہ میری گرفتاری صبح و شام میں ہونے والی ہے کیونکہ تمام لیڈران جو ان کے ساتھ شریک کار تھے سب جیلوں میں خیمہ لگا چکے تھے، ۷/دسمبر ۱۹۲۱ء کو قابل وثوق ذرائع سے گرفتاری کی تصدیق ہوگئی، انہیں دنوں بدایوں میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ہو رہا تھا مولانا آزاد کو اس میں شریک ہونا تھا لیکن آپ نے قصداً بدایوں کا سفر نہیں کیا اس وقت تک بنگال میں ایک ہزار والنٹیر گرفتار ہو چکے تھے ۹/دسمبر ۱۹۲۱ء کو شب میں مسٹر کرن شنکر کے مکان پر ایک خفیہ میٹنگ میں مولانا آزاد شریک تھے، ۱۰/دسمبر کو دن میں چار بجے پولیس افسر مولانا آزاد کی قیام گاہ پر پہنچا اور مولانا آزاد گرفتار کر لئے گئے، اسی دن سی آر داس بھی گرفتار کئے گئے، گرفتاری کے دوسرے دن ایک زبردست جلسہ عام ہوا جس میں مولانا ظفر علی خاں نے ایک آتش بار تقریر کی، نتیجہ ظاہر تھا، مولانا ظفر علی خاں گرفتار کر لئے گئے اور جیل بھیج دیئے گئے۔

پھول کانٹے بن گئے:

برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کی آگ اتنی تیزی سے پھیلتی جارہی تھی کہ پورا ملک جوالامکھی بن گیا مردوں نے اپنی فطری جرأت کا مظاہرہ کیا تو عورتوں نے بھی آگے بڑھ کر ثابت کر دیا کہ

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

پھول صرف چٹکیوں سے مسلا ہی نہیں جا سکتا کبھی اس کی نرم و نازک اور ملائم پتیاں نوکدار کانٹوں کی بھی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔

اسی مہینہ میں ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو احمد آباد میں کل ہند خواتین کانفرنس علی برادران کی والدہ بی اماں کی صدارت میں منعقد ہوئی اجلاس میں مسلمان اور ہندو خواتین دونوں دوش بدوش جنگ آزادی کی صف بندی کے لئے تیار ہوگئیں، اجلاس میں سرگرم حصہ لینے والیوں میں مسز کستور با گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، شریمتی چودھرائن، شریمتی انوسیابائی، شریمتی سرلا دیوی ہندو خواتین ہیں تو دوسری طرف محترمہ امجدی بیگم مولانا محمد علی، محترمہ شمس النساء بیگم ڈاکٹر انصاری، محترمہ حسرت موہانی، محترمہ بیگم خواجہ، محترمہ بیگم سیف الدین کچلو کے اسماء گرامی مسلمان عوتوں میں قابل ذکر ہیں، بی امان نے اپنا خطبۂ صدارت اس پیغام پر ختم کیا۔

> ''اچھی اور پیاری بہنو! قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ، جب ہمارے ملک کے مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو ہم کو ہی آزادی کا پرچم لہرانا ہوگا، اٹھو اور اٹھ کر حکومت کو بتادو کہ ہم ہر قیمت پر آزادی کے اس پرچم کو لہرا کر رہیں گے چاہے اس راہ میں ہمارے جسم کے ٹکڑے ہی ٹکڑے کیوں نہ ہو جائیں''

مولانا آزاد کا عدالتی بیان:

مولانا آزاد کی سزا کا فیصلہ کئی پیشیوں کے باوجود ابھی ناتمام ہی رہا، تیسرے

مہینے میں انہوں نے اپنا تاریخی بیان دیا جو ''قول فیصل'' کے نام سے پورے ملک کو معلوم ہے جو جرأتِ حق، اخلاصِ عمل اور اپنے اصولوں کی صداقت پر ایمان کامل کا مظہر ہے اور اللہ کے مقدس بندوں کے سینوں میں اتر گیا تو دوسری طرف ادب وانشاء کا ایسا درشا ہوا رہے کہ اسے اردو ادب کا گل سرسبد تصور کیا گیا، عدالت نے ایک سال کی سزا تجویز کی اور علی پور بھیج دیا۔

مولانا آزاد کا مدبرانہ فیصلہ:

خلافت تحریک کی حمایت کر کے کانگریس مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی، اور اس تنظیم پر ترقی پسندوں اور آزادی کے دیوانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا لیکن کانگریس کی تاریخ میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ معلوم ہوتا تھا یہ تنظیم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی طاقت کھو دیگی اور حکومت کی نگاہوں میں اپنا بھرم کھودے گی۔

۲۶/دسمبر ۱۹۲۲ء کو کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا، مولانا آزاد ان دنوں جیل میں تھے اجلاس میں اس مسئلہ پر اختلاف رائے ہو گیا کہ دستور ساز اسمبلی میں حصہ لیا جائے یا نہ لیا جائے ایک گروپ کہتا تھا کہ اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لیا جائے اس گروپ میں سی آر داس موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں وغیرہ تھے انہوں نے کانگریس سے الگ ہو کر ایک سوراج پارٹی بنالی، یہ واقعہ پہلی جنوری کا ہے ۲۶/جنوری کو مولانا آزاد علی پور جیل سے رہا ہوئے اسی دن جواہر لال نہرو بھی جیل سے چھوٹے، فوراً ہی گیا میں کانگریس کا اجلاس بلایا گیا اور دونوں گروپ کو دعوت نامے بھیجے گئے، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ مولانا آزاد کے ہاتھ میں دے دیا تھا تمام چوٹی کے لیڈر جہاں دیدہ اور معمر رہنما دو جذباتی گروپ میں منقسم تھے ان دونوں کو ایک رشتہ میں پرونے کے لئے ایک ۳۵ سالہ کم عمر لیڈر مولانا آزاد کو منتخب کیا گیا یہ ان کے تدبر اور فراست کا امتحان تھا اور آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے، آپ نے اس کا حل یہ نکالا کہ جو گروپ کونسلوں کے الیکشن میں حصہ لینا چاہتا ہے، وہ تین ماہ کے اندر ۳۰/اپریل تک

۲۵/لاکھ روپیہ چندہ اور پچاس ہزار والنٹیر بھرتی کریں اور کسی طرح مخالفانہ پروپیگنڈہ نہ کریں اور یہ بھی ہدایت کی کہ جو لوگ الیکشن میں حصہ لینے کے مخالف ہیں وہ کسی طرح کی مخالفت ہرگز نہ کریں، نہ ان کاموں میں رکاوٹ ڈالیں گے،، اس فیصلہ کو دونوں فریق نے تسلیم کرلیا اور کانگریس انتشار سے محفوظ رہ گئی۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

کانگریس مین جب سے مولانا آزاد نے شرکت کی اس وقت سے لیکر ابتک ہندو مسلم اتحاد مثالی تھا، جلوسوں میں نعرۂ تکبیر پر ہندو بھی بلند آہنگی سے اللہ اکبر کہتے تھے، حکومت کے لئے یہ اتحاد سب سے بڑا دشمن تھا انہوں نے ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' پر عمل کرتے ہوئے ۲۳/فروری ۱۹۲۳ء کو کانگریس کے ایک ہندو لیڈر جو ہندوؤں میں بہت مقبول تھے سوامی شردھا نند کو جیل سے رہا کردیا، واسرائے نے ان کو وائسرائے ہاؤس بلایا اور رازدارانہ گفتگو کی، وائسرائے نے سوامی جی سے کہا کہ:

''اس ملک میں جو باشندے مسلمان ہوگئے ہیں یا کئے جارہے ہیں انہیں پھر سے ہند بنالیا جائے اور ہندو مذہبی تنظیم فوجی اور جنگی بنیادوں پر کی جائے ورنہ مسلمان اس ملک میں برتری حاصل کرلیں گے، اور سیاسی قیادت انہیں کے ہاتھوں میں رہے گی''

یہ لارڈ ہارڈنگ کے جادو کے بول تھے جو پھونک مارتے ہی آدمی کو بھیڑیا اور چیتا بنادے بنگال کا جادو بھی انگریزوں کے جادو کا پانی بھرے، ایک انگریز ہندوستان کے ۳۵ کروڑ انسانوں کو چند لمحوں میں انسانیت سے حیوانیت کی نچلی سطح پر اتاردے یہ کوئی سوچ سکتا ہے؟ لیکن ہوا یہی، دنیا نے دیکھ لیا کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو مسلم دو مختلف مذہب رکھتے ہوئے ایک ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے دونوں حقیقی بھائی ہیں چند لمحوں میں وہ اس طرح دست وگریبان ہوئے جیسے اجنبی کتوں سے کتے لڑا کرتے ہیں، ایک شور ایک ہنگامۂ چیخ پکار سے فضا گونج اٹھتی ہے۔

سوامی جی نے سنگھٹن کی تحریک چلا کر پورے ہندوستان میں ہندو مسلم بلووں کا آغاز کر دیا، ہر طرف آتش فساد بھڑکا دی اور چند ہی دنوں میں ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوکر رہ گیا، مولانا آزاد نے دلی صدمے کے ساتھ اس حادثے کو دیکھا اور فوراً آگرہ روانہ ہوگئے جہاں سوامی شردھانند خاندانی مسلمانوں کو طاقت اور لالچ سے ہندو بنانے کی جدو جہد میں مصروف تھے مولانا آزاد جب آگرہ پہنچے تو سوامی شردھانند اسی دن آگرہ سے رخصت ہوگئے تاکہ مولانا آزاد کا سامنا نہ کرنا پڑے، مولانا آزاد نے بہ اصرار ان کو روکنا چاہا لیکن وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، کانگریس کے دوسرے عہدے دار جو شدھی اور سنگھٹن میں پیش پیش تھے ان کو بلا کر فہمائش کی ان لیڈروں نے اعتراف کیا کہ اس فضا کو بدلنے کی ہماری طرف سے کوئی کوشش نہیں ہوئی، مولانا آزاد نے سمجھ لیا کہ آدمی کے پاگل بن جانے کے لئے کسی لمبی مدت کی ضرورت نہیں چند لمحوں میں دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ہوسکتی ہے، اس پاگل پن کا اثر برسوں تک رہا اور ہندو مسلم منافرت اور ایک دوسرے سے دوری بڑھتی چلی گئی۔

مولانا آزاد صدر کانگریس:

۲۶ رستمبر ۱۹۲۳ء کو دہلی میں آل انڈیا کانگریس کا خاص اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا اس وقت مولانا آزاد کی عمر صرف ۳۵ سال تھی کانگریس ہائی کمان میں اتنا کم عمر اور کوئی دوسرا رکن نہیں تھا اس کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر انصاری تھے، اس اجلاس کے شرکاء میں مشہور لوگوں میں سی آر داس، حکیم اجمل خاں، موتی لال نہرو، راج گوپال اچاریہ، سردار پٹیل، راجندر پرشاد اور مولانا حسین احمد مدنی تھے، مولانا آزاد نے اپنے خطبے میں انہیں حالات پر اظہار افسوس کیا جو شدھی سنگھٹن نے پیدا کر دیئے تھے۔

الہلال کا دوبارہ اجرا اور ضبطی:

الہلال ۱۹۱۲ء سے نکل کر گنتی کے چند سالوں میں بند ہو گیا تھا، حکومت کی

دارو گیر نے اس کی زندگی مختصر کر دی مولانا آزاد نے ۲/ جون ۱۹۲۷ء میں از سر نو الہلال کا ڈکلریشن داخل کر کے اخبار جاری کیا لیکن اس کی عمر پھر مختصر نکلی ۹/ دسمبر ۱۹۲۷ء کے شمارے پر حکومت نے اس کی تجہیز و تکفین کی آخری کارروائی انجام دے دی، پورے چھ مہینے برطانوی حکومت مولانا آزاد کے شعلہ بار قلم کی آتش افشانیوں کو ضبط و تحمل سے برداشت کرتی رہی لیکن اس کی آتش نوائی اور شعلہ باری میں کوئی فرق نہیں آیا اس لئے اس کی تاب ضبط جواب دے گئی اور الہلال ہمیشہ کے لئے ضبط کرلیا، مولانا آزاد نے جوابی وار کرنا چاہا اور ''الاقدام'' کے نام سے دوسرے اخبار کا ڈکلریشن داخل کر دیا لیکن اب حکومت ان کے قلم کو آزاد رکھنا برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لئے ''الاقدام'' کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

مجلس احرار اسلام اور مولانا آزاد:

مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری اور بعض دوسرے اکابر لیڈروں کے مشورہ سے مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے صدر چودھری افضل حق بنائے گئے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجلس احرار کے متفقہ لیڈر قرار پائے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دوسرے سرگرم لیڈروں نے مجلس احرار میں شمولیت اختیار کی یہ تنظیم مسلمانوں میں گرم سیاست کی روح پھونکنے والی ثابت ہوئی، اس جماعت کے لیڈروں ورکروں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں بڑے بڑے مصائب جھیلے، اس کے کارکنوں میں فوجی اسپرٹ تھی اپنے تیز و تند بیانات اور حکومت پر کڑی نکتہ چینیوں کی وجہ سے اس کے اکثر لیڈروں کی جیل کی زندگی باہر کی زندگی سے زیادہ تھی، اس کے رضا کاروں کی وردی سرخ تھی، مجلس احرار کا جلوس سرخ پوشوں کا جلوس ہو جاتا تھا۔

نیشنلسٹ مسلم پارٹی:

مسلمانوں کی انفرادیت کو قائم رکھنے اور آزادی کی راہ میں جدو جہد کو امتیازی

حیثیت سے بروئے کار لانے کے لئے اور ہندو مسلم اتحاد اوران میں یک جہتی پیدا کرنے اور ہر ایک کو دوسرے سے قریب لانے کی نیت سے جولائی ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر انصاری نے آل انڈیا نیشنلسٹ مسلم پارٹی قائم کی اس کے سرگرم لیڈروں میں مولانا آزاد، مسٹر رفیع الدین قدوائی، خواجہ عبدالمجید، (علی گڈھ) تصدق احمد شیروانی (علی گڈھ) آصف علی بیرسٹر (دہلی) خان عبدالغفار خان (پشاور) سید محمود (بہار) جیسے اکابر تھے۔

نہرو رپورٹ دریا برد کردی گئی:

دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، اورڈاکٹر انصاری، اس کانفرنس کی روح رواں تھے، نہرو رپورٹ جو موتی لال نہرو نے کانگریس کے ایماء سے مرتب کی تھی جس پر مختلف پارٹیوں نے اپنا ردعمل ظاہر کیا تھا، اس کے بہت سے اصولوں سے مسلمانوں کو شکایت تھی، مختلف مسلم سیاسی پارٹیوں نے اس کی مخالفت کی تھی، کانگریس کے کئی مسلم لیڈران اس رپورٹ کی وجہ سے کانگریس چھوڑ چکے تھے اس لئے اس سالانہ اجلاس میں نہرو رپورٹ پھر زیر بحث آئی تو پوری سجکٹ کمیٹی نے اس رپورٹ کو رد کردیا، اور طے کیا گیا کہ اب ہمارا نصب العین مکمل آزادی ہوگا اس سے کم پر ہم راضی نہیں، آزادئ کامل کو اپنا نصب العین تسلیم کرتے ہی نہرو رپورٹ از خود کالعدم ہوگئی، بہت سے اختلافات کو جنم دیکر آخر کار نہرو رپورٹ دریائے رادی میں غرق کردی گئی اور ملک کو اس سے نجات ملی۔

مولانا آزاد صدر کانگریس:

جواہر لال نہرو کی مدت صدارت ختم ہوگئی تو مہاتما گاندھی کی تجویز اور دوسرے رہنماؤں کی حمایت سے مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا یہ انتخاب

اتفاق رائے سے عمل مین آیا، مولانا آزاد نے نئی ورکنگ کمیٹی ترتیب دی اور اس کا پہلا اجلاس بلایا اور تجویز پاس کی کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرکے ہر کانگریس ممبر مستعفی ہو جائے اور اگر کوئی ممبر استعفاء نہ دے تو عوام اس کو استعفاء دینے پر مجبور کر دیں، چنانچہ اس تجویز پر فوراً عمل ہوا ۷۲ ممبران نے اپنا استعفاء اسی دن گورنر کو پیش کر دیا۔

دوسری اہم ترین تجویز یہ پاس ہوئی کہ آزادی کے جذبے کو عام کرنے کے لئے پورے ملک میں ایک مقررہ تاریخ پر یوم آزادی منایا جائے اور گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ پوری پبلیسٹی کرکے عوام کو آزادی کی اہمیت وضرورت سمجھائی جائے اور جگہ جگہ جلسے کرکے یہ عہد کیا جائے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے ہم اسے لے کر رہیں گے اور عوام سے ہاتھ اٹھوا کر اس عہد کی تصدیق وتائید کرائی جائے ۲۶/جنوری تاریخ اس کے لئے مقرر کر دی گئی۔

تجویزوں کی تائید میں پورے ملک کے کانگریسی ممبران کونسل کی تعداد ۱۷۲ تھی فروری ۱۹۳۰ء میں سب کے سب مستعفی ہو گئے۔

نمک ستیہ گرہ:

مولانا آزاد کی صدارت کے دور میں گورنمنٹ نے نمک پر ٹیکس لگا دیا جس کے جواب میں ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا گیا، گاندھی جی نے سابرمتی آشرم سے یہ تحریک شروع کر دی ۱۴۱ میل چل کر ڈانڈی کے مقام پر پہنچے اور اپنے ہاتھ سے نمک بنانا شروع کر دیا، مولانا نے فوراً میٹنگ بلا کر گاندھی جی کے پروگرام کی تائید میں رزولیشن پاس کرایا اور تمام صوبائی کمیٹیوں کو سرکلر بھیج دیا کہ ستیہ گرہ میں حصہ لینے کے لئے فوراً تیار ہو جائیں، حکومت سے یہ لڑائی پورے ملک میں پھیلا دی گئی حکومت یہ دیکھ کر بوکھلا گئی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا، گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے اور کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا اور ہر طرف کانگریسی ورکروں کی گرفتاری شروع ہو گئی، ممبئی میں ''جوہو'' کے مقام پر جہاں جہاں نمک بنایا جاتا ہے

وہاں نمک کے اجارہ داروں کے خلاف مظاہرہ کا سلسلہ جاری تھا مشہور لوگوں میں عابد علی جعفری علی یوسف مہر علی مسٹر صادق مسٹر نریمان وغیرہ گرفتار کر لئے گئے، گرفتاری کے خلاف ممبئی میں زبردست ہڑتال ہوئی، جلوس نکلے، شولا پور میں کچھ اسٹیشنوں میں آگ لگا دی گئی پولیس نے گولیاں چلائیں ۱۲۵ افراد مارے گئے ہزاروں زخمی ہوئے، اس محاذ پر ابھی گھمسان کی جنگ جاری ہی تھی کہ مولانا آزاد نے جیل سے باہر ارکان عاملہ کی میٹنگ طلب کر کے فوج اور پولیس کے خلاف ایک تجویز پاس کر دی، تجویز حکومت نے ضبط کر لی، ۱۹۳۰ء کے آخر تک پنجاب، بنگال، بہار، اڑیسہ، آسام، اندھرا پردیش، مہاراشٹر، ممبئی وغیرہ صوبوں میں کانگریس کے فیصلے کے مطابق کسانوں نے لگان اور مال گذاری دینی بند کر دی، آسام میں مولانا عبدالحمید بھاشانی نے ایک زبردست کسان تنظیم بنائی جو بنگال کے میمن سنگھ ضلع تک پھیل گئی تھی، حکومت نے کسانوں کو بے تحاشا گرفتار کرنا شروع کر دیا۔

پشاور میں خان عبدالغفار خان کے سرخ پوش خدائی خدمت گاروں پر حکومت نے مظالم توڑے کیونکہ وہ نمک ستیہ گرہ میں پر جوش حصہ لے رہے تھے، پشاور میں گرفتاریاں شروع ہوئیں تو شہریوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، اس موقعہ پر قبائلیوں اور سرکاری آدمیوں میں جھڑپ ہوگئی، دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں جس سے بغاوت پھوٹ پڑی، برطانوی بکتر بند گاڑیوں کے آگے شہریوں نے روک لگا دی تو افسروں نے فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا لیکن سپاہیوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا، حکم عدولی کرنے والے سب سپاہیوں کو گرفتار کر کے چودہ چودہ سال کی سزائیں دی گئیں، فوج کی گولیوں سے اس موقعہ پر سات سو بہادر پٹھانوں نے جام شہادت نوش کیا اور قصہ خوانی بازار انسانی خون سے لالہ زار ہو گیا۔

مولانا آزاد کی گرفتاری:

مولانا آزاد حالات کی رفتار پر بحیثیت صدر کانگریس گہری نگاہ رکھے ہوئے

تھے اپنی گرفتاری سے قبل آپ نے کانگریس کے نظام کو ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل کر دیا تھا، یہی ڈکٹیٹر تحریک کو آگے بڑھانے کا ذمہ دار ہوگا ڈکٹیٹروں کی پوری فہرست تیار کر دی گئی تا کہ ایک ڈکٹیٹر کی گرفتاری کے بعد از خود دوسرا ڈکٹیٹر زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لے ۱۶ نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا آزاد نے میرٹھ میں ستیہ گرہ کر کے ایک سخت تقریر کی، حکومت نے گرفتاری میں تاخیر نہیں کی جلسہ گاہ سے گرفتار کر کے ڈیڑھ سال کے لئے سیدھے جیل بھیج دیا، اپنی گرفتاری سے قبل آپ نے ڈاکٹر انصاری کو اپنا قائم مقام بنا دیا تھا اس لئے حکومت نے مولانا آزاد کی گرفتاری کے بعد ڈاکٹر انصاری کو گرفتار کر لیا اور جیل بھیج دیا ڈاکٹر انصاری نے اپنا قائم مقام بھی نامزد کر دیا تھا اس نے کام سنبھالا وہ بھی گرفتار ہوا اس طرح تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے کانگریس کے رہنما گرفتار ہوتے چلے گئے۔

مولانا حسرت موہانی کی گرفتاری:

مولانا حسرت موہانی نے دلچسپ ستیہ گرہ کیا، جوں ہی پولیس گرفتاری کے لئے آگے بڑھی مولانا حسرت موہانی پارک کی زمین پر لیٹ گئے اور دونوں مٹھیوں سے گھاس کو مضبوطی سے پکڑ لیا، پولیس کے کئی جوانوں نے پوری قوت سے اٹھایا تو ان کا بدن لاش کی طرح اکڑا ہوا تھا، اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتے جا رہے تھے، چونکہ حسرت ناک میں بولتے تھے، اس لئے ان کا ’’انقلاب زندہ باد‘‘ بڑا مزیدار ہوتا تھا، کہنے کو یہ واقعہ دلچسپی اور دل لگی کا واقعہ ہے، لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا حسرت کی وہ شخصیت ہے جس نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا، ان کی شاعرانہ عظمت مستقبل میں ریسرچ اور تحقیق کا موضوع بننے والی تھی، مسلمانوں میں انتہائی عظمت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن اتنی بڑی شخصیت بھی آزادی کی راہ میں سنگ سر راہ کی طرح ٹھوکروں میں اپنی ذات کو ڈال دیتی ہے، اپنی شخصیت کو فنا کر دینا، اپنی عظمت کو لات مار دینا، پولیس کے مظالم اور قید

وبند کو تفریح بنا دینا اسی جذبۂ خلوص کا مظاہرہ تھا جو ہندوستان کی آزادی کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں تھا۔

مولانا محمد علی کی جرأتِ اظہار:

کانگریس کی تحریک اور ستیہ گرہ کی وجہ سے پورا ملک کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا حکومت نے تنگ آ کر اس آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی اور لندن میں گول میز کانفرنس بلائی، نومبر ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی رہنما لندن پہنچے، حاکم محکوم، بادشاہ ورعایا، آقا وغلام ایک سطح پر بیٹھے پھر بھی نادر شاہ نادر شاہ ہے اور ہٹلر ہٹلر، اس لئے لب ولہجہ کا فرق، آمرانہ حکم اور عاجزانہ گذارش کی سرحدیں مقرر ہیں لیکن ان سرحدوں کو پار کرنے والی ایک شخصیت اس کانفرنس میں نکلی اور وہ ہندوستان کے ہر دل عزیز لیڈر مولانا محمد علی تھے انہوں نے اس کانفرنس میں جو کچھ کہا وہ جنگ آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا گیا، کیونکہ یہ جرأتِ اظہار نہ پہلے پائی گئی اور نہ بعد میں، مولانا محمد علی نے برطانوی حکومت کے نادر شاہوں اور ہٹلروں سے ان کے محل میں ان کے گھر پر خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''اے سفید فام آقاؤ! سن لو، آج تم کو میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ دینا ہوگا اور اگر تم مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے تو میں تم سے اسی لندن میں تین گز زمین اپنی قبر کے لئے لے کر رہوں گا''

بابِ اجابت پر کھڑا فرشتہ مولانا محمد علی کے ان الفاظ کو نوٹ کر رہا تھا اس لئے جب آزادی کا پروانہ مولانا محمد علی کے ہاتھوں میں نہیں دیا گیا تو قدرت نے ایک قبر کی زمین لندن میں مولانا محمد علی جوہر کے لئے مہیا کر دی، کیونکہ ابھی ان کی تقریر کے یہ الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور لندن میں تین گز زمین پانے کا استحقاق ثابت کر دیا لیکن وہ غلام ملک کے نمائندہ بن کر گئے تھے اور اپنے ملک کو آزادی کا پر عظمت مقام نہیں دلا سکے تھے جو

ان کا نصب العین تھا اس لئے اپنے مطلق العنان آقاؤں کی ناپاک سرزمین میں دفن ہونے کو ان کی غیرت نے قبول نہ کیا اور خدا نے بھی اس کی لاج رکھی، قدرت نے ان کی عظمت واحترام میں اضافہ کے لئے اپنی مقدس سرزمین بیت المقدس کی آغوش میں سپرد کرنے کا فیصلہ کرلیا اور مفتی فلسطین کی درخواست پر مولانا محمد علی جوہر کی لاش بذریعہ ہوائی جہاز بیت المقدس پہنچی اور وہیں آزادئ ہند کا بطل جلیل ہمیشہ کے لئے محو خواب ہے، مولانا محمد علی جوہر بہت پہلے کہہ چکے تھے۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

گول میز کانفرنس ایک ڈرامہ بن کر رہ گئی، ہندوستانی رہنماؤں کا قافلہ بے لیل مرام غلام آباد ہندوستان واپس لوٹ آیا۔

مولانا آزاد کی رہائی اور گرفتاری:

کانپور میں ۱۳۶ ستیہ گرہیوں پر جیل میں بڑے مظالم ہوئے جب اس کی خبر جیل سے باہر آئی تو اس پر بیچینی کا اظہار کیا گیا، کاندھی جی وائسرائے سے ملے اس کے نتیجہ میں ایک لائحہ عمل طے ہوا جس سے سیاسی معاملات میں کچھ پیشرفت ہوئی، اسی معاہدہ کے تحت مولانا آزاد میرٹھ جیل سے رہا ہوکر باہر آئے دس مہینے بعد حکومت نے ایک آرڈی نینس جاری کر کے کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا اور پھر ممتاز لیڈروں کی گرفتاری شروع ہوگئی، پہلے گاندھی جی گرفتار ہوئے پھر کانگریس کے ڈکٹیٹر راجندر پرشاد ہوئے اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر انصاری تھے پٹنہ میں راج گوپال آچاریہ گرفتار کر لئے گئے، راجندر پرشاد اپنے گھر پر پولیس کے نرغے میں آگئے اسی دن متھرا بابو اور اچاریہ کر پلانی بھی پکڑے گئے، اسی مہینہ میں مولانا آزاد کو دہلی میں گرفتار کر کے ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔

الیکشن:

۲۷/اکتوبر ۱۹۳۴ء کو گاندھی جی نے کانگریس سے باضابطہ وابستگی کو ختم کر دیا

جب کہ مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر انصاری گووند بلبھ پنت کی منشا کے خلاف یہ فیصلہ تھا، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اس کو تسلیم کرلیا، سردار پٹیل کی منشا یہی تھی، البتہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاندھی جی کے لئے کانگریس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا ان کا مقام ومنصب علیٰ حالہ باقی رہے گا۔

حکومت کی طرف سے جو تجویز اصلاحات نافذ ہوئی اس کے تحت ملک میں الیکشن ناگزیر تھا تاکہ صوبائی اسمبلیوں کو اختیارات سپرد کئے جائیں اور محدود اختیارات کی وزارتیں صوبوں میں کام کرنے لگیں، اس لئے سال کے آخر میں ماہ نومبر ۱۹۳۴ء میں پورے ملک میں مرکزی اسمبلی کا الیکشن ہوا، پنجاب کو چھوڑ کر کانگریس اور نیشنلسٹوں کو ہر جگہ بڑی اکثریت حاصل رہی، جتنے سرمایہ دار تھے وہ الیکشن میں سو فیصد ناکام رہے مرکزی اسمبلی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی منتخب ہوئے جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

ابتداء ۱۹۳۷ء میں صوبائی وزارتیں بن گئیں بیشتر صوبوں میں اختیارات کانگریس کے ہاتھ میں آ گئے، ممبئ میں مخلوط حکومت بنی تھی لیکن چند مہینوں میں ٹوٹ گئی تو مولانا آزاد کو دعوت دی گئی کہ وہ وزارت کی تشکیل کریں آپ نے مسٹر کھیر کو وزیر اعلیٰ اور کنہیا لال منشی کو ہوم منسٹر اور محمد یٰسین نوری اور دوسرے کانگریسی وزراء کو قلمدانِ وزارت تقسیم کر کے کانگریس کو ممبئ کی حکومت تفویض کر دی اس چند صوبوں کے علاوہ پورے ملک میں کانگریسی وزارتیں کام کرنے لگیں۔

دوسری جنگ عظیم اور کانگریس کا نقطۂ نگاہ:

مئی ۱۹۳۹ء کو کانگریس نے کلکتہ سے اپنی مجلس عاملہ کی فہرست جاری کی جس میں مندرجہ ذیل نام تھے، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان، سروجنی نائیڈو، سردار پٹیل، شنکر راؤ دیو، جمنا لال بجاج، جے رام دولت رام جے پی کرپلانی، ڈاکٹر سیتارمیہ، بھولا بھائی ڈیسائی، ہری کرشن مہتاب ڈاکٹر بدھن چندر رائے، ڈاکٹر برفلا

چندر گھوش یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر کے دوسری جنگ عظیم کا آغاز کرایا جو پانچ سال تک آگ اور خون کی بارش کرتی رہی، جنگ کا اعلان ہوتے ہی اسی ہفتہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مولانا آزاد کی مرتب کردہ پالیسی بیان پر دستخط کر کے اخبارات کو اشاعت کے لئے دے دیا، بیان یہ تھا:

''ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی میں بھی اسی طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پہلی لڑائی میں دیکھا تھا، ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لئے ہرگز برطانوی سامراج کو فتح مند دیکھنا نہیں چاہتے، ہم ایسا کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں ہماری راہ بالکل اس کے مخالف سمت میں جارہی ہے''

اس پالیسی کے بعد حکومت سے تعاون اور جنگ میں اس کی مدد کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس لئے ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کر دیا کہ وزارتیں مستعفی ہو جائیں دوسرے دن تمام وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔

مولانا صدر کانگریس بنائے گئے:

جنگ کی وجہ سے ملک کی سیاست انتہائی پیچیدہ ہوتی جارہی تھی کانگریس کے لئے ایک ایسے مدبر صدر کی ضرورت تھی جس کے تدبر و فراست کی قسم کھائی جا سکے، اور کانگریس کی پالیسی کو حالات کے خارزار سے صحیح سلامت گزار سکے، گاندھی جی کی نگاہ مولانا آزاد پر پڑی، پوری ورکنگ کمیٹی نے اس کی تائید کر دی اس لئے مولانا آزاد دوسری بار پھر آل انڈیا کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے اور اپنی صدارت کے پہلے ہی دن آپ نے اپنی پالیسی کا اعلان کر دیا۔

کانگریس نہیں چاہتی کہ برطانیہ کی حمایت میں ہندوستانی سپاہیوں کو لڑایا اور کٹایا جائے، اس جنگ میں ہمارا کوئی تعاون حکومت کے لئے نہیں ہے۔

جنگ جاری ہوئے گیارہ ماہ ہو چکے ہیں حکومت کو روپے کی بھی ضرورت ہے اور فوج بھرتی کے لئے ہندوستانی جوانوں کی بھی کانگریس ان دونوں سے پہلے ہی دن

سے انکار کرتی رہی اور دونوں کاموں میں مخالفت کرتی رہی، راجندر پرشاد اور ان کے کئی ساتھی جنگ کے سلسلہ میں کانگریس کی پالیسی سے انحراف کرتے ہوئے ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو گئے، وہ حکومت کو تعاون دینا چاہتے تھے، مگر کچھ شرطوں کے ساتھ مولانا آزاد نے ان لوگوں کو لکھا کہ آپ لوگوں کی شرطیں مجھے منظور ہیں مگر برطانوی حکومت نے جو رویہ اختیار کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس کی امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی شرط کو تسلیم کرے گی، جب تک انگریزوں کا رویہ نہ بدلے جنگ میں شرکت محض ایک علمی مسئلہ رہے گی، مولانا آزاد کے اس بجچے تلے جواب سے مطمئن ہو کر ممبران ورکنگ کمیٹی نے اپنے استعفیٰ واپس لے لئے۔

مولانا آزاد نے صدر ہونے کے بعد سابقہ ورکنگ کمیٹی میں جو دس ارکان پر مشتمل تھی اس کو بڑھا کر ۱۵ کرنا چاہا اور انہوں نے نئے ارکان میں جواہر لال نہرو، سی راج گوپال اچاریہ، ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی کے ناموں کا اضافہ کیا اور ایک سیٹ خالی چھوڑ دی تاکہ اُسے مناسب شخصیت سے پُر کیا جاسکے۔

حکومت کی مدد کسی قیمت پر نہیں:

یورپ میں جنگ کی آگ پھیلتی جا رہی تھی حکومت ہندوستان کے تعاون کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہی تھی لیکن آزادی کے دیوانے کچھ اور ہی رویہ اختیار کئے ہوئے تھے، آزادی کی طلبگار جماعتوں کے کڑے رویہ کی وجہ سے صورت حال کشیدہ تر ہوتی جا رہی تھی، حکومت نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے مسٹر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا، وہ آئے، صدر کانگریس مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی سے ملے، پھر دوسرے ہوا خواہان حکومت برطانیہ سے ملاقاتیں کیں، درجہ نو آبادیات اور دوسرے مسائل کی بحث اس طرح چھڑ گئی کہ کرپس بددل ہو کر انگلینڈ واپس ہو گئے اور مقصد سفر ناکام رہا۔

☆☆☆

رام گڈھ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس:

۲۴؍دسمبر ۱۹۴۰ء کو رام گڈھ کے مظہر الحق میں کانگریس کا سالانہ جلسۂ عام مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا، اس اجلاس میں مولانا آزاد نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ بڑا ہی بصیرت افروز ہے اور مولانا آزاد کے نکتہ چینوں کے لئے ایک بہترین سبق، آپ نے بات وہاں سے شروع کی کہ اب ہمارا کاروان منزل کے بہت قریب آگیا ہے، ہماری منزل ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، کل جو موہوم تھی آج وہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آرہی ہے، ہندوستان اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے، مختلف نسل و مذہب کے ماننے والوں کا مشترکہ ہندوستان آزادی حاصل کر کے رہے گا، پھر آپ نے انتہائی جرأت ایمانی کے ساتھ فرمایا۔

> ”میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو سال کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس سے چھوٹے سے چھوٹا حصہ ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا“

مولانا آزاد نے اپنا پر جوش سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے، ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت وعظمت کو پرعزم الفاظ میں بیان کیا۔

''تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں، اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسے ہندو مذہب کا ہے، اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آرہا ہے، جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں'' (خطبات آزادی مرتبہ اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۶۰۷-۶۰۸)

مولانا آزاد پھر زندانِ حکومت میں:

اجلاس کے بعد انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام بنایا گیا، سب سے پہلے ونوبا بھاوے نے ستیہ گرہ کی اور گرفتاری دی اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے ستیہ گرہ کی اور گرفتار ہوئے اسی طرح ترتیب سے باری باری گرفتاری دینے کا پروگرام طے تھا، مولانا آزاد کو ابھی اس پروگرام پر عمل نہیں کرنا تھا کیونکہ وہ صدر کانگریس تھے، ان کے ذمہ تحریک کو آگے بڑھانا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا، پنجاب میں ستیہ گرہ کی تنظیم کے بعد لاہور سے واپس ہوئے اور جب آپ الٰہ آباد اسٹیشن پہنچے اور ٹرین سے اتر کر ریفریشمنٹ روم میں جانے کی غرض سے جارہے تھے کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے آگے بڑھ کر تسلیمات پیش کی اور وارنٹ گرفتاری سامنے رکھا، مولانا آزاد نے مسکرا کر کہا کہ آپ نے مجھے یہ امتیاز دیکر جو عزت افزائی کی ہے اس کا بہت بہت شکریہ، ابھی تو ضابطہ کے مطابق انفرادی ستیہ گرہ کرنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گرفتاری ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء کی ایک تقریر کی بنا پر ہوئی عدالت نے ۱۸ مہینے کی سزا دیکر نینی جیل بھیج دیا، کچھ دنوں بعد گاندھی جی الٰہ آباد آئے تو مولانا آزاد سے ملنے جیل

گئے، دونوں میں کھل کر بات ہوئی اس ملاقات کے بعد گاندھی جی نے بیان میں جب یہ کہا کہ عدم تشدد میرا ذاتی عقیدہ ہے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو اپنا فیصلہ خود کرنے کا اختیار ہے، اس بیان سے عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ مولانا آزاد نے گاندھی جی سے قصداً یہ بیان اس لئے دلایا ہے کہ مستقبل میں وہ کانگریس کو عدم تشدد کا پابند رکھنا نہیں چاہتے، اور بوقت ضرورت تشدد پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ لوگوں کے یہ خیالات ایک دم بے بنیاد بھی نہیں تھے۔

۱۹۴۱ء کے بالکل آخر میں جاپان ہندوستان کی سرحدی ریاستوں پر حملہ آور ہو گیا اور ہندوستان کے پھاٹک پر وہ دستک دے رہا تھا اس صورتِ حال کو دیکھ کر چینی وزیر اعظم چیانگ کائی شیک نے حکومتِ برطانیہ کو مشورہ دیا کہ ہندوستانی لیڈروں کی جائز شکایتوں کو جلد سے جلد دور کر کے ان کا تعاون حاصل کرنا چاہئے، اسی مشورہ کی بنیاد پر مولانا آزاد اور دوسرے بڑے رہنما جیلوں سے رہا کردئے گئے، مولانا آزاد نے رہا ہوتے ہی باردولی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور صلاح ومشورہ کے بعد اپنا بیان جاری کردیا کہ:

"اگر حکومت اپنا رویہ بدل دے تو کانگریس بھی اپنا رویہ بدلنے پر تیار ہے"

وَردھا میں کانگریس کا اجلاس:

جنوری ۱۹۴۲ء میں واردھا میں کانگریس کا سالانہ اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا، آپ نے خطبۂ صدارت میں کانگریس کی پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"۱۶ ماہ قبل ہم جہاں تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں تاہم کانگریس کے بدلنے کا دارومدار برطانوی حکومت کے رویہ پر ہے، ہمارے اور گاندھی جی کے درمیان اختلاف ہے، گاندھی جی جنگ کے سایہ میں آزادی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اور ہم خواہ جنگ ہو خواہ امن کے ذریعہ آزادی کو خوش آمدید کہنے کو تیار

ہیں، نیز ہم اس وقت تک جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے جب تک ہمیں مکمل آزادی نہ مل جائے گاندھی جی عدم تشدد کے نظریہ سے اس مسئلہ خاص کو دیکھتے ہیں اور ہم عدم تشدد کو سیاسی بنیادوں پر اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک ہمارا مقصد حاصل نہ ہو جائے۔"

مولانا آزاد نے کانگریس کے تذبذب کو دور کر دیا کہ عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں کہ اسے ہر قیمت پر اور ہر مرحلہ پر رہنما بنایا جائے، حالات اس عقیدہ کی شکل بدل بھی سکتے ہیں، مولانا آزاد اسی نقطۂ نگاہ سے سوچتے تھے پھر بعد میں پوری ورکنگ کمیٹی سوائے گاندھی جی کے مولانا آزاد سے متفق ہوگئی اور بعد میں اسی نقطۂ نگاہ سے عمل بھی کیا گیا جیسا کہ بعد کی تاریخ بتاتی ہے۔

کانگریس کے اس فیصلہ کو عام کرنے کے لئے مولانا آزاد نے مختلف اہم مرکزی مقامات پر جا کر تقریریں کیں اور بیانات دیئے اور عوام کو بتایا کہ اگر آزادی ہمارے نرم رویہ سے نہیں مل سکتی تو ہمارا رویہ بدل بھی سکتا ہے، پورے ملک کے عوام کو اس جدو جہد کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

چیانگ کائی شیک وزیر اعظم چین کو حکومت برطانیہ نے ہندوستانی لیڈروں کو رام کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا، مولانا آزاد نے ملاقات کے وقت واضح لفظوں میں کہا کہ ہم اپنے فیصلہ سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہیں بغیر مکمل آزادی کی گارنٹی کے ہم کوئی تعاون حکومت کو نہیں دے سکتے، چیانگ کائی شیک نے واپس جا کر حکومت سے اپیل کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ہندوستان کو سیاسی آزادی دے کر اختیارات سونپ دینا چاہئے، لیکن انگریزی حکومت کی گردن تنی ہی رہی ذرا بھی جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوئی، جنگ کی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ چند ہفتوں میں جاپان کا ہندوستان پر قبضہ ہو جائے گا اسی دوران ہندوستان کے مشہور لیڈر سبھاش چندر بوس خفیہ طور پر جرمنی پہنچ گئے اور برلن ریڈیو سے ہندوستان کی آزادی کا پیغام بھیجا انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی لیڈروں کا ہٹلر سے قریبی تعلق ہوتا جا رہا ہے اس

نے سمجھ لیا کہ اب صورت حال قابو سے باہر ہوتی جارہی ہے اگر جلد ہی ہندوستان کو اس جنگ میں شامل نہیں کیا گیا تو نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا ہے اس لئے مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے سیاسی بحران کو دور کرنے کے لئے جلد ہی ایک مشن ہندوستان جارہا ہے تاکہ وہاں کے عوام کو مطمئن کرسکے، مارچ میں مسٹر کرپس ہندوستان آگئے تو وائسرائے نے بذریعہ تار مولانا آزاد کو دہلی مدعو کیا ۲۹/مارچ کو آزاد سے کرپس کی ملاقات ہوئی، مشن نے مولانا آزاد سے کہا کہ اب جو نئی کونسل بنے گی اس کے سب ممبر ہندوستانی ہوں گے اور انگریز افسر سکریٹری کی حیثیت سے کام کریں گے لیکن سردست نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

مولانا آزاد نے اس کا جواب ورکنگ کمیٹی کے فیصلے تک کے لئے ملتوی کردیا آپ نے فوراً ورکنگ کمیٹی طلب کرلی اور تمام ارکان کو اپنا یہ فیصلہ سنادیا کہ کوئی بھی فرد ذاتی حیثیت سے مشن سے ملاقات نہیں کرے گا، ورکنگ کمیٹی نے مولانا آزاد سے اتفاق کرتے ہوئے کلی اختیارات آپ کے سپرد کردیئے کہ وہ تنہا مشن سے گفتگو کریں اور کمیٹی کو اس سے آگاہ کرتے رہیں۔

اپنی صف کو درست اور مستحکم کرنے کے بعد ہر شب مولانا آزاد اور مشن کے درمیان گفتگو ہوتی رہی اور دوسرے دن ورکنگ کمیٹی تفصیلات پر غور کرتی اور فیصلہ صادر کرتی، کرپس مشن نے کانگریس کے علاوہ اور دوسرے لوگوں سے بھی ملاقاتیں کیں، اپریل تک صورت حال اطمینان بخش رہی گفتگو کامیابی کے ساتھ چلتی رہی، دونوں فریق ایک متفقہ لائحہ عمل پر آنے کی کوشش کرتے رہے، اس لئے کانگریس نے واردھا میں ایک فارمولہ مرتب کرکے مولانا آزاد کو سپرد کیا جو برطانوی حکومت سے مفاہمت پر مبنی تھا، دوسرے دن مولانا آزاد نے یہ فارمولا مشن کے سامنے رکھا تو کرپس نے جواب دیا کہ فارمولہ پر عمل جنگ ختم ہونے کے بعد کیا جائیگا، مولانا آزاد نے کہا کہ ایسے اہم معاملے کو عارضی اور اجمالی خاکہ پیش کردیا جائے تاکہ ہندوستان کو یقین ہوجائے کہ حکومت واقعی کچھ کرنا چاہتی ہے لیکن مشن اس پر راضی نہیں ہوا اس

لئے مولانا آزاد نے کرپس تجویز کو مسترد کر دیا اور کہا کہ کرپس تجویز میں ابتداءً بہت خوش رنگ تصویریں کھینچی گئیں لیکن بعد میں وہ تصویر دھندلی ہوتی چلی گئی اس لئے ہم اس کورد کرنے پر مجبور ہو گئے کرپس مشن ناکامیوں کا بوجھ لے کر انگلینڈ واپس چلا گیا، عالمی جنگ کی حالت اور بھی خطرناک ہوگئی، مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی کا اب ایک ہی نعرہ تھا ''کرو یا مرو'' پھر کچھ ہی دنوں میں اس نعرے کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دینے لگی۔

تشدد یا عدم تشدد؟

انگریزی نمائندے شرافت اور سنجیدہ گفتگو کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکے حاکمانہ غرور ہندوستان کی رائے عامہ کے سامنے جھکنے سے ان کو روکتا رہا وہ نہایت بے نیازی کے ساتھ ہندوستانی لیڈروں کی تجاویز کو ٹھکرا کر لندن لوٹتے رہے، اس صورتِ حال سے تنگ آ کر مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی نے ''کوئٹ انڈیا'' کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا چونکہ اس تجویز کے تحت عدم تشدد اور اہنسا کی پابندی مشکوک تھی اس لئے گاندھی جی اس سے کلی طور پر مطمئن نہیں تھے لیکن مولانا آزاد اس تحریک کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے رہے، وہ سوچتے تھے کہ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو آزادی بہت دور چلی جائے گی اس لئے فوراً انگریزوں سے یہ کہہ دینا چاہئے کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیں، بحیثیت صدر کانگریس انہوں نے یہ طے کیا کہ ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو مکمل ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ممبئی بلا کر اس کے سامنے تجویز رکھ دی جائے، آپ نے پریس نمائندوں کے سامنے واضح الفاظ میں کہا کہ:

> ''ملک کے دفاع کے لئے انتظامات موثر اور عمدہ طریقے پر اس وقت تک نہیں کئے جا سکتے جب تک عوام کو پوری طرح یہ نہ سمجھا دیا جائے کہ ان کی قسمت بھی اس جنگ میں شامل ہے اس لئے کانگریس آزادی کے فوراً اعلان اور طاقت کو ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سپرد کئے جانے کے علاوہ اور کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو سکتی''

کوئٹ انڈیا تجویز:

کرپس مشن کے ناکام ہونے کے بعد ہی کانگریس کی طرف سے ''کرو یا مرو'' کا نعرہ عوام کو دیا گیا پھر مولانا آزاد اور گاندھی جی نے ایک گفتگو میں ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کی تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا کہ آخری تدبیر کے طور پر تجویز ورکنگ کمیٹی میں ضرور آئے۔

ان چار مہینوں میں مولانا آزاد نے ملک کے مختلف خطوں میں اپنے مستقبل کے پروگرام سے ملک کو آگاہ کیا حکومت بھی جان گئی کہ ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں کرسیِ صدارت سے کون سی تجویز آنے والی ہے، ملک کا مزاج اس تحریک کی حمایت کے لئے تیار ہو چکا تھا، مستقبل کے طوفان میں چھلانگ لگانے کے لئے آزادی کے دیوانے تیار کھڑے تھے صرف حکم کا انتظار تھا، اسی تجویز کے باقاعدہ اعلان کے لئے ۸/اگست کا یہ اجلاس ممبئی میں بلایا گیا تھا تاکہ حکومت سے کھل کر کہہ دیا جائے،

ہرچہ بادا باد کشتی در آب اند اختیم

۸/اگست ۱۹۴۲ء کو ممبئی میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں شروع ہوا، ساری دنیا کی خبر رساں ایجنسیوں کے رپورٹر موجود تھے، مولانا آزاد نے ایک بہت ہی پر جوش تقریر کر کے ''کوئٹ انڈیا'' ہندوستان چھوڑو کی تجویز پیش کردی، گاندھی جی نے کہا کہ مولانا آزاد کی تجویز سے حرف بحرف متفق ہوں اور اس تجویز کی تائید کرتا ہوں پھر پنڈت جواہر لال نہرو کی تائیدی تقریر نے دلوں میں آگ لگادی، نصف شب تک اجلاس کی کاروائی چلتی رہی اور پھر کل کے لئے ملتوی کردی گئی۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی گرفتار:

ایوانِ حکومت تک جب یہ تجویز پہنچی تو اس نے بلا تاخیر کانگریس کو خلافِ قانون

جماعت قرار دے کر تمام لیڈروں کی گرفتاری کا فیصلہ کرلیا ابھی صبح بھی نہیں ہوئی کہ رات کے پچھلے پہر سارے ارکان ورکنگ کمیٹی گرفتار کر کے ممبئی ریلوے اسٹیشن پہنچا دیئے گئے اور ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیئے گئے، مہاتما گاندھی، کستوربا گاندھی، سروجنی نائیڈو، اور مہادیو ڈیسائی کو پونہ میں اتار کر آغاخان کے محل میں قید کر دیا گیا، مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سید محمود وغیرہ کو احمد نگر قلعہ میں رکھا گیا، شنکر راؤ گووند ولبھ پنت، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ، اچاریہ کرپلانی، جاکٹر پرفلا گھوش وغیرہ کو نامعلوم جگہ بھیج دیا گیا، دی دی گری، نیلم سنجیوا ریڈی، مسٹر کامراج کو امروتی جیل میں ڈالا گیا، اس طرح پوری ورکنگ کمیٹی کو مختلف جیلوں میں ڈالا گیا اور اس خبر پر اتنا کڑا اسنسر بٹھا دیا گیا کہ عوام کو پتہ ہی نہیں چلا کہ ہمارے لیڈروں کو زمین کھا گئی یا آسمان اچک لے گیا، دوسری آزادی پسند جماعتوں میں جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام، کے تمام رہنماؤں کی فہرست گورنمنٹ کے پاس تیار رکھی تھی اسی شب میں گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

گرفتاری کا ردِ عمل:

۹/اگست کو جب ہندوستانی عوام نے اپنے لیڈروں کی گرفتاری کی خبر سنی تو غم وغصہ سے بھر گئے اور ہندوستان کے طول وعرض میں دیوانوں کی طرح ریلوے اسٹیشنوں، ڈاک خانوں، تھانوں، کچہریوں پر ٹوٹ پڑے، توڑ پھوڑ، آتش زدگی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا، بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے، ریلوے لائنیں اکھاڑ دی گئیں، کوتوالیوں میں آگ لگا دی گئی، دو ہفتے تک حکومت کا نظام معطل ہو کر رہ گیا، پورے ملک میں ایسا زلزلہ آ گیا کہ ایوان حکومت کے کنگرے تھرتھرانے لگے، بنیادیں ہل گئیں، انگریزوں کے چہروں پر حاکمانہ غرور کے بجائے خوف زدگی کی ہوائیاں اڑنے لگیں، حکومت نے سمجھ لیا کہ ہمارے اقتدار کے آخری ایام ہیں، لیکن آہستہ آہستہ حکومت نے تشدد کا جواب تشدد سے دینا شروع کیا، لاکھوں افراد گرفتار ہوئے،

کوڑوں کی سزائیں دی گئیں، تین تین چار چار سالوں کے لئے جیلوں میں چکی پیسنے کے لئے بھیج دیا، آبادی کی آبادی کو آگ لگا کر پھونک دیا گیا، نادرشاہی جاگ پڑی، اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں اپنے مظالم کی آخری قسط پوری کردی۔

قلعہ احمد نگر میں مولانا آزاد:

احمد نگر قلعہ میں جہاں مولانا آزاد قید کئے گئے تھے ان کی مصروفیات کیا تھیں، اس کا صرف اتنا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ قلعہ سے رہائی پا کر باہر آئے تو ان کے ہاتھوں میں ''غبار خاطر'' کا مسودہ تھا جوادبی خطوط نویسی کا ایک شاہکار ہے، لیکن اس قید کے زمانے میں آپ کو کئی حادثات سے دوچار ہونا پڑا، سب سے بڑا صدمہ ان کو اس خبر سے پہنچا کہ ان کی محبوب ترین بیوی زلیخا بیگم، ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئیں اس آخری وقت میں مولانا آزاد ان کے سرہانے نہیں تھے ان کی وفات سے ان کے دل ودماغ کو کتنی چوٹ پہنچی؟ ''غبار خاطر'' کا ایک خط اس کی ترجمانی کرتا ہے، دوسرا صدمہ آپ کو اپنی ہمشیرہ آبرو بیگم کے انتقال کا اٹھانا پڑا جو انہیں ایام میں بھوپال میں راہی ملک بقا ہوئی تھیں، لیکن ان حوادثات کے موقعہ پر انہوں نے بے مثال صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا تا کہ ان کی خودداری اورانا مجروح نہ ہوسکے انہوں نے ملک کی رہنمائی کی جو عظیم ذمہ داری اپنے سر لی تھی اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سینے میں فولاد کا جگر ہو۔

مولانا آزاد بانکوڑہ جیل میں:

قلعہ احمد نگر کے قیام کے آخری دنوں میں مولانا آزاد اور سید محمود کو ٹیکہ لگائے جانے کی وجہ سے بخار ہوگیا، اور کئی دنوں تک مسلسل رہا، اس موقعہ پر پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد کی ایک مخلص تیماردار کی طرح خدمت کی اور ہمہ وقت آپ کی ضروریات کا لحاظ رکھا اور ہمہ وقت آپ کے پاس حاضر رہے، اپریل میں احمد نگر کے

کلکٹر نے حکومت کو رپورٹ دی کہ شدید گرمی کی وجہ سے مولانا آزاد کا قلعہ میں رکھنا مناسب نہیں ہے اس رپورٹ پر حکومت نے مولانا آزاد کو بانکوڑہ جیل منتقل کر دیا اور مسٹر آصف علی کو بٹالہ جیل میں، مسٹر آصف علی کی علالت دراز ہوتی چلی گئی تو حکومت نے ان کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا اس سے پہلے سید محمود بھی رہا ہو چکے تھے۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی:

اب ۱۹۴۵ء کا زمانہ آچکا ہے، چھ سال پہلے جس جنگ کی ابتداء ہوئی تھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو تباہ و برباد کر کے ختم ہوگئی، یورپ سے جنگ کے بادل چھٹ چکے تھے، برطانیہ، امریکہ، اور فرانس جنگ جیت چکے تھے، اٹلی، جرمنی اور جاپان تینوں غلام بنائے جا چکے تھے اور اتحادیوں کے رحم وکرم پر تھے، برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل جو جنگ کے اس پانچ سالہ دور میں وزیر اعظم رہے جنگ جیتنے کے بعد انگلینڈ کے عوام نے ان کو وزارت سے محروم کر دیا، الیکشن میں لیبر پارٹی جیت گئی اور اب مسٹر ایٹلی وزیر اعظم بن گئے جو مزدوروں کے نمائندہ تھے، مولانا آزاد نے جیل ہی سے ان کی کامیابی پر ان کو مبارکباد کا تار دے دیا، اس کے جواب میں مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے مولانا آزاد کو جوابی تار دیا اور ان کے شکریہ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہماری لیبر پارٹی ہندوستان کے لئے صحیح حل نکالنے کی مخلصانہ کوشش کرے گی۔

مولانا آزاد کی رہائی:

۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو حکومت نے صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کو بانکوڑہ جیل سے رہا کر دیا، آپ نے رہا ہوتے ہی اپنے سکریٹری اجمل خان کو تار دیا کہ وہ فوراً کلکتہ پہنچ کر مجھ سے ملاقات کریں آپ بانکوڑہ سے براہ راست کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے، کیونکہ رفیقہ حیات کی دائمی جدائی کا غم تازہ ہو گیا تھا، اس کی وفاؤں کا اب صرف یہی صلہ باقی رہ گیا تھا کہ پہلی فرصت میں اس کی قبر پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھ لی جائے

تا کہ اس فرض کی ادائیگی کے بعد قومی خدمت کی ذمہ داری کو یکسو ہو کر پورا کیا جائے۔

کلکتہ اسٹیشن پر کانگریس کی صدر مسز لبانیہ پر بھارتہ کی قیادت میں ہزاروں کی بھیڑ نے مولانا آزاد کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بینڈ باجے کے ساتھ جلوس روانہ ہوا تو مولانا آزاد نے کہا کہ میرے بہت سے ساتھی ابھی جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بند ہیں ہمیں خوشی منانے کا ابھی کوئی حق نہیں ہے اگر آپ لوگ بینڈ باجے کو بند کر دیں تو بہتر ہوگا، بینڈ فوراً بند کر دیا گیا اس کی جگہ عوام کے فلک شگاف نعروں نے لے لی، انقلاب زندہ باد، مولانا آزاد زندہ باد کے پر شور نعروں نے کلکتہ کی فضا میں جوش و جذبات کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔

بیوی کی قبر پر:

کلکتہ پہنچ کر سب سے پہلے آپ رفیقۂ حیات زلیخا بیگم کی قبر پر گئے، قبر دیکھتے ہی رقت طاری ہوگئی، آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں، فاتحہ پڑھی اور دل کے درد کو سمیٹے ہوئے سیدھے گھر آئے عبدالرزاق ملیح آبادی کا بیان ہے:

> ''مولانا کے گھر پہنچتے ہی میں حاضر ہو گیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا''

وائسرائے کا تار:

۱۶؍جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے بذریعہ تار مولانا آزاد کو مطلع کیا کہ ۲۵؍جون کو شملہ میں گول میز کانفرنس بلا رہا ہوں اور میں آپ کو اس میں شرکت کی دعوت دے رہا ہوں مولانا آزاد نے جواب دیا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان جیلوں سے باہر آجائیں تو مجھے یہ دعوت منظور ہے ورنہ نہیں، وائسرائے نے اسی دن تمام ارکان کو مختلف جیلوں سے رہائی کا حکم بھیج دیا۔

مولانا آزاد ابھی ابھی جیل سے تین سال کے بعد باہر آئے ہیں سیاسی حالات

پر ایک دھندسی چھائی ہوئی ہے، عوام اور حکومت کے رجحان اور جذبات سے پوری واقفیت نہیں ہے کہ ارونا آصف علی جو ابھی تک روپوشی کی زندگی گذار رہی تھیں، آئیں اور انہوں نے مولانا آزاد کو تفصیل سے حالات بتائے حکومت اور عوامی تنظیموں کے جذبات سے آگاہ کیا اور پھر انڈر گراؤنڈ ہو گئیں، دو ہفتے کے بعد مولانا آزاد نے ذاتی طور پر وائسرائے سے کہہ کر ان کی گرفتاری کو منسوخ کرایا تب وہ منظر عام پر آئیں۔

مولانا آزاد کانگریس کے واحد نمائندہ:

مولانا آزاد نے ایک ذہین فرد کو اپنا سکریٹری بنالینا ضروری سمجھا، آپ کی نظر انتخاب بنگال قانون ساز اسمبلی کے ایک ممتاز رکن مسٹر ہمایوں کبیر پر پڑی، آپ نے ان کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ ۲۰/جون کو ممبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لئے ایجنڈہ جاری کر دیں، مولانا آزاد نے پہنچ کر ٹھیک وہیں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے گھر پر قیام کیا جہاں سے تین سال قبل گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر کے جیل خانے بھیجے گئے تھے، گاندھی جی برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے، ورکنگ کمیٹی میں وائسرائے کا ۲۵/جون کے لئے دعوت نامہ زیر بحث رہا، پوری ورکنگ کمیٹی نے مولانا آزاد کو اپنا واحد لیڈر تسلیم کر کے وائسرائے سے گفتگو کرنے کا مجاز بنا دیا، ضابطہ کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد آپ شملہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہو گئے اور شیوالے ہوٹل میں قیام کیا، وائسرائے نے اصرار کر کے ان کو وائسر یگل لاج میں اپنے قریب قیام کرنے کے لئے راضی کر لیا۔

شملہ کانفرنس:

وائسرائے نے مولانا آزاد سے پہلی ملاقات میں سرکاری تجویزوں کی وضاحت کی اور کہا کہ دورانِ جنگ کسی بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ہے لیکن ایگزیکیٹو کونسل کے تمام ممبر ہندوستانی ہوں گے اور وہی دستور بنانے کے مجاز ہوں گے، وائسرائے کونسل

کے فیصلہ کا پابند ہوگا اور اسی پر عمل کرے گا، جنگ کے مکمل اختتام پر آزادی کا مسئلہ حل کیا جائے گا بشرطیکہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو جائے، اس کے جواب میں مولانا آزاد نے کہا کہ یہ مفاہمت اس لئے نا قابل اعتبار ہے کہ مسلم لیگ کو حکومت کی حمایت حاصل ہے وائسرائے نے کہا کہ اگر موجودہ صورت حال میں مسلم لیگ کے لیڈر یہ گمان کریں گے تو وہ غلطی پر ہوں گے، حکومت قطعی غیر جانبدار رہے گی۔

دوسرے دن ۲۶/جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے آل پارٹیز کانفرنس بلائی جس میں کانگریس، مسلم لیگ، شیڈول کاسٹ کے صدر، سکھوں کے نمائندے، نیشنلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا، وائسرائے نے افتتاحی تقریر میں صورتحال پر روشنی ڈالی اور زیر بحث آنے والے مسائل سے شرکاء کانفرنس کو واقف کرایا، اس کے بعد ہر گروپ ہر پارٹی کے نمائندوں نے اپنی اپنی جماعتوں کے نقطۂ نگاہ کو کانفرنس میں پیش کیا، کانفرنس دن بھر چلتی رہی، کانفرنس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے اور بیچ کی کوئی راہ نہیں نکل سکی، اس لئے وائسرائے نے بادل ناخواستہ کانفرنس کو غیر معین وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا سفینہ ساحل کے قریب آکر پھر گرداب میں چلا گیا۔

الیکشن کی معرکہ آرائیاں:

برطانوی حکومت پر اب لیبر پارٹی کا قبضہ تھا، وزیر اعظم مسٹر ایٹلی ہندوستان کے معاملہ میں مخلص تھے وہ ہندوستان کے مسئلہ کا حل چاہتے تھے ان کے ایماء سے وائسرائے نے استصواب رائے کے لئے جنرل الیکشن کا اعلان کر دیا، مولانا آزاد نے وائسرائے کو لکھا کہ جب الیکشن کا فیصلہ کر لیا گیا تو وہ تمام لوگ جو جیلوں میں اب تک بند ہیں اگر وہ رہا نہ ہوئے تو اس کا ردِ عمل خراب ہوگا، اس لئے اگر الیکشن صحیح ڈھنگ سے کرانا ہے تو ان قیدیوں کو رہا کیا جانا ضروری ہے چنانچہ وائسرائے نے فوراً تمام قیدیوں کو رہائی کا حکم بھیج دیا اور سب کے سب جیلوں سے باہر آگئے، پورے ملک میں

الیکشن کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوگئیں، الیکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر تھا، ہندو ہندو کو ووٹ دے گا، اور مسلمان مسلمان کو، الیکشن میں کانگریس صد فی صد کامیاب ہوئی اس کے تمام امیدوار جیت گئے مسلم لیگ ۷۰ فیصد کامیاب ہوئی یہی استصواب رائے تقسیم ملک کی بنیاد ہے، اسی الیکشن کی بنار پر صوبوں میں حکومتیں بنیں مرکز میں مخلوط حکومت قائم ہوئی، کانگریس کی طرف سے مدعو جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ تھے مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خاں راجہ غضنفر علی اور سردار عبدالرب نشتر، ۲۱ رجنوری ۱۹۴۶ء کو مرکزی اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا اب اسمبلی کی کرسیوں پر وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو کل جیلوں میں چکیاں پیس رہے تھے ہال میں سفید گاندھی ٹوپیوں کی باڑھ آئی ہوئی تھی، لیکن آزادی کی یہ پہلی قسط تھی، مکمل آزادی ابھی دور کہیں تھی، اس منزل پر پہنچنے کے لئے لندن سے ایک وزارتی مشن آیا اس کے سامنے سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ پاکستان کا تھا جس کے تسلیم کئے بغیر مسلم لیگ کو راضی نہیں کیا جاسکتا تھا، کانگریس بالخصوص مولانا آزاد تقسیم ملک کو کئی حیثیتوں سے غلط سمجھتے تھے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے تو اس کو خودکشی سے تعبیر کرتے تھے وزارتی مشن سے گفتگو کے بعد آپ نے ایک اخباری بیان دیا جس میں آپ نے کہا۔

''تقسیم مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ مسائل کھڑا کردے گی، پاکستان کی اسکیم شکست کی علامت ہے، قومی وطن کا خیال اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی حیثیت قائم نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی نہیں کہ ایک کونے میں جو ان کے لئے مخصوص کردیا گیا ہو سمٹ کر بیٹھ جائیں، پاکستان کی مانگ بزدلی کی علامت ہے مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ ہے کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے وہ ہندستانی زندگی کا اتنا اہم عنصر ہیں کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن اثر ڈال سکتے ہیں، یاد رکھو کہ پاکستان کا نعرہ لگانے والوں کی ایک روز جب آنکھ کھلے گی تو دیکھیں گے کہ راتوں رات وہ اجنبی اور پردیسی بن گئے ہیں اور پردیسی حکومت کے رحم وکرم پر ہوں گے، جو خالص ہندو راج

ہوگا...... بعد کی تاریخ نے مولانا آزاد کی حرف بحرف تصدیق کردی کیا اب
بھی مولانا آزاد کی دور بینی پر تم کو شک ہے؟

مولانا آزاد کی صدارت کے سات سال:

کانگریس کی پوری تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ مولانا آزاد مسلسل سات سال تک کانگریس کے متفقہ طور پر صدر رہے جب کہ یہ پورا دور تدبر وفراست، ذہانت وفطانت کا امتحانی دور تھا، ملک میں نازک ترین اور اہم ترین مسائل اسی سات سالہ دور میں پیش آئے، دوسری جنگ عظیم اسی دور میں شروع ہوئی ۱۹۴۲ء کی طوفانی تحریک سے لیکر الیکشن کی معرکہ آرائیوں تک اور ۱۹۴۷ء کی اس سرحدی چوکی تک جہاں سے آزادی کی منزل کے نشانات کا آغاز ہوتا ہے، مولانا آزاد صدر کانگریس رہے، اس طرح جنگ آزادی کی رہنمائی کا جو اہم ترین دور تھا وہ مولانا آزاد کی ذہانت وفطانت کی وجہ سے بڑی کامرانی وسرفرازی سے گذر گیا، اس دور میں بہت سے نازک مرحلے آئے جب ورکنگ کمیٹی میں اختلاف رائے کا سخت ترین اندیشہ تھا لیکن ہر موڑ پر دانشمندی نے صحیح سمت کی رہنمائی کی اور کامیابی کے ساتھ ان خارداروادیوں سے آپ گذر گئے، اب آپ محسوس کرنے لگے تھے کہ مجھے صدارتی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جانا چاہئے اس لئے آپ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میری جگہ کانگریس کا صدر جواہر لال نہرو کو چن لیا جائے مگر مولانا آزاد کے اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لئے ورکنگ کمیٹی بروقت تیار نہیں ہوئی لیکن بعد میں مولانا آزاد کے فیصلہ کے سامنے کمیٹی کو جھکنا پڑا اور جواہر لال نہرو صدر منتخب کر لئے گئے۔

مولانا آزاد نے جس وقت مسند صدارت چھوڑی ہے اس وقت کاروان آزادی اپنی منزل کے ابتدائی زینوں تک آچکا تھا اب چند ہی زینوں کے بعد رختِ سفر اتار دینا تھا، تجربہ کے طور پر ایک عبوری حکومت تشکیل دی گئی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے وزراء شامل تھے، اہم ترین عہدوں پر دونوں قوموں کے لوگ سرفراز

تھے، یہ تجربہ ان لوگوں کی چشم بصیرت کھول دینے کے لئے کافی تھا جو تقسیم ملک پر بضد تھے لیکن اس سے سبق نہیں لیا گیا، وزارتی مشن کے آنے کے بعد تقسیم کا اصول تسلیم نہ کرنے پر جو قیامت خیز طوفان لیگ نے برپا کیا اس طوفان نے ان کو بھی تقسیم کے ہم نوا ہونے پر مجبور کردیا جو تقسیم کے سب سے بڑے دشمن تھے۔

مولانا آزاد کی بصیرت:

مولانا آزاد ابتدا ہی سے متحدہ ہندوستان کے حامی تھے، مسلمانوں کا مفاد اسی میں سمجھتے تھے، مستقبل میں ان کے امن وامان کی زندگی اور دین ومذہب اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کی ضمانت اس میں سمجھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ تقسیم سے مسلمانوں کا فائدہ کم اور نقصانات زیادہ ہیں، ان کو یقین تھا کہ اگر ہندوستان میں ہندو مسلم مشترکہ گورنمنٹ کا اصول طے کرلیا جاتا ہے تو مسلمان اپنی فطری ذہانت وفطانت کی وجہ سے شریک غالب کی حیثیت اختیار کر جائے گا اور اگر برابری کی سطح پر بھی رہا تو وہ جارحانہ تنگ نظری اور خونخوارنہ فرقہ واریت تو ہرگز نہ پیدا ہوگی جو ردعمل کے طور پر تقسیم کے دوسرے ہی دن ہندوقوم میں پیدا ہوگئی، مولانا آزاد بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ تقسیم کے بعد وہ مسلمان جو ہندوستان میں ہیں وہ عذاب کی دہکتی ہوئی بھٹی میں ہمیشہ جلتے بھنتے رہیں گے کیونکہ اب وہ شریک حکومت اور برابر کی حیثیت میں بھی نہ رہ جائیں گے بلکہ ایک اقلیت ایک محکوم ومظلوم طبقہ کا درجہ اختیار کر جائیں گے، جمہوریت کا نام رکھتے ہوئے بھی ہندوستان میں ایک فرقہ کی جابرانہ آمریت قائم ہوجائے گی، ایک فرقہ اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہے گا فیصلہ کرے گا، مسلمان اس میں دخل دینے کی بھی پوزیشن میں نہیں رہ جائے گا۔

یہ سوچ سوچ کران کی راتوں کی نیند اڑگئی، دردوکرب نے اس سیماب صفت انسان کو منجمد بنا دیا، اپنے دل کے درد کو پورے ملک کے مسلمانوں میں گھوم گھوم کر بانٹتے پھر رہے تھے لیکن بہت کم لوگ ان کے شریک ہوئے، ہندوستان کا دانشور طبقہ

جس کی نمائندگی علی گڈھ کر رہا تھا اس نے اپنی بصیرت و بصارت دونوں اس ماحول میں کھودی تھی، انہیں لوگوں سے سب سے زیادہ توقع تھی کہ سیاست کے رموز واسرار کو عام مسلمانوں سے زیارہ گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں گے، لیکن واقعہ اس کے برعکس نکلا، علی گڈھ کی سرزمین مولانا آزاد کے لئے سرزمین طائف بن گئی اور آپ کئی بار وہاں سے لہولہان واپس آئے، زہریلے تیروں کا نشانہ تو آزادی کے بعد بھی ان کو بنایا جاتا رہا جب کہ وہاں کا دانشور طبقہ مایوسیوں کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا تھا، ان کا ترکش اب بھی خالی نہیں، مولانا آزاد کی کردارکشی کے جذبہ سے مجبور ہوکر اب بھی کتابیں لکھی جارہی ہیں، رسالوں میں تیز وتند مضامین شائع ہورہے ہیں جب کہ اپنی غلطی کا احساس ان لوگوں کو بھی بہت جلد ہوگیا تھا جو اس تحریک کے قائد اور اپنے کو پاکستان کا خالق تصور کرتے تھے لیکن ایک طبقہ آج بھی مولانا آزاد کے ناکردہ گناہ کو معاف نہ کرسکا۔

دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ ''مسلم انڈیا'' میں پشاور سے شائع ہونے والے اخبار ''فرنٹیر پوسٹ'' کی ایک رپورٹ کی بنیاد پر پاکستانی فوج کے ایک ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش (جنہوں نے مسٹر محمد علی جناح کی آخری بیماری میں ان کا علاج کیا تھا) کی زبانی حسب ذیل بیان شائع ہوا ہے، کرنل الٰہی بخش بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ وزیراعظم لیاقت علی خاں قائداعظم کو دیکھنے آرہے ہیں اس وقت قائداعظم مسٹر جناح بستر مرگ پر تھے، اور کوئٹہ کے قریب زیارت نام کی جگہ پر ٹھہرے ہوئے تھے، دوسرے دن وزیراعظم لیاقت علی خاں جب وہاں پہنچے اور قائداعظم کو سلام کیا تو اس کا انہوں نے جواب نہیں دیا، تب لیاقت علی خاں نے آمنے سامنے ہوکر پوچھا، قائد کیسے ہیں؟ قائداعظم غصہ سے پھٹ پڑے اور کہا کہ تم اپنے کو بڑا آدمی سمجھنے لگے ہو تم کچھ بھی نہیں ہو، میں نے تم کو پاکستان کا وزیراعظم بنایا ہے، تم سمجھتے ہو کہ تم نے پاکستان بنایا ہے؟ اس کے بعد قائداعظم نے کہا کہ مجھے اب احساس ہوگیا ہے کہ میں نے اپنی

زندگی کی یہ سب سے بڑی غلطی کی ہے، اب اگر مجھے موقعہ ملا تو دہلی جا کر جواہر لال نہرو سے کہوں گا کہ ماضی کی غلطیوں کو بھلا کر میرے دوست بن جاؤ۔

یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ ملانے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا مگر وہ بہت زور سے کانپ رہا تھا، میں نے لیاقت علی صاحب سے کہا کہ مریض کے لئے اتنے غصہ اور جذباتی انداز میں گفتگو کرنا درست نہیں ہے، لیاقت علی خاں نے کمرے سے باہر آ کر کہا کہ:

بڈھے کو اب جا کر اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے۔

(قومی مورچہ بنارس اشاعت ۱۵/اگست ۱۹۸۸ء ص۲ کالم ۷و۸)

مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلیؒ

اسلامی ہند کی ایک تاریخ ساز شخصیت

مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلیؒ مدیر الفرقان ۴ مئی ۱۹۹۷ کو ۹۲ سال کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، پوری زندگی انہوں نے دین حق کی سر بلندی اور اسلام دشمن فتنوں سے نبرد آزمائی میں گذار دی، سنگین سے سنگین تر حالات بھی ان کی دینی جدو جہد، احقاق حق اور ابطالِ باطل کی راہ میں پیش قدمی کو نہ روک سکے، ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن دریا میں اتر کر طوفان کی ہولناکیوں اور ہلاکت خیزیوں سے پنجہ آزمائی کرنے کا حوصلہ اور ہمت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے، ان کی تعداد اتنی مختصر ہوتی ہے کہ ہر دور میں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، ایسے ہی کمیاب افراد میں حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی شامل ہے۔

ان کا عزم آہنی، ان کی ہمت فولادی، ان کا جوش عمل طوفان بدوش ان کا حوصلہ نا قابل شکست، دین کی راہ میں ان کی جدو جہد سیماب صفت، ان کا عزم جواں ہمت بلند پارے کی طرح ہمہ وقت متحرک، اور رواں دواں، وہ جس مہم پر چلے پورے جوش وخروش اور پورے ولولے کے ساتھ چلے ان کا دل دین حق کی سر بلندی کے جذبات سے معمور، ان کا دماغ علوم ومعارف کا خزانہ، ذہانت وفطانت ان کی کنیز، زورِ استدلال زورِ بیان ان کا غلام، علماء حق کے خلاف فتنہ برپا کرنے والوں کے محاذ پر پوری جاں سپاری اور جذبۂ فدا کاری کے ساتھ ٹوٹ پڑنے والے، کبھی کبھی تو دل جذبات کے لاؤ لشکر لے کر اتنی تیز روی کے ساتھ پیش قدمی کے لئے آگے بڑھا کہ عقل اور مصلحت دونوں اپنی جگہ دم بخود اور حیرت زدہ رہ گئیں، سست گامی انہوں نے کبھی نہیں سیکھی تیز گامی بلکہ برق رفتاری ان کی فطرت تھی۔

میدان عمل کا انتخاب:

مولانا مرحوم دینی جدو جہد اور اپنی عملی سرگرمیوں میں اپنی راہ خود منتخب کرتے، کسی خارجی دباؤ یا کسی دوسرے کے مشوروں کا ان کی عملی سرگرمیوں میں کبھی کوئی دخل نہیں رہا دل میں جو جذبہ ابھرتا دل کی گہرائیوں سے ابھرتا، مصلحت اندیشی، خطرات کے احتمالات کا کہیں دور دور گذر نہیں ہوتا انجام سے بے پرواہ ہو کر طوفان میں چھلانگ لگا دینا، ان کا مزاج تھا، عقل دلی جذبات کے تابع تھی، دل اپنی پسندیدہ راہ پر چل پڑتا، عقل کو اس کا دامن پکڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

جب مولانا نعمانی دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۲۶ء میں سند فضیلت لے کر اپنے وطن سنبھل میں لوٹ کر آئے تو پورے ہندوستان میں بدعات وخرافات مشرکانہ عقائد اور رسم ورواج کی حمایت میں بدایوں اور بریلی کے علماء نے ایک شور برپا کر رکھا تھا، ان تمام خرافات کو سند جواز ہی نہیں دے رکھی تھی بلکہ ان بدعات کی مخالفت کرنے والوں کو سب وشتم اور دشنام طرازی سے آگے بڑھ کر ان پر کفر کا فتویٰ دے رکھا تھا، علماء دیوبند نے بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد وخیالات کے خلاف جہاد چھیڑ رکھا تھا اور جاہلی رسم ورواج کے خلاف اپنی اصلاح جاری کر رکھی تھی وہ اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ مسلم معاشرہ میں دیکھنا چاہتے تھے علماء سوء جو ان خرافات کی پشت پناہی کر رہے تھے ان کے مفاد پر اس سے ضرب پڑتی تھی اس لئے وہ تحریکِ اصلاح کی مہم میں پوری جاں سپاری کے ساتھ حصہ لینے والوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور ان پر اپنی کمینگاہوں سے زہریلے تیر برسا رہے تھے علماء حق کو ذلیل ورسوا کرنے اور جاہل عوام کو ان کے خلاف اشتعال دلا کر ان کی جان کے دشمن بنانے کی ہر امکانی جدو جہد کر رہے تھے اور وہ بڑی حد تک اپنی تگ ودو میں کامیاب بھی ہو رہے تھے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے کہ علماء حق کو بعض مقامات پر جانے میں جان کے خطرات لاحق تھے۔

بدعات ومشرکانہ عقائد وخیالات کی حمایت میں انوار ساطعہ تو بہت پہلے لکھی جا

چکی تھی اور اس کے جواب میں حضرت گنگوہی کے حکم سے مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری ''براہین قاطعہ'' لکھ کر شائع کر چکے تھے جس کی اشاعت کے بعد علماءسوء کی تکفیری مہم پر شباب آ گیا اور علماء دیوبند ایسے کافر بنائے گئے کہ جو ان کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہو جائے۔

حرمین شریفین کے علماء اور مفتیوں کو دھوکا دے کر مولوی احمد رضا خاں بریلوی فتویٰ حاصل کر چکے تھے اور پورے ملک میں اس کی اشاعت ہو چکی تھی، جس کا نام ''حسام الحرمین'' رکھا گیا تھا، جب یہ تلوار نیام سے نکلی تو باہر نا کردہ گناہ مسلمانوں کی گردن اس کی زد میں تھی، خصوصیت کے ساتھ شاہ اسمٰعیل شہید حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کو غیر مبہم الفاظ میں کافر کہا گیا اور انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کیا گیا، اللہ کے ان نیک بندوں کو برملا مولوی احمد رضا خاں بریلوی کا ہر حمایتی کافر کہتا اپنے رسالوں اور کتابوں میں لکھتا تھا شہروں اور قصبوں سے لے کر دیہاتوں اور گاؤں کے ناخواندہ اور سیدھے سادے مسلمانوں کو بھی سبق پڑھایا جاتا کہ علماء دیوبند کے جلسوں اور وعظوں میں جانا گناہ اور کافروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، اس طرح علماء حق کی راہوں میں زہریلے کانٹے بچھا دیئے گئے تھے ان کی تحریک اصلاح کی راہیں جاں لیوا خطرات سے معمور ہو گئیں، تکفیر کے آتشکدے میں انگارے دہک رہے تھے اور یہ انگارے اڑ اڑ کر ہندوستان سے حجاز تک علماء حق کی راہوں میں لودے رہے تھے۔

ٹھیک یہی ماحول تھا اور یہی حالات تھے جب مولانا منظور نعمانی دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر وطن آئے تھے سنبھل اور امروہہ کے مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے چار سال گذار چکے تھے اسی تدریسی دور میں بریلوی فرقے سے تین چار مناظرے مختلف مقامات پر کر چکے تھے، لیکن مولانا نعمانی اپنی اس محدود جدو جہد اور عملی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھے وہ اس سے بہت آگے جانے کا حوصلہ رکھتے تھے، تکفیری فتنے کی شدت کا تقاضا کچھ وار بچانے کے ساتھ ساتھ وار کرنا

بھی ضروری ہوتا ہے انہوں نے ایک بار حالات کا جائزہ لیا اور ذہن میں ایک لائحہ عمل بنایا اور دشمن کی کلائی مروڑ کر اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کا جذبہ ابھرا اور یہ جذبہ اتنی شدت سے ابھرا کہ انجام سے بے پروا ہو کر اس دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑے اور فتنوں کے سرچشمہ اور منبع ومخرج بریلی جاکر اس فتنہ کے دہانے کو بند کرنے کا عزم بالجزم کرلیا، ساری مصلحتوں اور خطروں کو پس پشت ڈالا، عقل اور مآل اندیشی دامن پکڑتی رہی لیکن آپ دامن جھٹک کر آگے بڑھ گئے اور بریلی پہنچ کر وہیں خیمہ گاڑ دیا،

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

مناظروں کا دور:

اس دور کے اہم ترین فتنوں میں سب سے خطرناک بریلویت کا فتنہ تھا، بدعتوں کی حمایت کرنے والے علماءِ سوء خود بدعات مشرکانہ خیالات وعقائد میں گرفتار تھے اور خود ساختہ رسم ورواج، میلاد، عرس، قوالی، قبروں پر چراغاں، نذر ونیاز، چڑھاوا اور میلوں ٹھیلوں کو کارِ ثواب بنا کر گناہوں کے دل دل میں گردن تک دھنسے ہوئے تھے اور جاہل اور سیدھے سادے عام مسلمانوں کو اپنے دام فریب میں گرفتار کر کے یہ سمجھا رہے تھے کہ اصل دین یہی ہے، علماء دیوبند جو عوام کو بدعقیدگی کی اس دَلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے ان کی آواز کو بے اثر بنانے کے لئے ان کو کافر ومشرک دشمن اولیاء ورسول کہتے تھے اس صورت حال کی وجہ سے عوام کی اصلاح دشوار سے دشوار تر ہوتی چلی گئی، مولانا نعمانی کا خیال تھا کہ جب تک اس سانپ کے پھن کو کچلا نہیں جاتا کوئی بھی مصلح اس کے زہر سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور انہوں نے یہی کیا۔

چار سال تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے اس مدت میں آپ درڈ ضلع نینی تال، سنبھل ضلع مرادآباد، گیا (بہار) اور سلانوالی (پنجاب) میں باطل شکن مناظرے کر چکے تھے، اب آپ تدریسی مشغلے سے آزاد ہو چکے تھے اب شب وروز کا ہر لمحہ اسی

فتنہ کی سرکوبی کے لئے وقف تھا، اور اس کی تدابیر پر غور وفکر کرنے میں گذرتا تھا، آپ نے بریلوی مکتب فکر کے سب سے مضبوط قلعہ مدرسہ منظر اسلام بریلی پر حملے کے آغاز سے اپنی مہم شروع کی اور خود ان کے مدرسہ میں گئے جوان کا ایک محفوظ قلعہ تھا، مولوی احمد رضا خاں صاحب تو حسام الحرمین کی تلوار اپنے جانشینوں کے ہاتھ میں دیکر عدم آباد کے سفر پر جا چکے تھے البتہ ان کے جانشین تخت اقتدار پر متمکن تھے مولانا نعمانی نے انہیں کو مناظرہ کا چیلنج دیا لیکن جب مناظرہ کی نوبت آئی تو اپنی جگہ انہوں نے اپنے مدرسہ کے صدر مدرس مولوی سردار احمد گورداسپوری کو اپنا وکیل بنا کر کھڑا کر دیا، جب سوال وجواب کا آغاز ہوا تو فریق مخالف نے علماء دیوبند کو ''حلوہ مانڈا'' نہ ملنے کا طعنہ دیا، مولانا نعمانی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ حرام کا حلوہ مانڈا نہ تم کو مبارک نہ ہم کو ہماری فاقہ کشی سنت رسول پر عمل آوری کا ایک ذریعہ ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے ہیں اور آپ کئی کئی وقت بھوکے رہے، اس کے جواب میں فریق مخالف نے کہا تم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوکا کہہ دیا تم نے سرکار دو عالم کی توہین کی تم مرتد ہو گئے اور واجب القتل ہو، بریلوی مکتبِ فکر کے صدر نے مسند صدارت سے بھی یہی اعلان کیا کہ بالکل واجب القتل ہے، حضورؐ کی توہین کی وجہ سے مرتد ہو گیا اور مرتد کی سزا قتل ہے، غیرتمند مسلمان اس کو برداشت نہیں کر سکتا قتل، قتل کی تکرار سے ان پیشہ ور قاتلوں کو اشارہ دینا تھا جو اسی مقصد کے لئے بلائے گئے تھے کہ حملہ کر دو، مولانا نعمانی کے ساتھ والے سازش کی اس تہ کو فوراً سمجھ گئے اور آپ کو اپنے حصار میں لے لیا اور بڑی مشکلوں سے جان بچائی ایک شور برپا ہو گیا، ہر طرف سے یہی آواز آرہی تھی مارو، جانے نہ پائے، قتل کر دو، مرتد ہو گیا، مرتد کو قتل کرنا ضروری ہے، مولانا نعمانی کے حامیوں نے چاروں طرف سے آپ کو گھیرے میں لے لیا اور گیٹ سے باہر نکال لائے قلعہ رضویہ کے سورما اپنی سازش میں ناکام ہو گئے البتہ شکست کی ذلت کی سیاہی ان کے چہروں پر چھائی ہوئی تھی یہ مولانا نعمانی کی جرأت قلندرانہ کا تاریخ ساز مظاہرہ تھا۔

ادری ضلع اعظم گڈھ کا مناظرہ:

بریلی کے مناظرہ کے کچھ ہی دنوں بعد میرے وطن ادری اعظم گڈھ میں ہندوستان گیر شہرت کا مناظرہ ہوا، یہاں بریلوی مکتب فکر کے دو ممتاز اور سر برآوردہ مولوی صاحبان موجود تھے ایک مولوی نعیم الدین مرادآبادی اور دوسرے مولوی حشمت علی پیلی بھیتی یہ دونوں ایک جلسہ عام میں تقریر کے لئے بلائے گئے تھے، دن مین جلسہ ہورہا تھا ۱۱ بجے کا وقت ہوگا اسٹیج پر مولوی حشمت علی صاحب تقریر کررہے تھے اور مولوی نعیم الدین بیٹھے ہوئے تھے۔

ٹھیک اسی صورت حال میں مولانا عبداللطیف نعمانی نے جلسہ عام میں جاکران دونوں کو مناظرہ کا چیلنج دیا اوران کے فرار کا راستہ بند کردیا، اس کے باوجود مولوی نعیم الدین پہلی ٹرین سے فرار کر گئے البتہ عوام نے مولوی حشمت علی صاحب کو زبردستی روک لیا، پھر تین دنوں تک بڑا ہی ہنگامہ خیز مناظرہ ہوا ہمارا چھوٹا سا گاؤں ادری ان دنوں آدمیوں کا جنگل بن گیا تھا پورا ضلع سمٹ آیا تھا، مناظرہ کا موضوع مسئلہ علم غیب تھا، لیکن فریق مخالف جب بھی اصل موضوع پر گفتگو آتی تو وہ حسام الحرمین کے فتوؤں کی بات لے آتے، اکابر علماء دیوبند کی کتابوں کی عبارتوں پر تقریر شروع کردیتے، جب جب مولانا نعمانی اصل موضوع پر ان کو گھیر کر لے آتے تو اول فول بکنا شروع کر دیتے، جھنجھلاہٹ بڑھی، سخت سست الفاظ کا استعمال مولوی حشمت علی کی طرف سے مسلسل چلتا رہا، علماء دیوبند کے کفر کا اعلان دانت پیس پیس کر کرتے مولانا نعمانی مولوی حشمت علی کی اس حرکت مذبوحی پر صرف مسکراتے رہتے تھے، جب مولانا نعمانی کی گرفت سے نکلنے کی کوئی شکل نہیں رہی تو اپنے ہم مشربوں سے کہہ کر بذریعہ پولیس تیسرے دن مناظرہ بند کرادیا، حلقہ کے تھانیدار نے نقض امن کا اندیشہ بتا کر اعلان کر دیا کہ کل سے مناظرہ بند کیا جاتا ہے، اگرچہ موضوع مناظرہ پر مولانا نعمانی کے سارے سوالات تشنۂ جواب ہی رہے، مولوی حشمت علی نے اصل موضوع پر کبھی گفتگو

کرنے کی جرأت ہی نہیں کی لیکن عام مسلمانوں نے علی رؤس الاشہاد یہ جان لیا کہ حق مولانا نعمانی کی طرف ہے فریقِ مخالف کے پاس سوائے سب وشتم دشنام طرازی اور کافر گری کے اور کوئی علمی جواب نہیں، وہ آخر تک اپنی کم علمی کی پردہ پوشی کی جد وجہد میں مصروف رہے۔

تین دنوں کے بعد یہ مناظرہ بند ہوگیا لیکن اس کا اثر ہمارے ضلع اعظم گڈھ کے مسلمانوں پر اتنا پڑا کہ یہاں کی نوے (۹۰) فیصد آبادی جو بدعات وخرافات میں مبتلا تھی وہ اس سے تائب ہوگئی اور ضلع اعظم کے سواد اعظم گڈھ نے مولانا نعمانی کے اس جرأت مندانہ اقدام سے حق کی روشنی پالی اور سابقہ روش سے ایک دم کنارہ کش ہو گئے، سوائے چند چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے پورا ضلع ان بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد وخیالات سے پاک ہوگیا، اور ان لاکھوں مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی جو توفیق حاصل ہوئی اس کے اجر میں مولانا مرحوم اجر عظیم کے مستحق ہوئے۔

وہابی اور وہابیت کا طعنہ:

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے جب دجل وفریب سے کام لیکر علماء حق کے خلاف علماء حجاز سے فتویٰ حاصل کیا تھا اس وقت حجاز پر ترکوں کی حکومت تھی اور جب وہ ہندوستان لوٹ کر آئے اور اس فتویٰ کو حسام الحرمین کے نام سے طباعت کا انتظام کر رہے تھے تب تک حجاز میں انقلاب آچکا تھا، ترکی حکومت خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے حجاز کا گورنر شریف حسین تھا، اس زمانہ میں جدہ میں انگریزوں کا فوجی جنرل ولسن جدہ میں مقیم تھا، اس نے شریف حسین کو ورغلا کر باغی بنا دیا اور بغاوت کر کے حجاز سے ترکی حکومت کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لی اس وقت ترکی فوجیں حجاز میں بہت کم تھیں، پہلی جنگ عظیم شباب پر تھی ترکوں کی ساری فوجیں حجاز سے باہر مختلف محاذوں پر جنگ میں مصروف تھیں اس لئے بڑی آسانی سے شریف حسین کامیاب ہوگیا اور انگریزوں کا آلۂ کار بن کر حجاز کا حکمراں ہوگیا اسی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اوران کے تین دیگر رفقاء کوگرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کیا تھا، اورانہوں نے ان بزرگوں کو چار سالوں کے لئے جزیرہ مالٹا کے جیل خانے بھیج دیا تھا، اسی جنگ عظیم کے موقعہ پر انگریزوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کرکے خلافت عثمانیہ کا وجود مٹادینے کی کارروائیاں شروع کر دیں جس کی وجہ سے پورے عالمِ اسلام میں تہلکہ مچ گیا ہندوستان میں اسی واقعہ کی وجہ سے تحریک خلافت چلی یہ اتنی طاقتور تحریک تھی کہ انگریزی نظام حکومت بے اثر ہوکر رہ گیا عوام نے اپنی پولیس اوراپنی عدالتیں قائم کرلیں سارے باہمی مسائل ازخود حل کرتے، مقدمات کے فیصلے کرتے، مجرموں کو سزائیں دیتے، پورے ملک میں ''خلافت زندہ باد'' کے نعرے کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی دوسری تمام سیاسی پارٹیاں یا تو خلافت تحریک کی حمایت کرتیں یا مفلوج ہوکررہ گئی تھیں، اوران کی سرگرمیوں پر اداسی پڑگئی، مولانا محمد علی مولانا شوکت علی ہندوستان کے ہیرو بن گئے سارے مسلمان تو ہم آواز تھے ہی غیر مسلم بھی نعرۂ تکبیر اللہ اکبر میں ہم آواز تھے، ہندو مسلم اتحاد کا اتنا شاندار بے مثال مظاہرہ ہندوستان کی تاریخ نے کبھی نہیں دیکھا تھا جو شخص یا جماعت کوئی ایسا کام کرتا یا ایسی بات کہتا جس سے اس اتحاد پر ضرب پڑتی تو پورے ملک کی اس پر لعنت برسنے لگتی تحریک خلافت کی مخالفت کرنے والوں کے جنازے پڑے رہ جاتے ان کو دفن کرنے والے نہیں ملتے تھے۔

لیکن ہندوستان کے مقدر میں ابھی غلامی کے بہت دن تھے، ہندوستان میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کی بحالی کے لئے پوری قوت سے تحریک چلائی جارہی تھی دوسری طرف خود ترکی میں ایک ترکی لیڈر مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنے ہاتھوں قباء خلافت کو تار تار کردیا، ترکی کے شیخ الاسلام نے جب مصطفےٰ کمال کو خدا ورسول اور قرآن کا واسطہ دیا تو اس نے شیخ الاسلام کے ہاتھوں سے قرآن پاک چھین کران کے سر پر دے مارا اور کہا اپنا قرآن لے جاؤ ہم کو اس کی ضرورت نہیں اقتدار پانے کے بعد مصطفےٰ کمال نے عربی زبان پر پابندی لگادی لکھنے پڑھنے اور بولنے پر ہی نہیں عربی زبان میں اذان

کہنے پر بھی سخت سزا دی جاتی تھی اسلامی لباس پہننا جرم قرار دیا گیا، دینی مدارس بند کرا دیئے اور ترکی کی سرزمین سے خلافت کا جنازہ نکال دیا ہندوستان کی تحریکِ خلافت اپنی موت آپ مرگئی۔

تحریکِ خلافت کے اس پورے دور میں مولوی احمد رضا خاں کی حسام الحرمین کی تلوار زنگ کھاتی رہی کیونکہ اس کی اشاعت سے اتحاد و اتفاق میں خلل پڑتا تھا اس طرح کی اٹھنے والی ہر آواز کو عوام گلا گھونٹ کر بند کرنے کے لئے بیتابی کے ساتھ دوڑ پڑتے تھے اس لئے ان کی تکفیری مہم اپنی قبر میں سوتی رہی، حالات نے پلٹا کھایا حجاز میں شریف حسین کی بغاوت کی سزا والی نجد سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شریف حسین پر حملہ کر کے دی شریف حسین کو شکست ہوئی پورے حجاز پر سلطان عبدالعزیز کا قبضہ ہو گیا اس نے اپنے مسلک کی رو سے قبروں پر بنے ہوئے قبوں کو منہدم کرا دیا، سلطان کے اس اقدام کی خبر جب ہندوستان پہنچی تو اس کی مذمت میں جلسے ہونے لگے، رضا خانی جماعت نے اس معاملہ کو اپنی جماعت کا ایشوء بنا لیا اور علماء دیوبند کو سعودی حکومت کے ان اقدامات سے جوڑ دیا اور ان کو وہابی اور نجدی کی گالیاں دینی شروع کردی، حسام الحرمین کی تلوار پر از سرنو سان چڑھائی گئی تحریکِ خلافت کے پورے دور میں ان کی تکفیری مہم جو مردہ خانے میں لاش کی طرح پڑی رہی پھر اس میں جان ڈالی گئی اور پھر وہ میدان میں آگئے۔

ٹھیک یہی زمانہ، یہی ماحول، یہی گرم فضا تھی جب مولانا منظور نعمانی نے ۱۹۳۰ء میں بریلی میں قیام کا فیصلہ کیا اور وہاں جا کر سکونت پذیر ہو گئے، اپنے مشن کی اشاعت کیلئے آپ نے ایک ماہوار رسالہ الفرقان کے نام سے ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جاری کیا جو آج تک جاری ہے اور دین کی خدمت انجام دے رہا ہے اور بدعت میں ہزاروں مضامین اور ان گنت مناظروں کی روداد یں اپنی فائلوں میں چھپائے ہوئے ہے۔

مناظرے ہی مناظرے:

بتدریج علماء دیوبند کی تحریک اصلاح تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اس کی تیز

رفتاری دیکھ کر بریلوی مکتب فکر پوری بدحواسی کے ساتھ اپنی چراگاہوں کی حفاظت کے لئے تگ ودو کررہا تھا، کافرگری کی مہم میں تیزی لانے کے لئے نئی نئی گالیاں ایجاد کررہا تھا، سب وشتم، دشنام طرازی میں ان کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی، کافرگری کی مہم کا یہ دورشباب تھا اس دور میں مولانا نعمانی جان ہتھیلیوں پر لے کران تمام مقامات تک پہنچنے کی کوشش کرتے جہاں رضا خانی جماعت کے نمائندوں نے زہرافشانی کی ہے، ہرطرح کے خطرات کا سامنا کرتے ان کے تمام جبہ قبہ والے مولویوں کو مولانا نعمانی کا چیلنج عام تھا، کیسا ہی خطرناک ماحول ہو کتنے ہی اندیشناک حالات ہوں آپ کا بروقت اس مقام تک پہنچنا ضروری تھا، مولانا مرحوم پورے دس سال تک مسلسل ان کے تعاقب میں رہے ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا جہاں رضا خانیوں نے بدعات وخرافات کی حمایت میں لن ترانیاں ہانکی ہوں اور مولانا نعمانی کی حق کی آواز وہاں نہ گونجی ہو، بریلی مکتب فکر کے لوگ مسلمانوں کی شکل وصورت میں رہ کر اسلام کی شکل بگاڑنے والے جہاں بھی گئے ان کو للکارا ان کے خلاف تقریریں کیں، مضامین لکھے، مناظرے کئے اور تمام متنازع فیہ مسائل کو علم واستدلال کی روشنی میں حق کو اتنا واضح کردیا کہ ہندوستان کا سواد اعظم جس کو قدرت نے ذرا بھی علم دیا تھا سچائی کو پا گیا اور اس نے بدعات وخرافات سے توبہ کرلی، احقاق حق اور ابطال باطل کا کوئی دقیقہ آپ نے نہیں چھوڑا، دس برسوں کی انتھک جدو جہد کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اب جولوگ اپنے آباء واجداد کی گمراہیوں میں مبتلا ہیں وہ حق کی روشنی کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اس کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تب آپ نے فیصلہ کیا کہ اب مناظروں کی ضرورت نہیں، اب اس کی افادیت ختم ہو چکی ہے اب جولوگ بدعات وخرافات سے چمٹے ہوئے ہیں اس کو گناہ سمجھتے ہوئے چمٹے ہوئے ہیں ایسے لوگوں کی اصلاح اب انتہائی دشوار ہو چکی ہے۔

اب آپ نے طے کیا کہ مثبت انداز میں دین کی خدمت ہی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، بدعت پسندوں کی جماعت ایک فرقہ اور ایک پارٹی بن چکی ہے حق اور

ناحق کی تمیز کئے بغیر اپنے فرقہ یا پارٹی کی حمایت کرتی ہے اسی کو شریعت کی اصطلاح میں عقیدت جاہلیہ کہتے ہیں مناظروں کی یہ ہنگامہ آرائیاں دوسری جنگ عظیم کی ابتداء ۱۹۴۹ء تک رہیں پھر بدریج ان میں کمی آتی چلی گئی بالآخر ایک دم بند ہوگئیں۔

دوسرا دور:

کچھ کم وبیش دس سال مولانا نعمانی نے احقاق حق وابطال باطل میں مجاہدانہ عزم وثبات مولفانہ ایمان ویقین، قلندرانہ جرأت وہمت کے ساتھ خدمات انجام دیں اور حق کی آواز شہروں اور قصبوں سے لے کر گاؤں اور دور دراز دیہاتوں تک پہنچادی، اب مسلمانوں کا ہر طبقہ سمجھ گیا کہ حق کیا ہے صداقت کیا ہے؟ بدعات وخرافات کیا ہے؟ اسلام کے تقاضے اور دین وشریعت کا ہم سے مطالبہ کیا ہے اور صحیح دین کیا ہے؟ اتمام حجت کردی گئی، اب جو لوگ باطل عقائد اور مشرکانہ رسم ورواج میں گرفتار رہے ان کو بھی یہ علم ہوگیا کہ ہندوستان کے جلیل القدر علماء ہمارے طرز عمل کو دین وشریعت کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن علماء سوء اور بریلوی مکتب فکر کے علماء بھٹکے ہوئے مسلمانوں کی غلط روش کو صحیح بتانے کی وجہ سے وہ بدعات وخرافات میں گرفتار رہے، مولانا نعمانی کی اس دس سالہ جدو جہد اور اعلان حق کے بعد اب لاعلمی یا جہالت کی تاریکی دین وشریعت کے خلاف راہ اختیار کرنے کا بہانہ نہیں رہ گئی، اب ان کی گمراہی دانستہ اور خود اختیاری اور باطل کو باطل سمجھ کر تھی، دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ مولانا مرحوم تاحد امکانی ادا کر چکے تھے اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے روز وروشن کی طرح واضح ہو چکا ہے اب باطل پر اصرار ضد کے نتیجہ میں تھا اس لئے اب ہر جدو جہد رائیگاں تھی، آپ نے مناظروں کی راہ ترک کردی اور خدمتِ دین کی دوسری راہوں پر غور کرنا شروع کردیا۔

جماعت اسلامی کی تشکیل:

اس غور وفکر کے دور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو کبھی جمعیۃ علماء ہند کے اخبار

میں کام کرتے تھے اب انہوں نے اپنا ایک رسالہ حیدر آباد سے ترجمان القرآن کے نام سے جاری کر رکھا تھا مولانا نعمانی اس کی ابتدائی اشاعت سے اس کا مطالعہ کر رہے تھے اب بھی ترجمان القرآن پابندی سے دیکھتے اور پڑھتے تھے اس میں اقامت دین، حکومت الٰہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب کی جو دعوت دی جارہی تھی، بتدریج آپ اس سے متاثر ہوتے رہے، یہاں تک کہ کچھ دنوں بعد یہ دعوت آپ کے دل کی آواز بن گئی، دل جذبات سے سرشار ایثار وقربانی آپ کی فطرت آپ کا مزاج، دین وملت کی خدمت کے لئے سوز وگداز سے بھرا ہوا دل رکھتے تھے اثر پذیری اس کا ایک عنصر تھا، مولانا نعمانی مودودی صاحب کی تحریروں سے اس قدر متأثر ہوئے کہ دل ان کی اقامت دین اور اسلامی انقلاب کی دعوت سے ہم آہنگ ہوتا چلا گیا، دل کی تڑپ بڑھتی چلی گئی اور آپ کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دین کی خدمت کا اس سے بہتر طریقہ موجودہ دور میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء شروع ہو چکی تھی بین الاقوامی صورتِ حال بدلتی جا رہی تھی اب ہر ہندوستانی محسوس کرنے لگا تھا کہ ملک کو آزاد ہونا ہے، انگریزوں کی حکومت کا آفتاب بہت جلد غروب ہونے والا ہے سیاستدان اور ہر طبقہ کے مفکرین اور ماہرین ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے تھے، سیاسی پارٹیوں کے خیموں میں مستقبل کے نقشے بنائے جانے لگے تھے، خاکے تیار کئے جارہے تھے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں سب سے زیادہ فکرمند مسلمان تھے، ہندو اپنی اکثریت اور سیاسی بالادستی کی وجہ سے مطمئن تھے کہ ملک میں جو بھی نظام حکومت قائم ہوگا بہر حال ان کو بالادستی حاصل ہوگی مسلمان اقلیت میں تھے، اس لئے وہ تشویش میں مبتلا تھے کہ اگر انگریز ہندوستان سے اپنا بوریا بستر اٹھا لیتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے تو ایسا تو نہیں کہ مسلمان اکثریت کا غلام ہو جائے جب کہ آزادی کی راہ میں ان کی قربانیاں دوسروں سے کسی طرح کم نہیں تھیں، لیکن ان کے سامنے کوئی فارمولہ، کوئی منصوبہ، اور نظام حکومت کا کوئی خاکہ نہیں تھا۔

مودودی صاحب نے خالص اسلامی اصطلاحات میں اسلامی انقلاب کی جب دعوت دی اور اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں جس لب ولہجہ میں اپنا خاکہ پیش کیا وہ ایسا دل کش اور اسلامی روح ومزاج کے موفق تھا کہ جو لوگ مودودی صاحب سے براہ راست متعارف نہیں تھے ان کو غائبانہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسا عالم دین، مفکر اسلام اور زہد وتقدس کے بلند مقام پر فائز سمجھتے تھے وہ عہد حاضر کے جمال الدین افغانی اور ادریس السنوسی کی طرح مراہب فی اللیل ومجاہد فی النہار تصور کرتے تھے، مولانا نعمانی بھی انہیں لوگوں میں سے تھے، دل کی تڑپ اتنی بڑھی کہ مودودی صاحب کو خط لکھ کر ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر جلد ہی دہلی آمد کے موقعہ پر مولانا نعمانی کی ان سے ملاقات بھی ہوگئی، انہوں نے دیکھا کہ ایک جوان کلین شیو، سر پر لمبے لمبے انگریزی بال دیدہ زیب لباس میں بہت ہی اسمارٹ جیسے ابھی ابھی کالج یا یونورسٹی سے ادب یا آرٹ پر لیکچر دیکر آرہے ہیں دین اور مسلمانوں کی شکل وصورت لباس، ذہن ومزاج کے لازمی نتائج کی ان پر پرچھائیں بھی نہیں پڑتی تھی، مولانا نعمانی کے دل کو انہیں اس کی شکل وصورت میں دیکھ کر دھکا ضرور لگا لیکن ان کی تحریروں سے دل اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اس ناخوشگوار صورت حال نے بھی ان کو بدگمان نہیں ہونے دیا، اسے عملی بے اعتدالی یا تساہلی سمجھ کر تاویل کر لی اور یہ یقین کر لیا کہ جو دعوت وہ دے رہے ہیں، بالآخر ان کو دین کے صحیح سانچے میں ایک دن ڈھال دے گی، اور وہ صحیح معنی میں مفکر اسلام کے بلند منصب کے شایان شان اپنا طرز عمل بدل لیں گے، اور ہر ایک کے لئے قابل قبول اپنے کو ثابت کر دیں گے۔

مودودی صاحب کے ذہن میں اب تک کسی تنظیم کا کوئی خاکہ نہیں تھا نہ جماعت بنانے کا کوئی ارادہ، کچھ ہی دنوں بعد جب ایک جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کا اظہار کیا تو سب سے پہلے جس نے پوری صدق دلی اور پورے جوش وجذبے سے مودودی صاحب کا ساتھ دیا اور دست تعاون بڑھایا وہ مولانا نعمانی مرحوم تھے، جماعتِ اسلامی کی حمایت میں اپنے رسالہ الفرقان سے پورا پورا کام لیا اور

عوام تک بات پہنچانے اور علم واستدلال کی روشنی میں جماعتِ اسلامی کی اہمیت وضرورت بتانے میں کلیدی رول ادا کیا اور اس کا حلقہ تعارف مولانا مرحوم ہی کی جدو جہد اور ایثار وقربانی کے طفیل وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اپنی ذات سے آپ جماعتِ اسلامی کے نصب العین کے لئے ہر طرح کی قربانیوں کے لئے تیار ہو گئے حتیٰ کہ جب مودودی صاحب نے دارالاسلام کی تجویز رکھی اور عملی اقدام کیا تو سب سے پہلے مولانا نعمانی ہی ہجرت کر کے دارالاسلام تشریف لے گئے، دماغ اور قلم مودودی صاحب کا تھا خاکہ وہ بناتے مگر اس خاکہ میں رنگ بھرنے کی ساری ذمہ داری مولانا نعمانی نے از خود اپنے سر لے رکھی تھی، عوام وخواص کے ذہنی وفکری رجحانات کو جماعت کی طرف موڑنے میں مولانا مرحوم کی زبان اور ان کے قلم کی ساری توانائیاں وقف تھیں، یہ ۱۹۴۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی جرمنی کا بھوت انگریزوں پر ہی نہیں پورے یورپ، امریکہ اور روس کے سروں پر سوار تھا سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، ہندوستان کے سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں نے موقعہ کو غنیمت جانا اور وہ آزادی کی تحریک کو تیز سے تیز تر کرنے میں مصروف ہو گئے، حکومت کی طرف سے رہنماؤں کی مسلسل گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ ۱۹۴۲ء کی کوئٹ انڈیا تحریک نے پوری کر دی، اس ہنگامہ خیز جنگ کے زمانہ میں اکابر علماء دیوبند سیاسی سرگرمیوں میں اس طرح مصروف تھے کہ کسی دوسری طرف نظر ڈالنے کی ان کو فرصت ہی نہیں تھی، اسی وجہ سے اکابر علماء میں سے کسی نے بھی جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے بلند بانگ دعووں کی جانب نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، جماعت اسلامی کی حمایت ومخالفت دونوں میں سے کوئی چیز نہیں تھی مولانا نعمانی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور جب مولانا ابوالحسن ندوی ان کے رفیق کار ہو گئے تو ان کو اور بھی تقویت ملی اس طرح جماعت اسلامی کو پروان چڑھانے میں مولانا نعمانی نے اہم ترین رول داد کیا اور وہ بتدریج عوامی جماعت بنتی چلی گئی۔

شک کا کانٹا:

مگر کچھ عرصہ بعد آپ کو احساس ہوا کہ جو راہ منتخب کی گئی ہے وہ کعبہ کے بجائے ترکستان کو جا رہی ہے، مودودی صاحب کے بیانات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور بتدریج بلند بانگ دعوے کرتے جا رہے تھے، ان کا خارا شگاف قلم اپنا جوہر دکھانے میں برابر مصروف رہا، اسلاف امت پر ان کی تنقید لب ولہجہ انتہائی جارحانہ ہوتا جارہا تھا، پوری امت اسلامیہ کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ وہ تین چوتھائی قرآن کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی، اسلاف کے سارے کارناموں میں شک وارتیاب کے کانٹے چبھونے کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا نعمانی نے ان کے قلم کو لگام دینے کی جدو جہد کا آغاز کیا اور امیر کارواں کے رخ کو غلط سمت میں جانے سے روکنے اور موڑنے کی دیانت داری کے ساتھ پوری کوشش کی لیکن جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو گئے تو آپ نے سفر روک دیا اور ٹھہر کر صورت حال پر غور کرنا شروع کیا تو آپ کو بہت جلد یقین ہو گیا کہ اقامت دین، حکومتِ الہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کا ایک مستقل فرقہ بنانے کی جدوجہد کی جارہی ہے جس میں بہت سے بنیادی عقائد سے بھی انحراف کا قوی اندیشہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ آئندہ چل کر یہ جماعت ہدایت کے بجائے ضلالت کی دل دل میں نہ گرفتار ہوجائے۔

علیحدگی کا فیصلہ:

اسی دوران مودودی صاحب کی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں شائع ہو گئی، جس کو پڑھ کر مولانا نعمانی کا شبہہ یقین میں بدل گیا کہ جماعت اسلامی در حقیقت مسلمانوں میں ایک گمراہ فرقہ کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔

مودودی صاحب نے اس کتاب میں دعویٰ کیا کہ عہد نبوت میں الٰہ، رب

عبادۃ، دین کی اصطلاحیں رائج تھیں نزول قرآن کے وقت عوام وخواص ان کے صحیح اور حقیقی مفہوم کو سمجھتے تھے، لیکن اس کے بعد ان اصطلاحوں کے مفہوم بدلتے چلے گئے حتی کہ ان کی حقیقتیں مستور ہوگئیں اور پوری امت اسلامیہ عہد رسالت کے بعد کے علماء کی بیان کردہ تشریحات ہی کو ان اصطلاحات کا حاصل سمجھنے لگی، جو عہد رسالت کے مفہوم سے قطعاً جدا گانہ چیز تھی بعد کے علماء نے ان اصطلاحوں کو مفہوم کو یا تو غلط سمجھا یا ناقص سمجھا اسی وجہ سے تین چوتھائی قرآن کے معانی ومفاہیم کو دنیائے اسلام کے علماء نے نہیں سمجھا، مودودی صاحب کے اس دعوی کا تاثر کیا ہوا؟ مولانا نعمانی کے الفاظ ہیں۔

''واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کی یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد قرآن کی ساری تعلیم بلکہ دین غیر مستند اور نا قابل اعتبار ہو جاتا ہے، جب الٰہ، رب، عبادت اور دین جیسے الفاظ جو قرآن پاک میں یقیناً سیکڑوں جگہ آئے ہیں اور اس کے کم ہی صفحات ایسے ہوں گے جو ان الفاظ سے خالی ہوں اور قرآنی دعوت وتعلیم میں جن کی وہ بنیادی اہمیت ہے یقیناً دوسرے لفظ نہیں جب ان کے متعلق مان لیا جائے کہ زمانہ نزول قرآن کے بعد امت مسلمہ صدیوں سے ان کا جو مفہوم ومدعا سمجھتی رہی وہ صحیح نہیں ہے، غلط ہے، یا ناقص ہے اور اس کی وجہ سے دعوت توحید سے متعلق قرآنی آیات اور کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ کا مطلب ومدعا بھی غلط سمجھا جاتا رہا ہے تو پھر قرآن کی کسی آیت اور اس کے کسی کلمہ کے متعلق بھی اطمینان کی گنجائش نہیں رہی، کہ ان کا وہی مطلب ومدعا ہے جو اب تک جمہور امت سمجھتی رہی ہے اس کے بعد ملحدین کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے کہ وہ لغت کی کتابوں وغیرہ کا سہارا لے کر زبان وقلم کے زور سے سارے دین کو بدل کر رکھ دیں'' (مولانا مودودی کے ساتھ میری سرگذشت ص ۸۴)

مولانا نعمانی کا یہ تاثر الفاظ کے پردوں میں چھپے ہوئے ان جراثیم کی وجہ سے تھا جو داعیانہ لب ولہجہ کے ریشمی غلافوں پر رینگ رہے تھے، لاعلمی اور جہالت کا الزام

پوری امت اسلامیہ پر تھا عہد رسالت کے بعد کے تمام محدثین، فقہاء، تابعین، تبع تابعین، علماء، محققین، شارحین حدیث اور مفسرین قرآن پر اس کی زد پڑتی ہے وہ خود غلط فہمی کا شکار تھے اور چودہ سو برسوں سے پوری امت کو غلط فہمی کا شکار بنائے رکھا، عالم اسلام کا سارا علمی سرمایہ نا قابلِ اعتبار غلط فہمیوں کا شاہکار، خس وخاشاک کا انبار ہو گیا، تین چوتھائی قرآن کو سمجھ نہ سکے اور تفسیروں کے انبار لگا دیئے مودودی صاحب کے اس دعوے کی روشنی میں تمام تفسیریں دریا برد کر دینے کے لائق، تمام مفسرین گردن زدنی ہو گئے کہ انہوں نے قرآن کی وہ تفسیر نہیں کی جو نزول کے وقت سمجھی جاتی تھی۔

سب سے زیادہ حیرتناک بات تو یہ ہے کہ مودودی صاحب نے پوری امت کی اس غلطی کو دریافت کیا جس کو دریافت کرنے سے چودہ سو سالوں کے ذہین ترین علماء اور محققین بھی عاجز رہ گئے، کیا الہام ہوا؟ کیا کوئی وحی آ گئی یا کم از کم نزول قرآن کے وقت جو صحابہ کرام موجود تھے جو ان قرآنی اصطلاحات کے حقیقی مفہوم ومعنی کو سمجھتے تھے انہوں نے ان اصطلاحات کی تشریح میں کوئی کتاب لکھی تھی جو اتفاق سے مودودی صاحب کے ہاتھ لگ گئی تب اس غلطی کا احساس ہوا؟۔

مولانا نعمانی نے جب مودودی صاحب کی یہ بلند پروازی اور یہ جسارت دیکھی تو ان کے دل کو سخت چوٹ لگی، انہوں نے یقین کر لیا کہ مودودی صاحب اسلام کی خدمت کے بجائے اسلام کی بنیاد کھودنے کی تیاری کر رہے ہیں اور امت کو گمراہی کے راستے پر لے جا رہے ہیں، مولانا نعمانی تو جماعت اسلامی کی تشکیل اور اس کو متحرک وفعال بنانے میں قربانیاں دے رہے تھے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں اگر میری زندگی بھی کام آ جائے تو اس کو اپنی سعادت سمجھوں گا، اقامت دین کا یہ جذبہ اتنا شدید تھا کہ انہوں نے اپنے اساتذہ علماء دیوبند اور اکابر امت سے بھی اس سلسلہ میں استصواب نہیں کیا اور نہ ان کے مشوروں کا انتظار کیا صرف اپنے دلی جذبے سے بیتاب ہو کر ہر طرح کی قربانیوں کے لئے تیار ہو گئے تھے اب جو دل ودماغ کو شدید چوٹ پہنچی تو آپ نے اسی دن فیصلہ کر لیا کہ جماعت اسلامی سے قطع تعلق کر لوں گا،

مودودی صاحب کو امیر کارواں بنا کر غلط راہ پر پڑ گیا، وہیں سے آپ الٹے پاؤں واپس ہو گئے بلا جھجک اور بلا خوف لومۃ لائم آپ نے اپنی غلط فہمیوں کا اعتراف کرلیا اور اپنی غلطی کے اعلان کے لئے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں جماعت اسلامی سے علیحدگی کی پوری داستان دوسو صفحات پر مشتمل ایک کتاب میں لکھ دی۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

میں جب ''اسماء الرجال'' لکھ رہا تھا تو دوران مطالعہ بعض محدثین کا یہ بیان نظر سے گذرا کہ ہم جب کسی سے حدیث کے سماع کے لئے جاتے ہیں تو کچھ دن ٹھہر کر پہلے اس کی نماز دیکھتے ہیں اور روز وشب کی مصروفیات کا کچھ اندازہ کرتے ہیں اگر وہ شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہیں تب ہم ان سے حدیثیں لیتے ہیں ورنہ واپس ہو جاتے ہیں، بعض محدثین تو ظاہری شکل وصورت اور وضع قطع پر بھی نظر رکھتے تھے اگر ذرا بھی خلاف سنت کچھ نظر آیا تو الٹے پاؤں واپس ہو جاتے تھے اور اس کی حدیث نہیں لیتے تھے ایک محدث سفر پر گئے اور جب واپس ہوئے تو ان کے رفقاء نے ان سے پوچھا کہ آپ کوفہ گئے تھے جابر جعفی سے حدیث نہیں لکھی؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ میں جابر جعفی کے یہاں گیا تھا لیکن میں نے دیکھا **کان طویل اللحیۃ فرجعت** میں نے دیکھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے اس لئے واپس ہو گیا۔

محدثین کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ دین انھیں لوگوں سے لیا جائے جو خود بھی دین کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں، اگر ایسا نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی زبان یا ان کے قلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہ الفاظ کی جادوگری اور انداز بیان کی ساحری ہے اس کی پس پشت حقیقت اور صداقت کچھ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ حدیث وقرآن کی تعلیم جس نے مستند علماء سے حاصل نہ کی ہو، قرآن وحدیث کو اہل لغت اور جاہلی شعراء کے حوالے سے نہ سمجھا ہو، تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے افراد کسی نہ کسی منزل پر

بھٹک جاتے ہیں اپنے ساتھ دوسروں کی بھی عاقبت خراب کرتے ہیں اگر کسی نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے غیر دینی ماحول میں زندگی گذاری ہواور بعد میں دین کی طرف میلان ہوااور اپنے مطالعہ سے دین کو سمجھا اور سیکھا اگر قدرت نے زبان وقلم سے کام لینے کی اس میں صلاحیت رکھ دی ہے تو آغاز کار میں وہ محتاط قدم اٹھاتا ہے اگر عوام میں پذیرائی حاصل ہوئی یا اس کا کوئی اپنا حلقہ اثر بن گیا تو بالعموم ایسے لوگ دین کے صراط مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں سوائے اس کے کہ اس کی زمام فکر کسی ایسے محقق متدین عالم کے ہاتھوں میں ہو جس کو رسوخ فی العلم حاصل ہو، ماضی قریب میں اس کی کئی ایک مثالیں نگاہوں کے سامنے ہیں اگر دینی حلقوں کے لوگوں نے ان کو اپنا رہنما بنالیا تو ہمیشہ تلخ نتیجہ نکلتا ہے۔

مولانا نعمانی شدت دین پسندی اسلام کے تحفظ وبقاء کے جذبے سے سرشار ہونے کی وجہ سے مودودی صاحب کے حلقہ میں آگئے اور آپ کی زندگی کے چند بیش قیمت سال ضائع ہوگئے جس کا مولانا موصوف کو ہمیشہ افسوس رہا۔

خدمت دین کی نئی راہیں:

انتہائی دلی صدمہ اور روحانی کرب جھیل کر آپ نے بعجلت تمام جماعت اسلامی سے قطع تعلق کرلیا، دین میں ایک نئے فرقہ کے وجود میں آنے اور دین میں تحریف کی جسارت کرنے والوں کو آپ کی ذات سے سہارا ملا اس سے آپ کو جو ذہنی اذیت پہنچی اس کی تلافی کے لئے سب سے پہلے انابت الی اللہ اور اعلان براءت کرکے صدق دلی سے توبہ کی اور مستقبل کے لئے ایک نیا لائحہ عمل اختیار کیا۔

مولانا نعمانی اس دور کے مشہور بزرگ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت متأثر تھے آپ نے ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی حضرت رائے پوری نے بیعت کے بعد آپ کو بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی طرف رجوع کرنے اور ان کی خدمت میں حاضری کے لئے

تاکید فرمائی، شاید اس میں راز یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے تعلق سے جو روحانی کرب اور دینی وفکری زخم لگے ہیں ان زخموں کا مداوا اس طرح ہو جائے گا، مولانا نعمانی پہلی فرصت میں بستی نظام الدین دہلی اس وقت حاضر ہوئے جب مولانا الیاس صاحب بستر علالت پر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے انہوں نے اس حالت میں بھی مولانا نعمانی کا کھڑے ہو کر استقبال کیا اور فرمایا کہ میں انشاء اللہ اس بیماری سے اچھا ہو جاؤں گا اور مولانا نعمانی سے وعدہ لیا کہ کچھ وقت جماعت میں لگائیں گے، آپ نے وعدہ کرلیا، قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید سچ مچ مولانا الیاس صاحب اس تشویشناک بیماری سے صحت یاب ہو گئے، مولانا نعمانی پہلی باران کے ساتھ موات کے سفر میں گئے پھر کچھ دنوں بعد مولانا کاندھلوی نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ کا سفر کیا اس جماعت شریک ہونے کے لئے مولانا نعمانی بریلی سے لکھنؤ پہنچے اور ان کے ساتھ رہ کر پوری دیدہ ریزی کے ساتھ جماعت کے کاموں اور اصولوں کو دیکھا اور اس کے طریقہ کار کا گہرا مطالعہ کیا جب دل اس طریقہ کار کی افادیت پر مطمئن ہو گیا تو پوری بصیرت اور انشراح قلب کے ساتھ بقیہ زندگی دعوت وتبلیغ کے لئے وقف کر دی اور اپنے رسالہ الفرقان کو دعوت وتبلیغ کے لئے خاص کر لیا آپ نے اس سلسلہ میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی مقدس راہ میں صرف کرتے رہے یہاں تک کہ آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔

مولانا نعمانی کی مومنانہ فراست:

مولانا نعمانی کا دل داعیانہ جذبات کا امین اور متکلمانہ اوصاف سے متصف تھا، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے اپنے اپنے حلقے ہیں اور پھر مسلمانوں میں مختلف الخیال درجنوں فرقے اور گروہ ہیں ایسے ماحول میں اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ باقی رکھنا دین کا درد رکھنے والے ہر عالم دین کا فریضہ ہے زمانہ کی نبض پر ان کی انگلیاں رکھے رہنا ضروری ہے اگر بروقت علماء حق نے تیقظ

و بیداری کا ثبوت نہیں دیا تو بہت ممکن ہے اسلام نئے فتنوں کا شکار ہو جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان ذہنی وفکری اعتبار سے غلط راہوں پر چل پڑے گا۔

ماضی قریب میں ایران کے اندر خمینی اوران کے ہم نواؤں نے رضا شاہ پہلوی کی خاندانی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اس کو تہس نہس کر کے عوامی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی، حکومت کی اس تبدیلی کو خمینی نے اسلامی انقلاب کا نام دیا حالانکہ ایران کی حکومت ایک شیعہ خاندان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے شیعوں کے ہاتھوں میں آئی تھی، دونوں ایک سرزمین میں رہنے والے، اس کے آب ودانہ پر پرورش پانے والے، دونوں شیعی مسلک کے پابند اور وفادار، دونوں اپنے مسلک میں متشدد، دونوں ایک ذہن ومزاج اور ایک عقیدہ ومسلک کے ماننے والے، پھر ایک کے ہاتھ سے دوسرے نے حکومت چھین لی ایک شیعہ حکمراں گیا دوسرا شیعہ حکمراں آیا پھر یہ اسلامی انقلاب ہو گیا؟ شد و مد کے ساتھ اس کا پروپیگنڈہ کیوں کیا گیا؟ اس میں ایک گہری اور دوررس سازش تھی، جس کی تہ تک آسانی سے پہنچنا مشکل تھا، خمینی اوران کے ہم نواؤں کے ذہن میں کچھ خفیہ مقاصد تھے، جس کو بہت دیر میں سمجھا گیا، اسی وجہ سے امام خمینی اوران کے ہم نواؤں نے اس تبدیلی حکومت کو ''اسلامی انقلاب'' کا نام دے کر اتنے بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا کہ ایران تو ایران خود ہندوستان میں اچھے خاصے پڑھے لکھے، اچھے مصنف اوراہل قلم، اچھے واعظ اور مقرر شیعہ نہیں، اہل سنت والجماعۃ کا ایک مقتدر طبقہ سازش کا شکار ہو گیا اوراس کو اسلامی انقلاب کہہ کر اس نئی حکومت کے ہر اقدام کو اسلام کی بالا دستی کا نام دیکر اس کی ہم نوائی کرنے لگے، ایسے کئی اہل علم کے نام میرے ذہن میں ہیں جن کا تعلق جماعت دیوبند سے تھا، انھوں نے اس شیعہ حکومت کی ہندوستان میں تائید وحمایت ہی نہیں کی بلکہ عالمی پیمانے پر اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا، اورشیعہ سنی مکمل اتحاد کا مشورہ دینے لگے حکومت کے اقدامات پر اس کو مبارکباد دینے لگے، نئی شیعی حکومت نے ہندستان کے بہت سے علماء اہل سنت والجماعۃ اور ممتاز افراد کو دعوت دے کر ایران کی سیر

وسیاست کے لئے مدعو کیا اور ایسے مناظر دکھائے کہ وہ واپس آکر ایران کے اسلامی انقلاب کے فضائل ومناقب بیان کرنے میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے لگے، فضا ایسی بن گئی جیسے سچ مچ ایران سے اسلامی انقلاب کا آغاز ہوکر سارے عالم میں برپا ہو جائے گا، کسی نے خمینی کے عقائد وخیالات اور جذبات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

خمینی صاحب کا ایران کی حکومت پر قبضہ کو اسلامی انقلاب کا نام دینے کا واحد مقصد امت اسلامیہ کے سواد اعظم اہل سنت والجماعۃ کے دلوں میں رافضیوں اور شیعوں سے متعلق ایک نرم گوشہ پیدا کرنے کی ایک خفیہ سازش تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ اب تک امت کا سواد اعظم شیعوں اور رافضیوں سے انتہائی دوری رکھتا ہے وہ چاہتے تھے کہ یہ دوری اور علیحدگی ختم ہوتا کہ امت کے سواد اعظم میں گھس کر شیعیت کا فروغ دینے کا ایک چور راستہ تلاش کرلیا جائے اس مقصد میں جزوی طور پر کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئے جیسا کہ افریقہ سے ایک ہندوستانی عالم نے ہندوستانی خبریں بھیجیں انہوں نے بتایا کہ ایرانی انقلاب کے بعد ایران کے کچھ نمائندے یہاں آئے اور انہوں نے یہاں شیعی سنی اتحاد کے لئے ایک تنظیم قائم کی اور پھر بتدریج اس تنظیم کے ذریعہ انہوں نے شیعیت کے فروغ کی کوشش جاری رکھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری تنظیم اور اس کا حلقہ اثر پورا کا پورا شیعہ ہوگیا جبکہ وہ سب کے سب اہل سنت والجماعۃ کے لوگ تھے، سب نے اجتماعی طور پر شیعیت قبول کرلی۔

مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اس فتنہ کے دوررس نتائج کو پہلے ہی مرحلہ پر سمجھ گئے اور انہوں نے اسی موضوع پر ایک معرکہ الآرا مدلل ومستند کتاب لکھ کر امام خمینی کی تحریروں سے ان کی اندرونی سازشوں کو بے نقاب کردیا، اس کتاب نے ہندوستان کی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی کی، ذہن ومزاج اور غور وفکر کے رخ کو بدل کر رکھ دیا، کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر جہاں یہ چاہا کہ ہندوستان کے مسلمان اس سازش کو سمجھ کر ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب کہنے اور ماننے کی غلطی سے بچ جائیں

وہیں آپ کی خواہش تھی کہ عالم اسلام کے علماء کو بھی اس حقیقت سے آشنا کر دیا جائے اور کتاب کا عربی ترجمہ کر کے اسلامی ممالک کے علماء تک پہنچا دیا جائے لیکن قانونی پابندیوں سے مجبور ہو گئے لیکن اس کتاب کا پورے ملک پر اثر ہوا اور جو اہل علم اس دام فریب کے شکار تھے وہ بہت جلد سنبھل گئے اور ان کو اپنی غلطی کا بہت جلد احساس ہو گیا، بعد کے حالات نے مولانا نعمانی کے موقف کی حرف بحرف تائید کر دی، اس کے بعد آپ نے ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے ممتاز علماء شیعوں اور رافضیوں سے متعلق ایک متفقہ فتویٰ شائع کر کے حجت تمام کر دی۔

تصانیف:

مولانی نعمانی نے دین کی خدمت کی جو راہ اختیار کی اس میں زبان وقلم دونوں سے ہمیشہ کام لیا، دس سالہ مناظروں کے دور میں آپ نے الفرقان رسالہ محض اسی خیال سے جاری کیا تھا مختلف فیہ مسائل پر مدلل اور بصیرت افروز مضامین شائع کئے جائیں گے، چنانچہ اس دور کے الفرقان میں اس عہد کے تمام مسائل پر سیر حاصل اور اطمینان بخش بحثیں مولانا موصوف کے قلم سے ملیں گی اور انہیں مسائل پر آپ نے درجنوں مستقل کتابیں بھی تحریر فرمائیں، اور سب اسی زمانہ میں شائع ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں اور ان کے بہترین ثمرات ونتائج بھی برآمد ہوئے، الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر اپنے تحقیقی وتفصیلی مضامین کے لحاظ سے ایک مثالی نمبر تھا اتنی تفصیل وتحقیق حضرت مجدد الف ثانی کی زندگی اور ان کے کارناموں، اکبر کی بے راہ روی وگمراہی، ابوالفضل اور فیضی کے سیاہ کرتوتوں کی یکجا طور پر آپ کو سوائے الفرقان کے اور کہیں نہیں ملے گی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نمبر بھی اپنے مواد اور مضامین کے اعتبار سے ممتاز اور منفرد ثابت ہوا، مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی پر آپ کی کتاب علم وتحقیق کا شاہکار ہے بریلوی فرقہ کی پھیلائی ہوئی تہمت تراشیوں اور اتہام پردازیوں کی مدلل تردید اور شاہ صاحب کی اصلاحی تحریک کی اہمیت وعظمت کو تاریخی حقائق کی روشنی میں

پیش کیا گیا ہے، محمد بن عبدالوہاب کو بھی ایک بدنام مصلح کے طور پر ہندوستان میں بریلوی فرقہ نے پیش کیا مولانا موصوف کی کتاب نے غلط فہمیوں کی تردید کی اور بدگمانیوں کی ایک ایک تہ کو کھول کر سامنے پیش کر دیا ہے اور حقیقت قارئین کے سامنے آجاتی ہے، آخری دور میں خمینی اور اس کے نام نہاد اسلامی انقلاب پر مولانا ہی کی پہلی کتاب ہے جس نے حقائق سے پردہ اٹھایا جس کو پروپیگنڈے کی دبیز ریشمی چادروں میں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی، اور بہت سے اہل علم کی نگاہیں ظاہر کو دیکھ کر دھوکا کھا گئی تھیں، مولانا موصوف کی دقیقہ رس نگاہ نے تہ در تہ حقیقت کو پالیا اور اس کو علیٰ رؤس الاشہاد پیش کر کے مسلمانوں کو بہت بڑے فریب اور سازش سے بروقت متنبہ کر کے بچالیا۔

مولانا موصوف کی جماعت اسلامی سے وابستگی فکر و نظر کی ایک لغزش تھی، آپ نے ابتداء سے انتہاء تک کی کہانی جزئی تفصیلات کے ساتھ پیش کر کے صورتحال کو آئینہ کر دیا، اس کتاب کو پڑھ کر مولانا مرحوم کے اخلاص، دیانتداری، صداقت و دیانت کے اس بلند مقام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو خدا کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا اور آپ کی دینی خدمت کے بے پناہ جذبات کا یقین ہو جاتا ہے، آپ نے بلا خوف لومۃ لائم پوست کندہ حالات، ہر بات کو واضح لفظوں میں بیان کر کے علماء اسلام کی حق پرستی کی روایت کو روشن اور تابناک بنایا۔

زندگی کے اخیر دور میں جب آپ نے دین کی اشاعت اور دعوت و تبلیغ کے لئے اپنی ذات کو وقف کر دیا تھا اس دور میں آپ نے کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کرائیں ''اسلام کیا ہے؟'' ''قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟'' دین وشریعت'' جیسی کتابیں جو بلاتکلف جو ہر متلاشی حق غیر مسلم کے ہاتھ میں دی جاسکتی ہیں ان کتابوں میں اسلام کو بہت ہی سادہ لفظوں میں پیش کیا گیا ہے کہ ہر انصاف پسند انسانیت دوست غیر مسلم کے دل میں اسلام کی عظمت وصداقت جاگزیں ہوسکتی ہے۔ آپ کی ایک اہم ترین کتاب ''معارف الحدیث'' ہے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کتاب میں احادیثِ نبوی کی ایسے دلنشیں انداز میں تشریح کی گئی ہے کہ دل

اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے چونکہ مولانا کو علم حدیث سے گہری مناسبت تھی، آپ کا مطالعہ وسیع تھا، حدیث آپ نے علامہ انور شاہ کشمیری سے پڑھی تھی اس لئے فہم حدیث کا ذوق اور مزاج بن گیا تھا ایک بار تو جب ندوۃ العلماء میں اس کے شیخ الحدیث شاہ حلیم عطار کی جگہ خالی ہوئی تو ارباب ندوۃ نے اصرار کر کے آپ کو بخاری ومسلم کا درس دینے پر مجبور کیا آپ نے اپنی مصروفیت کا عذر کر کے ایک کتاب مسلم شریف کا درس اپنے ذمہ لے لیا اور تقریباً دو سال آپ نے اس کا درس دیا تھا حدیث سے اتنی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے معارف الحدیث ایک قابل قدر تصنیف بن گئی ہے ان کے علاوہ کئی درجن کتابیں مختلف موضوعات پر آپ کے قلم سے نکلیں، بعض بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکلے جو کتابوں کی مقبولت کی دلیل ہے باطل فرقوں کے سلسلہ میں آپ کا قلم ہمیشہ خارا شگاف ثابت ہوا ہے اس کی شہادت کے لئے مختلف فرقوں سے متعلق چھوٹے بڑے بہت سے رسالے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

سیاسی مسلک:

مولانا سیاست سے عملاً دور رہے لیکن ذہنی وفکری اعتبار سے وہ جمعیۃ علماء سے وابستہ تھے اور جمعیۃ کے اکابر سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے اسی تعلق کی وجہ سے ۱۹۳۷ء میں انہوں نے جمعیۃ کے ایک نمائندے کی حیثیت سے ایک تاریخی اور مثالی کردار ادا کیا جمعیۃ علماء سے ہمارے بعض اکابر خوش نہیں تھے کہ وہ کانگریس کی حمایت کر رہی ہے انہیں بزرگوں میں حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ بھی تھے مولانا نعمانی نے ان کو جمعیۃ سے قریب کرنے کے لئے ایک بڑا ہی جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔

۱۹۳۷ء میں صوبوں میں محدود اختیارات کی کانگریس حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اس کی وجہ سے اب پورے ملک کو یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستان مستقبل قریب میں آزاد ہو کر رہے گا اب ہندوستان کی آزادی کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جمعیۃ علماء کے مفکرین کو اندیشہ تھا کہ ہندوستان میں حکومت جمہوری ہوگی، زمام حکومت کانگریس

والوں کے ہاتھ میں ہوگی، مسلمانوں کے مسائل کا تعلق انہیں کانگریس رہنماؤں سے ہوگا جو اس وقت حکومت کی کرسیوں پر بیٹھے ہونگے مسلمان اقلیت میں ہیں اس لئے ان کے نمائندوں کی تعداد بھی بہت محدود ہوگی اس لئے کوئی ایسا نظام مرتب کیا جائے کہ جس کی وجہ سے ہم کانگریس پر اثر انداز ہوسکیں اور ان سے طاقت کے بل پر مسلمانوں کے مسائل حل کرائیں اس کے لئے ایک خاکہ ''نظام ملت'' کے نام سے بنایا گیا اور طے یہ کیا گیا کہ اس کی عام ممبر سازی ہو اور تمام مسلمانوں کو ممبر بنایا جائے جو اس تنظیم کا ممبر ہو لازمی طور پر وہ کانگریس کا بھی ممبر ہو اور جمعیۃ سے بھی وابستہ رہے اس طرح جب ہم لاکھوں ممبروں کی طاقت اپنے ساتھ رکھیں گے تو کانگریسی حکومت پر پورے طور پر اثر انداز ہوسکیں گے ہمارے مسائل سے ان کو انحراف کی ہمت نہ ہوگی، مولانا نعمانی جمعیۃ کے اس فارمولہ کو لے کر حضرت تھانویؒ کی خدمت میں گئے اور تفصیلی گفتگو کی حضرت تھانوی آپ کی گفتگو سے مطمئن ہو گئے اور فرمایا کہ تجویز بہتر ہے میرا دل اس کو قبول کرتا ہے آپ دوبارہ پھر ملیں تاکہ میں بھی کچھ سوچ لوں، مولانا دوبارہ حاضر خدمت ہوئے حضرت تھانوی نے انشراح قلب سے اس تجویز کو منظور کر لیا البتہ یہ فرمایا کہ میں اپنے کچھ آدمیوں کو ایک دن بلاؤں آپ ان کے سامنے بھی اسی تفصیل سے گفتگو کریں اور ان کو بھی ہم خیال بنالیں تو اس کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن جب تیسری بار مولانا موصوف ملے تو حضرت تھانوی کی مجلس میں تین بزرگ اور بھی تھے مولانا نعمانی نے ان کو بھی تفصیل سے خاکہ سمجھایا، اس کی افادیت بتائی مگر ان میں سے ایک بزرگ نے جو حضرت تھانوی سے بہت قریب تھے اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور حضرت تھانوی سے بھی کہا کہ حضرت ابھی اس کا اعلان نہ فرمائیں، مولانا نعمانی بے نیل ومرام واپس آئے اور چند ہی دنوں بعد حضرت تھانوی کی طرف سے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان آ گیا، مولانا نعمانی کی ساری جدوجہد رائیگاں چلی گئی، مولانا نعمانی نے سیاست سے ایک دم کنارہ کشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

مقبولیت اور اعزاز و اکرام:

مولانا نعمانی کی دینی خدمات کو پورے ملک میں حسن قبول حاصل ہوا، اکابر علماء ملت کا آپ کی ذات پر اعتماد بڑھتا چلا گیا، صف اول کے علماء کی مجلسوں میں آپ کو اعزاز و احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا، اور موثر تنظیموں نے آپ کو اپنا رکن بنایا، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ ہمیشہ ملک کے مایۂ ناز اور ممتاز علماء پر مشتمل ہوتی رہی ہے اور ایسی ہی شخصیت کو منتخب کیا جاتا تھا جس کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، تدبر و فراست اور اس کی دینی خدمات کی اہمیت کو پورا ملک تسلیم کر چکا ہو اور اس کی قومی و ملی جدو جہد کو بہ نظر استحسان دیکھا جاتا ہو، تب اربابِ مجلس شوریٰ دارالعلوم اس شخصیت کو مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کرتی ہے، ۱۹۴۴ء میں جب مولانا نعمانی نے جماعت اسلامی سے قطع تعلق کر کے اس کا اعلان فرما دیا اور دعوت و تبلیغ کے مقدس مشن میں لگ گئے تھے تو ایک دن مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء ہند و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے بتایا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے آپ کو اپنا رکن منتخب کر لیا ہے، انتخاب علماء دیوبند کا آپ کی ذات پر مکمل اعتماد اور آپ کے شاندار اور عظیم الشان دینی کارناموں کا عملی اعتراف تھا اس وقت سے لے کر تا زندگی تقریباً ۵۳ سال تک مسلسل آپ مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور کئی اہم ترین مسائل میں نازک موڑ پر آپ نے دارالعلوم کی عزت و وقار کو چار چاند لگائے اور انتشار سے بچایا بعض موقوں پر تو آپ نے مثالی اور تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

عالم اسلام کے مسلمانوں کی تنظیم ''رابطہ عالم اسلامی'' کی بنیاد ۱۹۶۲ء میں پڑی جس کا صدر دفتر مکہ مکرمہ میں تھا، رابطہ کے قیام کے تیسرے سال ۱۹۶۴ء میں مولانا نعمانی کو بھی اس کا ممبر بنا لیا گیا اس طرح ہندوستان کے دو مشہور عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی اس کے رکن ہو گئے اس تعلق کی وجہ سے عالم اسلام کے مسائل سے آپ کو سابقہ پڑا اور قدرت کو آپ سے جو خدمت لینی تھی لی اور ہر سال حج

وعمرہ کی سعادت اس پر مزید انعام خداوندی تھا اسی لئے مولانا نعمانی کے حج اور عمروں کی صحیح تعداد بتانی بھی دشوار ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے عائلی وسماجی قوانین جن کو رائج اصطلاح میں "مسلم پرسنل لا" کہا جاتا ہے اس کی حفاظت وبقا کا مسئلہ آزادی کے بعد بڑی اہمیت کے ساتھ ابھرا اور مختلف طرح کے اندیشوں نے مسلمانوں کو گھیر لیا۔

اور کئی بار اس سلسلہ میں مسلمانوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جب بار بار اس راہ میں رکاوٹیں آئیں تو اکابر ملت نے ایک تنظیم کی ضرورت محسوس کی یہ تنظیم "مسلم پرسنل لا بورڈ" کے نام سے بعد میں قائم ہوگئی اس تنظیم کے تاسیسی ارکان میں مولانا مرحوم کا اسم گرامی شامل ہے آپ اس تنظیم کے قائم کرنے والوں میں تھے، زندگی کے اخیر لمحات تک آپ اس کے رکن رہے۔

زندگی کا آخری دور:

میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک پورے چار سال لکھنؤ میں رہا وہیں مولانا مرحوم کی دید وشنید حاصل ہوئی اور کبھی کبھی سلام ومصافحہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی بعض معاملوں میں ایک دوبار مولانا کے گھر پر بھی حاضری دی مولانا مجھ سے واقف نہیں تھے البتہ غائبانہ میرا نام جانتے تھے جیسا کہ مولانا محمد عارف صاحب سنبھلی مدظلہ نے بتایا کہ جب ہماری کتاب مولانا موصوف کو دی اور مصنف کا تعارف کرانا چاہا تو مولانا نے فرمایا کہ میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں، غائبانہ تعارف کا واقعہ یہ ہوا کہ جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا تو ایک مشہور عالم نے اکبر کی گمراہی کا واحد ذمہ دار ابوالفضل اور فیضی دونوں بھائیوں کو ثابت کیا، میں اس سے متفق نہیں تھا، میں نے ایک مضمون لکھا جس میں میں نے فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ذمہ دار ملّا عبدالقادر بدایونی، ملا عبداللہ سلطان پوری اور ملا عبدالنبی کو بھی قرار دیا جو اکبر کے دربار سے وابستہ تھے اور فیضی اور ابوالفضل کے جرم کو کچھ ہلکا دکھانے کی کوشش کی تھی

مضمون اشاعت کے لئے الفرقان کو بھیج دیا مولانا میرے مضمون سے متفق نہیں تھے لیکن الفرقان میں شائع کیا البتہ مضمون سے پہلے آٹھ صفحوں کا نوٹ لکھا، پھر اس کے بعد میرا مضمون اور پھر مضمون کے خاتمہ پر تین چار صفحوں کا استدراک، میرے مضمون کو دونوں طرف سے گھیر کر پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا، میں طالب علم مولانا عالم بے مثال کچھ کہنے کی میری جرأت کہاں؟ میرے لئے یہی کیا کم تھا کہ مولانا نے میرے مضمون کو درخور اعتنا سمجھا، اسی مضمون کی وجہ سے مولانا مجھ سے غائبانہ واقف تھے مولانا سے بالمشافہہ ایک دو بار ملنے کے باوجود میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا، بس ایک ارادتمند کی طرح کبھی کبھی سلام ومصافحہ کی سعادت حاصل کر لیا کرتا تھا البتہ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں چار سالوں تک آپ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت ملی، میری قیام گاہ سے چند قدموں کے فاصلہ پر مرکز کی مسجد تھی جس میں آپ جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے دو رکعت نماز جو چند منٹوں میں ادا ہو جاتی تھی اس کا تاثر آج تک میرے دل میں موجود ہے مولانا پر خوف وخشیت الٰہی کا غلبہ تھا آپ کے خشوع وخضوع اور استغراق کا عالم دیدنی ہوتا تھا قرأت کرتے ہوئے آپ کی آواز شدت گریہ سے بھرا جاتی تھی، ترغیب وترہیب کی آیتوں پر ہچکیاں بندھ جاتیں تھرتھراتے ہونٹوں اور کپکپاتی ہوئی زبان سے الفاظ قرآنی کی ادائیگی اور اس پر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آپ کی غمناک آواز ایسی کیفیت پیدا کرتی تھی کہ خود میری آنکھیں بھر آتی تھیں، طویل علالت کے باوجود دماغ برابر کام کرتا رہا یادداشت صحیح تھی بہت سی تحریریں جو بعد میں شائع ہوئیں اسی معذوری کے زمانہ میں املا کرائیں، بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نعمانی زندگی کی آخری سانس تک دین کی خدمت پوری قوت ایمانی کے ساتھ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اس مجبوری میں بھی جب اپنی ضرورتوں کے لئے بھی زبان کو جنبش دینی دشوار تھی دین وشریعت کی سرفرازی اور سربلندی کے لئے کام کرتے رہے۔

ذلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء، اللّٰهم اغفر وارحم وانت خير الراحمين

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

چند یادیں اور چند باتیں

ایک بزرگ، کشیدہ قامت، دبلے پتلے، رنگ صاف، روشن چہرہ سر اور ڈاڑھی کے بال ایک دم سفید، صاف شفاف سفید لباس میں ملبوس ایک کمرے میں تن تنہا بیٹھے ہوئے ہیں ان کی چاروں سمت عرب ممالک سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل بکھرے ہوئے ہیں، ان کے ایک ہاتھ میں اسٹیل کی ایک چھوٹی سی قینچی ہے، سامنے ڈیسک پر ایک عربی رسالہ کھلا ہوا ہے اور انتہائی انہماک سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں، دوران مطالعہ کبھی کبھی وہ قینچی سے رسالہ میں سے آدھی انچ کی ایک چٹ کاٹ لیتے ہیں، ان کی داہنی جانب لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس ہے اس پر عربی کے حروف تہجی لکھے ہوئے ہیں، ان حروف کے نیچے ایک انچ کا لمبا سوراخ ہے، وہ چٹ کسی سوراخ میں ڈال دیتے ہیں، اسی طرح وہ تمام رسالوں اور اخباروں پر عمل جراحی یکے بعد دیگرے کررہے ہیں، برسوں سے ان کا یہ دلچسپ مشغلہ ہے۔

یہ بزرگ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تکمیل ادب کے استاد، جدید عربی ادب اور عربی صحافت کے امام مولانا وحید الزماں کیرانوی ہیں جو جدید عربی کی تصنیف وتالیف میں مصروف ہیں لیکن اس تصنیف کا آغاز قلم کے بجائے قینچی سے کیا جارہا ہے۔

کوئی بھی اہم منصوبہ اور شاندار کارنامہ جنون کی حدوں تک پہنچی ہوئی جدو جہد کے بغیر وجود میں نہیں آتا، دنیا کی دلچسپیوں سے صرف نظر کرکے مکمل یکسوئی اور انہماک ہی کامیابی کی کلید ہوتی ہے، قیس ریگستان میں ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے اور سر دھن رہا ہے لوگوں نے اس کو دیوانہ کہا چھیڑنے کے لئے پوچھا اس کڑی دھوپ میں کیا فضول کام کررہے ہو؟

گفت ما مشق نام لیلیٰ می کنیم

کمال عشق کے لئے دیوانگی ضروری ہے کچھ ایسا ہی منظر مولانا کیرانوی کے انہماک کا ہے، برسہابرس کی شبانہ روز کی جاں گسل جدوجہد کے بعد جدید عربی کی تین لغتیں مرتب کیں جو ہندوستان اور پاکستان میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی لغتیں ہیں، آج یہ لغتیں تمام مدارس اسلامیہ اور جدید علوم کی یونیورسٹیوں کے شعبہ عربی کی لائبریریوں میں موجود ہیں ان کے بغیر جدید عربی صحافت کے میدان میں کوئی ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرتا، رہنما کے بغیر سفر کیسے ممکن ہے؟۔

ہندوستان میں جدید عربی ادب وصحافت کی اشاعت کا صرف ایک ہی مرکز تھا اور دارالعلوم دیوبند جس کو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم وتدریس کی عظیم خدمات کی وجہ سے از ہر ہند کہا جاتا ہے، اس کا جدید عربی ادب وصحافت کی نشر واشاعت میں موئی قابل ذکر حصہ نہیں تھا، مولانا کیرانوی نے اس کمی کو محسوس کیا اور جب وہ دارالعلوم آئے تو انہوں نے جدید عربی ادب وصحافت کی ترویج کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنالیا، اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں آپ نے ایک کتاب تین حصوں میں **''القراءة الواضحه''** کے نام سے لکھی لیکن قدیم طرز تدریس سے وہ غیر مطمئن تھے اس لئے انہوں نے ان تینوں حصوں کی الگ الگ ''دلیل'' بھی لکھ کر شائع کی تا کہ اساتذہ اسی انداز پر اس کتاب کو پڑھائیں، آج موصوف کی یہ کتاب اکثر مدارس اسلامیہ اور کئی یونیورسٹیوں کے شعبہ عربی کے نصاب میں شامل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

مولانا کیرانوی قدرت کی عطا کردہ حیرتناک صلاحیتوں کا ایک دلنواز پیکر تھے، نیت کے سچے، دھن کے پکے، جدو جہد ان کا مزاج، اخلاص ان کا جو ہر ذاتی دماغ اولوالعزمانہ منصوبوں اور اسکیموں کا خزانہ، اپنی ہر اسکیم اور ہر منصوبہ میں انتہاء پسند، آغاز وانجام میں ان کے نزدیک کچھ زیادہ فاصلہ نہیں رہتا تھا، جس کام کا آغاز کرتے پوری دھوم دھام سے کرتے اور انجام تک پہنچ جانے کا حوصلہ رکھتے عملی جدو جہد کا کوئی

بھی خا کہ بناتے تو اس میں رنگ بھرنے میں پے در پے ناکامیاں بھی ان کا حوصلہ پست نہیں کرسکتی تھیں، ان کو نچلا بیٹھنا آتا ہی نہیں تھا وہ ایک سیماب صفت انسان تھے، انہیں جب احاطۂ دارالعلوم میں باریابی کا موقعہ ملاتو پہلے ہی مرحلہ پر انہوں نے سوچا کہ جدید عربی صحافت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، دارالعلوم کے طلبہ کی اس سے محرومی ان کی آنکھ کا کانٹا بن گئی انہوں نے عزم بالجزم کرلیا کہ وہ اس سمت میں طلباء دارالعلوم کی مکمل رہنمائی کر کے ان کو منزل تک پہنچا کر رہیں گے اور انہوں نے کام کا آغاز کردیا، اس منصوبہ میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں تھا وہ تن تنہا اس مہم کو سر کرنے کے لئے چل پڑے اس مرحلہ پر ان کی سیمابی فطرت کا مظاہرہ ہوتا ہے انہوں نے طلبہ کی اصولی رہنمائی کرنے کے بعد سارا بار طلبہ پر ڈال دیا، وہ اپنے ذہن سے سوچیں، غور وفکر کی عادت ڈالیں اپنی فطری ذہانت سے پورا پورا کام لیں اور قدرتی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں الفاظ کو ذہن نشین کریں، عربی تعبیرات کو حافظہ میں محفوظ کریں، ادب کے ابتدائی درجات کے طلبہ میں ایک کو سائل اور دوسرے کو مجیب مقرر کرکے درس میں کھڑا کر دیتے کہ وہ سبق کے سارے الفاظ اور ساری تعبیرات کو برجستہ زبانی سوال و جواب میں ظاہر کریں، منتہی طلبہ کو عنوان دیدیا کہ اس عنوان پر لکھ کر لائیں، ان کا وقت مقرر کر دیا گیا جوں ہی وقت مقررہ ختم ہو گیا، کاپیاں ان کے ہاتھوں سے لے لی گئیں اگر کسی نے صرف ایک دوسطر لکھ کر چھوڑ دیا ہے، لاپرواہی کا ثبوت دیا ہے تو ان کا چہرہ فرط غضب سے سرخ ہو جاتا اور اس برہمی کی حالت میں جب اس کو عربی لب ولہجہ میں لتاڑتے تو یہ منظر قابل دید ہوتا، ایک تیز وتند آبشار کی طرح الفاظ ان کی زبان سے نکلتے اور اتنی روانی سے بولتے جیسے منہ زور سیلاب رواں دواں ہے، اس وقت جدید عربی میں مہارت اور عربی تعبیرات پر ان کی وسیع نگاہ اور مکمل واقفیت کا پتہ چلتا تھا، یہ ان کا طلبہ کے ساتھ رویہ تھا جنہوں نے اپنے ذہن پر زور نہیں ڈالا، سہل انگاری سے کام لیا اور جن طلبہ نے پورا مضمون لکھ دیا ہے ان کی کاپیاں جانچتے ہوئے توصیفی کلمات ان کی حوصلہ افزائی کے لئے کہتے جاتے، اچھا

لکھا ہے لیکن یہ جملہ ایسے لکھ دو تو بہتر ہے، یہ جملہ بدل دو تو عبارت خوبصورت ہو جائے گی، تعریف کرتے جاتے الفاظ، جملے اور سطر کی سطر کٹتی جاتی، کوئی سطر ایسی نہیں بچتی جو نوک قلم سے مجروح نہ ہوئی ہو لیکن طالب علم کی توصیف وتحسین کا سلسلہ بھی جاری ہے تاکہ حوصلہ بلند رہے، وہ جانتے تھے کہ بیجا سختی، اور حوصلہ شکنی انسانی صلاحیتوں کے ابھرنے کی راہ میں کبھی کبھی سنگِ گراں بن جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انتہائی انہماک میں طلبہ پسینہ پسینہ ہو جاتے مگر تعمیل حکم میں غور وفکر کا کوئی پہلو سہل نگاری سے کام لے کر چھوڑتے نہیں تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی تھی، غلطیاں تو عمر کے تقاضے کے زیر اثر ہوتی ہی ہیں لیکن ان غلطیوں پر ان کو ندامت اور شرمندگی نہیں ہوتی تھی، بس اتنا ہوتا کہ وہ سمجھتے کہ ذرا اور غور وفکر سے کام لیا ہوتا تو یہ غلطی سرزد نہ ہوتی اور مستقبل میں اور بھی غور وفکر سے کام لینے کا ان میں جذبہ پیدا ہوتا۔

اس لگن، محنت اور دل کی تڑپ کے ساتھ وہ طلبہ کو سکھاتے اور پڑھاتے ان کی عتاب آمیز شفقت طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو ابھارنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی تھی ان کے اس طرز تعلیم وتدریس نے جادو کا کام کیا اور حیرتناک نتائج برآمد ہوئے، جس کو دنیا نے دیکھا ان کے طریقۂ تدریس کی مکمل افادیت کا ظہور اس وقت ہوا جب تکمیل ادب کا کورس پورا ہونے کے بعد ایک پوری ٹیم سامنے آئی جدید عربی صحافت کے میدان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے لگی۔

یہ سلسلہ برسہا برس جاری رہا اس مدت میں مولانا کیرانوی کے شاگردوں نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرکے ہندوستان اور پاکستان میں اپنے استاد کا نام روشن کیا، اور دارالعلوم دیوبند کی عظمت میں چار چاند لگادئے، آج وہ عربی اخبارات ومجلّات کے مدیر ہیں، کالم نگار ہیں، عربی کے بہترین فیچر لکھتے ہیں، فی البدیہہ تقریریں کرتے ہیں، اپنی مادری زبان سے بھی کہیں زیادہ روانی کے ساتھ وہ عربی میں مضامین لکھتے ہیں، مولانا کیرانوی کے تلامذہ آج ملک اور بیرونی ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جو اپنے

استاد کے ساتھ اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی سرخ روئی کا باعث اور اس کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔

مولانا کیرانوی سیماب صفت انسان تھے، جدو جہد، تک ودوان کے خمیر میں شامل تھی وہ جس طرف رخ کرتے تھے تو پورے عزم وارادہ اور اپنی فطری توانائیوں کے ساتھ کرتے تھے، پھر اس کام کے لئے اپنا پورا وجود وقف کر دیتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں انقلاب کے بعد نئے نظام میں ارباب مجلس شوریٰ نے ان کو معاون مہتمم بنا دیا، انہوں نے نہ اس کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور نہ اس کے طالب تھے، یہ دارالعلوم کا عبوری دور تھا پورے نظام پر کنٹرول کا مسئلہ ایک اہم ترین مسئلہ تھا، ارباب شوریٰ کی نگاہ میں اس کام کے لئے مولانا کیرانوی سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی، ان کی فطری صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو یہ عہدہ سونپ دیا گیا، اب ان کی ساری توانائیاں اسی محاذ پر صرف ہونے لگیں اور شب وروز نئے نظام کو مستحکم بنانے میں وہ مصروف ہو گئے اور اپنی ساری توانائیاں اس محاذ پر لگا دیں۔

دارالعلوم کی کئی قدیم عمارتیں اَنمل اور بے جوڑ سی لگتی تھیں، بلا وجہ گلیارا، اوپر جانے والے زینے غیر موزوں، چھتیں نیچی اونچی ان باتوں سے عمارت کا حسن مجروح ہوتا تھا اور کئی طرح کی زحمتیں تھیں، مولانا کیرانوی نے سب سے پہلے یہ پلان بنایا کہ ان عمارتوں میں جزوی تبدیلیاں کر دی جائیں تو یہ عمارت مناسب، موزوں اور دیدہ زیب ہو جائے گی، اسی طرح دارالاساتذہ کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی لیکن عملاً منصوبہ بند طریقے سے یہ کام نہیں ہوا، یہ ساری پلاننگ کرنے کے بعد مسئلہ سرمایہ کا پیدا ہوا انہوں نے پہلے ہی مرحلہ پر یہ فیصلہ کر لیا کہ دارالعلوم کے بجٹ پر اس کا بار نہیں ڈالا جائے گا، اس لئے انہوں نے ملک کے دورے کرنے شروع کر دیئے، مختلف مقامات کے سفر کئے ہر جگہ کامیابی ان کے قدم چومتی رہی، اور ہر سفر سے واپسی کے بعد وہ اتنا سرمایہ لے کر دارالعلوم واپس ہوتے تھے کہ تعمیری سلسلہ رکنے نہ پائے، اس دھن میں انہوں نے اپنی کمزور صحت اور بیماری کو بھی پس پشت ڈال دیا، سارا نقشہ

خود ان کا بنایا ہوا، ساری ترمیمات ان کے ذہن کی سوچی ہوئی، اس کے اخراجات کا بھی اندازہ انہیں کو تھا اس لئے اتنے سرمایہ کی فراہمی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی، اس تمام تگ ودو نے چند مہینوں میں ایسا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا کہ ہر وارد وصادر حیرت زدہ رہ گیا، قدیم عمارتوں میں تمام پیوند کاریوں کے باوجود کہیں سے یہ پتہ نہ چلتا کہ قدیم عمارت میں کہیں پیوند کاری کی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس تمام عمارتوں کے تناسب اور موزونیت میں ایک نئی طرح کا حسن پیدا ہو گیا، دارالعلوم کا نظم ونسق ایسا چاق وچوبند ہو گیا کہ اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اساتذہ اپنی درسگاہوں میں اپنے وقت سے پہلے تو آ سکتے تھے تاخیر اب کسی کو پسند نہیں رہی۔

مولانا کیرانوی کا ذہن بہت تیز سوچتا اور فیصلہ کرتا تھا، ان میں قوتِ فیصلہ بدرجہ اتم موجود تھی، کبھی وہ کسی مسئلہ میں حیص بیص کا شکار نہیں ہوتے تھے، سوچا، غور کیا اور فیصلہ کر لیا اور کام کا آغاز کر دیا، وہ جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن اور اس کے شعبہ مرکز دعوت اسلام کے سربراہ تھے، عہدہ قبول کرتے ہی انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کا دائرہ کار متعین کر لیا اور کام کا خاکہ بنا لیا انہوں نے اس شعبہ کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا پلان بنایا۔

وہ جب معاون مہتمم تھے تعمیر کے سلسلہ میں فراہمی سرمایہ کے لئے دورہ کرتے ہوئے بنارس آئے میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا، وہ جامعہ کے مہمان خانے میں قیام پذیر ہوئے، ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تو رفیق مکرم مفتی ابوالقاسم نعمانی نے میرا تعارف کرایا اور میری ایک کتاب کا ذکر کیا جو میں نے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں ''جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار'' کے نام سے لکھی تھی اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے اشاعت کے لئے امداد بھی منظور ہوئی تھی مگر میں نے قبول نہیں کی، انہوں نے مسودہ مانگا، میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا رات میں انہوں نے مطالعہ کیا اور صبح کو چائے پر انہوں نے فرمایا کہ مسودہ مجھے دے دیجئے میں اسے مرکز دعوت اسلام کی طرف سے شائع کرنا چاہتا ہوں اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، میں

نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا اور چار مہینے کے بعد جب ایک کنونشن کے سلسلہ میں میں دہلی گیا تو مولانا کیرانوی نے ایک شخص کے ذریعہ پندرہ نسخے مجھے بھیج دیئے، میں حیرت زدہ رہ گیا، اتنے دن تو کاتب کی خوشامد کرتے کرتے گذر جاتے ہیں، اتنی قلیل مدت میں پونے چار سو صفحات کی کتابت پھر طباعت جلد سازی سارے کام مکمل ہو گئے یہ تھا مولانا کیرانوی کا طریقہ کار، کتاب کافی مقبول ہوئی، اتر پردیش اردو اکیڈمی نے بہت سے نسخے لائبریریوں کو عطیہ دینے کے لئے خریدے، اس سے مولانا کیرانوی نے اندازہ لگایا کہ کاروباری حیثیت سے اس کتاب کی اشاعت مفید ہے اور کچھ میری تحریروں کے بارے میں ان کے تاثرات میری حیثیت سے کچھ زیادہ ہی اچھے تھے ان کو مجھ سے حسن ظن قائم ہو گیا جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

اسی سال جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے ایک اجلاس میں جمعیۃ کی تاریخ مرتب کرانے کا فیصلہ کیا، تاریخ مرتب کون کرے، متعدد نام پیش ہوئے مگر کسی پر اتفاق رائے نہ ہو سکا، آخر میں مولانا کیرانوی نے نہ جانے کس خوش فہمی کی بنا پر میرا نام پیش کر دیا اور پوری کمیٹی نے اتفاق رائے سے منظور کر لیا، مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے کمیٹی کے اس فیصلہ سے مجھ کو مطلع فرمایا اور کہا کہ چھ ماہ کے لئے دہلی آجایئے آپ کو وہاں ہر طرح کی سہولتیں حاصل رہیں گی، میں نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر بنارس میں رہ کر اس کام کو کرنا مناسب سمجھا اور یہی میں نے کہا بھی البتہ میٹر اور مواد کے لئے مرکزی دفتر میں حاضر ضروری ہے اسلئے جب ضرورت محسوس ہوگی میں ہفتہ عشرہ کے لئے دہلی آتا رہوں گا لیکن ترتیب بنارس ہی میں رہ کر ہوگی چنانچہ یہ منظور کر لیا گیا۔

میں نے اسی سال کتاب بڑے سائز کے پانچ سو صفحات میں مرتب کر دی دوسرے سال جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا شیشن ممبئی میں ہونے والا تھا، اب اجلاس کی تاریخوں میں چند مہینے باقی تھے، مولانا کیرانوی نے کتابت کرائی اور پریس میں بھیج دی، اجلاس سے چند دنوں پہلے کتاب آئی بائنڈنگ اور گرد پوش کی تیاری میں یہ دن ختم ہو گئے، اس کی رسم اجرا ممبئی میں ادا کی جانے والی تھی اس لئے بہت بڑی تعداد میں

کتاب ممبئی بھیج دی گئی، حضرت مولانا مدنیؒ کے ہاتھوں اس کی رسم اجراء ادا ہوئی اور اسی دن وہ تمام نسخے فروخت ہو گئے جو ممبئی میں موجود تھے، اجلاس کے کچھ ہی دنوں بعد پورا ایڈیشن ختم ہو گیا تو مولانا کیرانوی نے اب کی بار آفسٹ کی کتابت کرائی جو تقریباً آٹھ سو صفحات میں آئی جب موصوف اپنے دورے کے سلسلہ میں بنارس تشریف لائے تو کتابت شدہ کاپی بھی ہمراہ لیتے آئے میں نے اس پر نظر ثانی اور غلطیوں کی نشاندہی کی جو بعد میں کاتب سے درست کرالی گئیں، ابھی اس کی طباعت کے سلسلہ میں بات چیت چل ہی رہی تھی کہ مولانا کیرانوی جمعیۃ علماء سے علیحدہ ہو گئے، اپنے عہدے کا چارج دیتے ہوئے یہ کتابت شدہ کاپی بھی صدر دفتر کے حوالے کر دی، وہ آج بھی صدر دفتر میں موجود ہے لیکن تاریخ جمعیۃ علماء ہند دوبارہ نہیں چھپ سکی، اس میں کیا راز ہے، مجھے نہیں معلوم۔

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

پہلے میرا اور مولانا کیرانوی کا ذاتی تعلقات کے علاوہ ذہنی وفکری رشتہ بھی ایک تھا، ہم دونوں ہی جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ تھے بلکہ میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو میں جمعیۃ علماء کے اکابر سے ذہنی وفکری طور پر وابستہ تھا، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی جمعیۃ علماء میں کئی بار شکست وریخت ہوئی لیکن میں نے اس کی جانب نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، باری باری کر کے لوگ جمعیۃ سے علیحدہ ہوتے رہے یہ سب میری نگاہوں کے سامنے تھا لیکن میں نے جو راہ پہلے دن اختیار کر لی تھی، آج تک پوری ثبات قدمی سے اس پر قائم ہوں

اہل خرد تو روز بدلتے رہے خدا
ہم اہل عشق جس کے ہوئے اس کے ہو لئے

بعض لوگوں نے مولانا کیرانوی سے میرے تعلقات کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا حالانکہ یہ حیرت کی بات نہیں تھی، یہ بڑی کم ظرفی کی بات ہے کہ برسہا برس سے جس سے تعلقات ہوں اور ہر ایک نے ایک دوسرے کو ہر طرح پرکھا ہوا اتفاقاً ذرا سا ذہنی یا

فکری اختلاف پیدا ہو گیا تو اس اختلاف کی وجہ سے بغض وعناد اور کینہ پروری کو اپنے دل میں جگہ دے دی جائے؟ ہمارے جیسے گوشہ نشین اسی عقیدت واحترام کے ساتھ دونوں فریق سے ملتے رہے، مولانا کیرانوی کو میرے نقطۂ نگاہ سے مکمل واقفیت تھی اور میں خود موصوف کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف تھا لیکن اختلاف کے اس پورے دور میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی اسی بشاشت اسی خوش دلی اور اسی اعزاز واحترام سے ملے جو ہمیشہ مجھے ان کی طرف سے حاصل تھا، کبھی بھی مجھ سے اس اختلاف کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی آئی، مجھے ہمیشہ علمی مشورے دیتے رہے، نئی کتابوں کے لئے موضوع بتاتے رہے میری کتاب کا جب بھی کوئی مسودہ پہنچا بلا تاخیر وہ کاتب کے حوالے ہو جاتا تھا، میرے اوپر ان کو مکمل اعتماد تھا میں ان کے اخلاص سے بہت متاثر تھا، ان کا ہر رویہ ان کی صاف دلی اور خلوص کا مظہر تھا، شرافت، عزت نفس، وضعداری، اخلاص اور حسن سلوک یہ ان کے فطری کمالات تھے اور میں ان کا ہر دم مشاہدہ کرتا رہتا تھا اور

ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس لئے ہمارے درمیان اخلاص ومودت کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔

جن دنوں معاون مہتمم تھے ایک بار جب وہ بنارس آئے تو میں نے بصد ادب عرض کیا کہ آپ انتظامی ذمہ داریوں سے دامن بچالے جاتے تو بہتر ہوتا، انہوں نے بڑے جھٹکے سے پوچھا وہ کیوں؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کے علمی کارناموں کو ہر طرف سراہا جا رہا ہے، آپ کی مرتب کردہ لغتوں نے جو مقبولیت علمی دنیا میں حاصل کی ہے یہ سعادت بہت کم اہل علم کو حاصل ہوتی ہے اگر آپ اسی طرح کے علمی کاموں میں اپنے اوقات لگاتے تو ذہنی سکون بھی رہتا اور آپ کی تصانیف آپ کی دائمی یادگار ہوتیں، پھر انتظامیہ کا کوئی بھی عہدہ جس کے زیر اثر طلبہ اور اساتذہ سب آتے ہوں اس عہدہ پر رہ کر کوئی بھی اپنی عزت سلامت نہیں لیجا سکا، اس شخص کو اس کے حلقہ اثر کا ہدف بننا پڑتا ہے اور جب تک کوئی کام زیر اثر حلقہ کے خلاف نہیں ہوتا وہ خاموش رہتا ہے اور جس

دن ایک معمولی کام بھی اس کے منشا کے خلاف ہوا تو تنقیدوں کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے پھر انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری زندگی کے کارناموں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے جو ذہنی اذیت ملتی ہے وہ اس سے الگ ہے میں اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں میں ان حالات سے گذرا ہوں۔

میری باتیں سن کر وہ خاموش ہو گئے، کچھ سوچا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، تھوڑے ہی دنوں بعد ان کو انتظامیہ سے علیحدہ ہونا پڑا اور انہوں نے اپنی تدریسی ذمہ داری پر قناعت کر لی، لیکن یہ فیصلہ انہوں نے بہت دیر میں کیا، جو چیز بلندی سے گرتی ہے پستی کی طرف آنے کی اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی ہے، معاون مہتمم کے بڑے عہدے سے ہٹ کر چھوٹے عہدے پر قناعت کر لی لیکن جلد ہی تدریسی خدمات بھی چھوڑنے پر مجبور ہوئے، یہی نوشتۂ تقدیر تھا۔

مولانا کیرانوی بڑے وضعدار عالم تھے، جب بہت قریب سے ملتے تب اس کا اندازہ ہوتا ہے وہ اساتذہ ہی کو نہیں طلبہ کو بھی خودشناس بنانا چاہتے تھے، ان کا نظریہ تھا کہ علماء اور طلباء کو اس انداز سے رہنا چاہئے کہ دوسروں کی ان پر حقارت آمیز نظر نہ پڑے دوسروں کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل نہ ہوں اس کے لئے خودشناسی ضروری ہے، خودداری غرور نہیں ایک خوبصورت طرز زندگی ہے۔

من لم یکرم نفسه لایکرم

کو وہ عملی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، ایک بار وہ درسگاہ سے نکلے اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک طالب علم سامنے آ گیا وہ مطبخ سے کھانا لے کر اپنے کمرے جا رہا تھا، ایک ہاتھ میں روٹی دوسرے ہاتھ میں سالن کا کٹورا، آپ اس کی طرف بڑھے اور اس کے ہاتھ سے روٹی اور سالن کا برتن چھین لیا اور فرمایا جاؤ، تم کو کھانا اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک ٹفن کیریر خرید کر نہیں لاؤ گے سائلوں اور فقیروں کی وضع اختیار کرو گے تو دنیا تمہاری کیا عزت کرے گی، تمہارے ہی جیسے لوگ علماء کے وقار کو مجروح کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

مولانا کیرانوی کا مزاج اور سوچنے کا یہ انداز تھا، وہ کہتے تھے کہ غربت اور امارت سے وضعداری میں فرق نہیں آنا چاہیے، دونوں صورتوں میں انسان کو اپنی عزت نفس کو ملحوظ رکھنا چاہیے، احساس خودی انسان کی بہت بڑی دولت ہے، آئینہ میں چمک نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں، تواضع اور خاکساری یہ نہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ورسوا کر دو، وہ چاہتے تھے کہ اساتذہ کے ساتھ دینی مدارس کے طلبہ بھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں، جو شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کے حوصلے مر جائیں گے اس کی امنگیں دم توڑ دیں گی ایسا آدمی کبھی بھی کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا اس کا عزم کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا اس لئے عربی مدارس سے وابستہ ہر ایک کو ایک خوددار انسان کی طرح دوسروں کے سامنے آنا چاہیے۔

مولانا کیرانوی نے تاریخ جمعیۃ علماء کی ترتیب میرے ذمہ ڈالی تو اس وقت میں ''تفسیروں میں اسرائیلی روایات'' لکھ رہا تھا اس کی تکمیل کے بعد تاریخ پر کام شروع کیا، دونوں کا مسودہ ایک ساتھ میں نے ان کو بھیج دیا تاریخ تو انہوں نے مرکز دعوت اسلام کی طرف سے شائع کی لیکن تفسیروں میں اسرئیلی روایات اپنے ذاتی کتب خانہ حسینیہ کی طرف سے شائع کی۔

مولانا کیرانوی کو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ عقیدت تھی اور ان کے ریشے ریشے میں سمائی ہوئی تھی، جمعیۃ علماء سے سارے اختلافات کے باوجود اس عقیدت وارادت میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی، مجھے س کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں نے اپنی نئی کتاب ''مآثر شیخ الاسلام'' کا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا، میں ایک سیمنار کے سلسلہ میں جب دہلی گیا ہوا تھا وہیں میرے رفیق سفر نے ایک دن دار العلوم دیوبند میں گذارنے کی تجویز رکھی، مجھے بھی اشتیاق تھا، ہم لوگ دیوبند گئے، میں شام کو مولانا کیرانوی کی خدمت میں مسودہ لے کر حاضر ہوا، بڑے تپاک سے ملے، بہت ہی پر تکلف ناشتہ کا انتظام کیا، کچھ دیر تک ایک دوسرے کی خیر وعافیت معلوم کی جاتی رہی پھر میں نے عرض کیا، میں ایک تحفہ آپ کی خدمت میں پیش

کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں اور میں نے بیگ سے مسودہ نکال کر ان کے سامنے پیش کر دیا، کتاب کا نام پڑھتے ہی ان کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی، چند منٹ مسودہ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد فرمایا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں ایک تصنیفی ادارہ ''دارالمولفین'' کے نام سے کھولوں جس میں ذہین اہل علم کو تصنیف و تالیف کی تربیت دی جائے اور پھر ان کو شائع کیا جائے، اس ادارہ سے سب سے پہلے ''مآثر شیخ الاسلام'' کو شائع کروں، شیخ الاسلام کی ذات مقدس سے جو مجھے نسبت اور دل میں جو عظمت ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ ادارہ کا اسی کتاب سے افتتاح ہو۔

مولانا کیرانوی نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کا ادارہ کھولنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا، یک بیک چند منٹوں میں انہوں نے فیصلہ کر لیا، کبھی کسی مسئلہ میں وہ تذبذب کا شکار نہیں ہوتے تھے، ان کی قوت فیصلہ اتنی طاقتور تھی چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد میں نے سنا کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے ایک عمارت خرید لی ہے اس میں اپنے نفاست پسند مزاج کے مطابق ترمیم کر کے ادارہ کی بنیاد ڈال دی ہے پھر اسی ادارہ دارالمؤلفین سے سب سے پہلی کتاب ''مآثر شیخ الاسلام'' شائع کی جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، فوٹو آفسیٹ کی کتابت وطباعت سنہری ڈائی کی خوبصورت جلد حسین و جمیل گرد پوش سے کتاب کو مزین کیا اور دبستان دیوبند کی دور حاضر میں سب سے محترم اور عظیم شخصیت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے دست مبارک سے رسم اجرا ادا کرائی، ان کے خلوص نیت کا ثمرہ تھا کہ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد دو کتابیں شیخ الاسلام کی سوانح کے سلسلہ میں شائع ہوئیں مگر مآثر شیخ الاسلام کی اشاعت پر کوئی حرف نہیں آیا، ہند اور بیرون ہند کتاب پھیل گئی، عقیدت کے ہاتھوں سے لی گئی اور محبت کی نگاہوں سے پڑھی گئی۔

پھر اسی دارالمؤلفین سے میری کتاب ''فن اسماء الرجال، تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ، تحریک آزادی اور مسلمان، پونے چار سو صفحات میں ''احیاء اسلام کی عظیم تحریک'' پانچ سو صفحات میں اور آخر میں ''کاروان رفتہ'' جس میں پونے پانچ سو

مشاہیر کا تذکرہ ہے سامنے آئی، جب حضرت نانوتویؒ کی شخصیت پر میری کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی تو مولانا کیرانویؒ کو کسی ذریعہ سے اس کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ یہ کتاب دارالمؤلفین ہی کی طرف سے شائع ہوتی تو بہتر ہوتا ان کے خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ اس کتاب کی ترتیب ایک ایسے مخلص کرم فرما کے ایما سے ہوئی ہے کہ اب دوسرے ادارہ سے اس کا شائع ہونا بہتر نہیں ہوگا، مولانا کیرانوی کا فوراً جواب آیا کہ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے صحیح صورت حال بیان کردی، بلا تکلف یہ کتاب انہیں کے حوالے کردیجئے کیونکہ ان کا حق ہے اگرچہ دلی خواہش تو یہ تھی کہ میں ہی اسے شائع کرتا، خط کے آخر میں انہوں نے جو بات لکھی اس سے میں بہت متاثر ہوا، انہوں نے تحریر فرمایا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا ہر حال میں آپ کی تصنیفات انشاءاللہ شائع کرتا رہوں گا، اس جملہ پر پہنچ کر میرے دل میں کھٹک پیدا ہوگئی کہ شاید انہوں نے بیک اجل کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سن لی ہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت جلد اس دنیائے فانی سے میرا رخت سفر اٹھ جانے والا ہے، میری آخری کتاب ''کاروانِ رفتہ'' جب پریس سے آئی تو ان کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

حدیث یار

ہمہ گیر شہرت کے مالک، پاکستان کے جلیل القدر محقق عالم، انتہائی وسیع المطالعہ اسکالر، درجنوں اہم ترین علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف، جسٹس مولانا تقی عثمانی نے ایک بار اپنے رسالہ ''البلاغ'' کراچی میں لکھا تھا کہ:۔

عراق کے ایک مشہور عالم پاکستان تشریف لائے اور جب کراچی آئے تو وہ میرے مہمان ہوئے، انہوں نے مجھے بتایا کہ میں متحدہ ہندوستان کی علمی وتہذیبی واسلامی تاریخ پر تحقیق کرر ہا ہوں، اسلامی ہند کی شخصیات، علماء ومحدثین اور اعاظم رجال پر ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہوں آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں اور ایسے مآخذ ومراجع کی نشاندہی کریں جو عربی زبان میں ہوں تاکہ میرے لئے استفادہ آسان ہو۔

میں نے ان سے کہا کہ پورے ہندوستان (بھارت پاکستان بنگلہ دیش) میں آپ کے معیاری کام کے لئے صرف دو کتابیں کارآمد ہیں، ایک مولانا عبدالحئ رائے بریلوی کی ''مزہتہ الخواطر'' دوسری مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''رجال المسند والہند'' تیسری اور کوئی کتاب نہیں۔

کسی زمانے میں عبدالرحمٰن بجنوری نے ''دیوان غالب'' کے ایک ایڈیشن پر مقدمہ لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ ہندوستان میں آسمانی کتابیں دو ہیں ''وید'' اور ''دیوان غالب'' مولانا عثمانی نے بھی اس عراقی عالم کو کچھ ایسا ہی جواب دیا کہ موجودہ دور میں علم تحقیق کا جو بلند معیار قائم کیا گیا ہے اس معیار پر اترنے والی اپنے موضوع پر یہی دو کتابیں ہیں، یہ بات قاضی صاحب کی زندگی میں کہی گئی، یہ ایک معیاری عالم کا بڑا فراخدلانہ اعتراف ہے جو مولانا عثمانی کی عالی ظرفی کا شاہکار بھی ہے اور قاضی صاحب کے لئے سند افتخار بھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس موضوع پر کتابیں نہیں لکھی گئیں، کتابیں لکھی گئیں

اور درجنوں کتابیں لکھی گئیں، اولاً تو ان میں بیشتر اردو زبان میں تھیں اور جو عربی زبان میں تھیں وہ آج کے دور میں علم و تحقیق کے ٹھوس معیار بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں ان میں سے کئی ایک کتابوں کے نام میرے ذہن میں ہیں مگر ان کے نام شمار کرانے سے کوئی فائدہ نہیں، قاضی صاحب کی کتاب علم و تحقیق کے کڑے سے کڑے معیار پر کھری اترنے کی چونکہ بھرپور صلاحیت رکھتی ہے اس لئے اس کو نظر انداز کرنا کسی بھی اہل علم کے لئے ممکن نہیں۔

فن تاریخ کا موضوع:

ہندوستان کی تاریخ اور عرب و ہند تعلقات و روابط پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ان سے کئی الماریاں بھر سکتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں سمجھی گئی جو اس عراقی عالم کے اخذ کردہ موضوع پر بہترین رہنمائی کر سکتی ہو۔

بات یہ ہے کہ تاریخ شاہی وقائع نگاروں کے جمع کردہ واقعات کے انبار ہی کا نام نہیں، بادشاہوں کی لشکر کشی و فتوحات، شکست و پسپائی کی داستانوں ہی کو تاریخ کا موضوع سمجھنا اس فن کی افادیت کو محدود کر دینا ہے، تاریخ قوموں کی تہذیبی و تمدنی سفر کی روداد بھی ہوتی ہے آج کا مورخ و محقق واقعات کے پس منظر میں ان عوامل کو تلاش کرتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال میں سب سے اہم کردار انجام دیتے ہیں ایک محقق مورخ کا سب سے دلچسپ سب سے دقیق اور سب سے اہم موضوع انہیں عوامل کی تلاش ہوتی ہے، داستان سرائی کرنے والے قصہ گو مؤرخوں کے بس کا یہ کام نہیں، یہ مشکل کام سید سلیمان ندوی کر سکتے ہیں یا قاضی اطہر مبارک پوری۔

مولانا عثمانی نے عراقی عالم سے قاضی صاحب کی صرف ایک عربی کتاب کا نام بتایا اگر وہ عراقی عالم اردو زبان سے واقف ہوتے تو قاضی صاحب کی آدھے درجن سے زائد کتابیں ان کی مکمل رہنمائی کے لئے موجود تھیں جن کی مولانا عثمانی نشاندہی فرما سکتے تھے۔

قاضی صاحب کی کتابوں کا امتیازی وصف:

اب تک ہندوستان کی تاریخ کے اس پہلو پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں صرف جغرافیائی حیثیت سے دو الگ الگ ملک عرب اور ہندوستان کے تعلقات وروابط کو منظر عام پر لایا گیا ہے، قاضی صاحب کی ذہنی اپج یہ ہے کہ انہوں نے ان روابط میں تقدس و پاکیزگی کے عنصر کا اضافہ کردیا ہندوستان میں اسلام کے ابتدائی نفوذ کے عہد کی نشاندہی اسلامی تہذیب وتمدن کے اولین دور کی عکاسی اور منظر کشی، ان کی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت کو زیادہ اہمیت دی ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان تعلقات وروابط کے الگ الگ دور قائم کئے ہیں، اور ہر عہد پر ان کی ایک مستقل کتاب ہے مثلاً عہد رسالت میں ہندوستان سے تعلقات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں روابط پھر بنوامیہ کے دور حکومت میں اور پھر بنو عباس کے عہد خلافت میں عرب وہند کے تعلقات وروابط کیا تھے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، ہر عہد پر ان کی الگ الگ کتابیں ہیں، اپنے موضوع سے ربط پیدا کرنے کے لئے انہوں نے قبل از اسلام کی تاریخ کو بھی قدیم مآخذ سے پیش کیا ہے اور جب عہد رسالت کا آغاز ہوتا ہے ان کا قلم ابر گہر بار بن جاتا ہے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر بات کو موتیوں سے زیادہ قیمتی سمجھ کر تاریخ واحادیث کے صفحات سے چن کر سامنے رکھ دیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان باتوں سے پوری ملت اسلامیہ کو جذباتی تعلق ہے، جب ان حقائق کو صحیح الفکر ذہن ومزاج کا مسلمان پڑھتا ہے تو اس کی ذہنی فضا میں نورانی کرنوں کی چکاچوند پیدا ہوجاتی ہے اور وہ کیف وسرور اور نشاط وانبساط کی گل پوش اور معطر وادیوں میں پہنچ جاتا ہے، یہ وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں میں مشترک ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثاروں کی طرف منسوب ہونے والی ہر بات متاعِ ایمان اور سرمایۂ حیات بن جاتی ہے۔

☆☆☆

عالمِ اسلام میں مقبولیت:

یہی وجہ ہے کہ جب قاضی صاحب کی کتابوں کی شہرت ہندوستان سے چل کر حجاز سے ہوتے ہوئے مصر تک پہنچی تو اختلاف زبان نے جو دشواریاں پیدا کیں اہل علم نے ان پر فتح حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا، قاضی صاحب کی شاہکار کتابیں زیادہ تر اردو میں ہیں لیکن یہ کتابیں جس موضوع اور جن معلومات پر مشتمل ہیں ان کا تعلق عالم اسلام سے ہے اس لئے یہ کتابیں ہندو پاک ہی کا نہیں عالم اسلام کا ورثہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی محقق عالم جو اردو زبان سے ذرا بھی واقف ہے اس نے قاضی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کو اپنی متاع گم شدہ ہاتھ آ گئی، آباء واجداد کا مدفون خزانہ اس کو مل گیا، اس نے لکھا کہ عربی زبان کا دامن ان جواہرات سے خالی ہے جن سے یہ کتابیں بھری ہیں تو اس نے پہلی فرصت میں ان کو اردو سے عربی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔

مصری عالم کے ذریعہ عربی میں ترجمہ:

مصر اسلامی علوم وفنون کا ہمیشہ ایک قابل اعتماد مرکز رہا، وہاں کے علماء نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا اور حیرتناک علمی کارنامے انجام دئے اور آج تک علمی دنیا مصری علماء کے احسانات سے زیربار ہے اور جب تک دنیا قائم رہے گی مصر کے اہل علم کے احسانات سے علمی دنیا سبکدوش نہیں ہوسکتی، اسی مصر کے ایک جلیل القدر عالم شیخ عبدالعزیز عزت نے جب قاضی صاحب کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا تو ان کے حیرت واستعجاب کی حد نہیں رہی کہ آج تک مورخین کی نگاہوں سے یہ جواہر پارے کیوں پورشیدہ رہے جو ان کتابوں میں موجود ہیں، ان کے ذہنی افق پر حقائق ومعارف کا ایک نیا آفتاب طلوع ہو گیا، اتنی مختصر کتابیں اور اتنی قیمتی معلومات سے مملو، جیسے کسی ماہرفن نے گراں بہا جواہرات کو پرکھ کر، جانچ کر اور ان کی صحیح قدر و قیمت کا

اندازہ کر کے کتاب کے صفحات میں بھر دیئے ہیں، اس شدید تائثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے از خود قاضی صاحب کی دو کتابوں ''ہندوستان میں عربوں کی حکومت'' اور ''عرب وہند عہد رسالت میں'' کو اردو سے عربی میں منتقل کیا اور اسی وقت پریس میں دے دیا وہ بہت جلد طبع ہو کر مصر وحجاز میں عام ہوگئیں۔

قاضی صاحب کا انداز تحریر:

قاضی صاحب کا قلم بڑا محتلط تھا غیر ضروری بسط وتفصیل قاضی صاحب کے مزاج کے خلاف تھی، طول کلام جس کی افادیت بہت محدود ہوتی ہے اس سے وہ ہمیشہ محترز رہے، وہ الفاظ کا انبار جمع کرنے کے بجائے حقائق ومعارف کے موتی چننے کے قائل تھے، وہ کوئی ساون بھادوں کی گھٹا نہیں تھی کہ جھومتی ہوئی آئی اور موسلا دھار برس کر رخصت ہوگئی اس کا پانی زمین پر پھیلا، بڑھا، اس کی بہت تھوڑی مقدار سے کھیتوں نے اپنی پیاس بجھائی، بقیہ سارا پانی نالیوں نالوں ندیوں اور دریاؤں کے راستے خلیج بنگال میں جا کر گم ہوگیا۔

قاضی صاحب کا قلم ابر نیساں تھا جس کے ایک ایک قطرے کے لئے صدف کا منہ کھلا رہتا ہے اور جب ایک قطرہ بھی مل گیا تو اس کو بیش قیمت امانت کی طرح اپنے سینہ سے لگا کر رکھ لیا، وہی قطرہ جب صدف کے سینہ سے باہر آتا ہے تو وہ در شہوار بن کر آتا ہے جو تاجداروں کے تاج میں جگہ پاتا ہے۔

میں اس کی شہادت میں قاضی صاحب کی ایک درجن کے قریب کتابوں کو بلا تکلف پیش کر سکتا ہوں کہ مملکت علم تحقیق کے تاجداروں نے اس سے اپنے علم وتحقیق کے تاج کی زینت بڑھائی۔

محسن سندھ کا خطاب:

قاضی صاحب ایک سیمنار کے سلسلے میں پاکستان گئے تو پاکستان کی کئی

یونیورسٹیوں کے ممتاز دانشوروں نے قاضی صاحب کے اعزاز میں ایک پر شکوہ تقریب کا انعقاد کیا جس میں خصوصیت کے ساتھ متعدد یونیورسٹیوں کے ممتاز دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا، قاضی صاحب چیف گیسٹ کی معزز کرسی پر تشریف فرما تھے، کئی ممتاز دانشوروں نے قاضی صاحب کے علم وفن پر روشنی ڈالی ان کی عظیم الشان خدمات کو سراہا اور قاضی صاحب کی ان کتابوں کے حوالے سے بات کی جن میں سندھ کے ابتدائی عہد اسلامی کی روشن اور تابناک تاریخ تھی تقریب کی صدارت وزیر اعلیٰ سندھ نے کی گومل یونیورسٹی کے چانسلر پرفیسر ذی شان خٹک نے اپنی افتتاحی تقریر میں قاضی صاحب کی علمی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو شاندار لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا، انہوں نے کہا کہ مہمان محترم حضرت قاضی صاحب نے ہم کو ہماری تاریخ سے روشناس کرا کے ہمارے سر کو فخر سے اونچا کر دیا، ہم اب تک تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم تھے، ہمارا شاندار ماضی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا، ہم خود اپنی اور اپنے علاقہ کی تاریخ اس کی قدر و قیمت اور مقام و مرتبہ سے نا آشنا تھے، قاضی صاحب نے ہماری شناخت بنائی ہم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں کھڑا کر دیا، انہوں نے اہل سندھ پر یہ اتنا بڑا احسان کیا کہ ہمارا سر عقیدت واحترام کی وجہ سے ان کے سامنے خم ہے، ہم اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے، ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ اس احسان کا شکریہ ادا کرسکیں، سوائے اس کے کہ پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے ہم نے آپ کو ''محسن سندھ'' تسلیم کر لیا ہے ہم کو اس اعتراف پر فخر ہے، ناز ہے، ہم آپ کی کتابوں کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو چکے ہیں، ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ساری کتابیں ہم سندھی زبان میں شائع کر کے سندھ کے عوام تک پہنچائیں اور ان کو بتائیں کہ تمہارے آبا واجداد کیا تھے؟ تمہارا مقام ومرتبہ کیا ہے؟ ہم آخر میں مہمان خصوصی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے ان افادات کو عام کرنے کے خیال سے ہمیں ان کتابوں کو سندھی میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

قاضی صاحب کو اپنی کتابوں سے جلب منفعت کا تصور کبھی نہیں آیا وہ تو اپنی علمی

جدوجہد کے ثمرات کو عام کرنے اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے دائرے کو وسیع کرنے میں دلی وروحانی مسرت محسوس کرتے تھے، اس لئے بلا کسی رائلٹی اور معاوضہ کے اس تنظیم کو ترجمہ اور اشاعت کی اجازت دیدی جو خاص اسی مقصد کے لئے تنظیم فکر ونظر سندھ کے نام سے تشکیل دی گئی تھی کچھ عرصہ بعد قاضی صاحب کی آدھے درجن کتابوں کے سندھی زبان میں ترجمے ہوئے اور شائع ہوئے ان کی اشاعت پورے پاکستان میں ہوئی اور علمی حلقوں میں یہ کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

تصانیف کا علمی وزن:

مجھے معلوم ہوا کہ کچھ مصنّفین پابندی کے ساتھ متعینہ صفحات روزانہ لکھا کرتے تھے، بعض کثیر التصانیف مصنّفین کے سلسلے میں یہ خبر ہے کہ وہ کسی طالب علم کو بٹھا کر زبانی املا کراتے تھے، تصنیف وتالیف کے اس آسان طریقہ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا کہ چند مہینوں میں کتاب مکمل ہوکر پریس سے باہر آجاتی ہے اس طرح ان مصنّفین نے بہت کم مدت میں تصانیف کا انبار لگادیا۔

اس کے برعکس قاضی صاحب مہینوں جدوجہد کے چراغ میں اپنا خون جلا کر صرف چند صفحات ہی لکھ سکتے تھے، ان کی کتابیں عوام کے لئے نہیں خواص کے لئے تھیں ان کے پیش نظر اور مخاطب اہل فکر ونظر، علماء اور محققین کی جماعت تھی اس لئے ان کا معیار علم وتحقیق اتنا بلند تھا کہ زودنویس مصنّفین کی نگاہ اس بلندی تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی، سستی شہرت حاصل کرکے عوام میں مقبولیت کا حصول قاضی صاحب کے پیش نظر کبھی نہیں رہا، قاضی صاحب کا کام پہاڑ کی چٹانوں کو کاٹ کر اپنی عظمتوں کا اہرام کھڑا کرنا نہیں تھا بلکہ وہ سخت چٹانوں کا کلیجہ چیر کر لعل وجواہر نکالنے کے قائل تھے، یہ محنت طلب اور دیر طلب کام تھا اس کے لئے تیشۂ فرہاد کی ضرورت تھی، خسرو پرویز کے شاہی فرمان کی نہیں، یہی وجہ ہے کہ سہل انگار مصنفوں کی درجنوں تصانیف پر قاضی صاحب کی ایک ایک تصنیف بھاری تھی، ان کی ایک کتاب کئی کئی برسوں میں پایۂ

تکمیل کو پہنچتی تھی، قاضی صاحب لال قلعہ نہیں تاج محل بنانے کے قائل تھے، یہ صحیح ہے کہ لال قلعہ کی بلند و بالا فصیلوں کا جاہ وجلال، شان وشکوہ سیاحوں کے دل و دماغ پر مرعوبیت طاری کر دیتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاج محل کا حسن و جمال اور قدر و قیمت اپنا جواب آپ ہے، سیاح اس کے نقش ونگار اس کی صناعی وفنکاری اس کے قیمتی جڑے ہوئے ہیرے اور جواہرات کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے، کیف وانبساط کی جو دولت اس کو حاصل ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت کو بہتر طور پر وہی سمجھتا ہے۔

قاضی صاحب کی تصانیف کا حال کچھ ایسا ہی ہے وہ اپنی کتابوں کو رطب و یابس تفصیلات سے ضخیم اور بھاری بھرکم بنانے کے قائل نہیں تھے، ان کی حیثیت مرصع ساز کی تھی وہ لعل وزمرد اور یاقوت و جواہر کو تراش کر نگینہ کی طرح جڑتے تھے جو لوگ ان کی قدر و قیمت کو جانتے پہنچانتے تھے وہ اس کی طرف لپکتے تھے اور ظاہر ہے کہ جوہر کی قدر جوہری جانتا ہے اگر کوئی اہل علم قاضی صاحب کے فن کی عظمت سے ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے تو وہ اپنی کم علمی کا راز فاش کرتا ہے، جواہرات کی قدر و قیمت میں اس کی لاعلمی کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

رجال السند والہند کا مصری ایڈیشن:

قاضی صاحب کی عربی تصنیف رجال السند والہند جب مرتب ہوئی تو ان کو کوئی ناشر نہیں ملا کیونکہ قاضی صاحب ابھی اونچے علمی طبقہ میں کچھ زیادہ روشناس نہیں تھے، ممبئی میں قیام تھا، وہاں عربی کتابوں کا ایک ناشر تھا قاضی صاحب کا اس سے تعارف بھی تھا مگر کوئی بھی ناشر غیر مشہور مصنف کی کسی ضخیم کتاب کی اشاعت پر اس لئے نہیں آمادہ ہوتا کہ اولاً تو اس پر ایک خطیر رقم صرف ہوگی دوسرے کتاب کی فروخت کا کوئی بھروسہ نہیں کہ ایک ایڈیشن کتنے دنوں میں ختم ہوگا، اس لئے قاضی صاحب نے کچھ اپنے ذرائع سے اور کچھ اس ناشر کے تعاون سے ٹائپ میں ہندستانی پریس سے کتاب کو طبع کرایا لیکن کتاب عربی میں تھی اور ضخیم بھی اسلئے بہت سست رفتاری سے کتاب نکل

رہی تھی، ہندستان میں خود اردو کتابوں کی اشاعت بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں خاص طور سے جب وہ کتاب خالص علمی اور تحقیقی ہو، یہ ایڈیشن کتب خانوں میں برسوں پڑا رہا، اس دوارن قاضی صاحب کی چھ سات کتابیں ندوۃ المصنّفین دہلی جیسے مشہور ومعتمد ادارہ سے شائع ہوکر ہند وپاک میں قبولیت حاصل کر چکی تھیں، ہند وپاک کے دانشور طبقہ نے ان کتابوں کی قدر و قیمت کو جانا اور سراہا، اخبارات ورسائل نے ان کتابوں کے بارے میں شاندار تبصرے لکھے۔

اب قاضی صاحب کی علمی شہرت عروج پر آ چکی تھی، دوسرے معاشی کشمکش سے بھی وہ بڑی حد تک نجات حاصل کر چکے تھے اس لئے انہوں نے سفر حج کے ساتھ اسلامی ملکوں کی سیاحت ان کے کتب خانوں سے استفادہ اور مشہور اہل علم سے ملاقات کا پروگرام بنایا، اسی دورے میں آپ قاہرہ گئے، مقصد یہ تھا کہ ''رجال السند والہند'' کا اضافہ شدہ جدید ایڈیشن اعلیٰ معیار پر طبع کرائیں، اب ان کو حجاز کے ایک بہت بڑے تاجر کتب کا تعاون بھی مل گیا تھا اس لئے کتاب کا نیا ایڈیشن بڑی آب وتاب کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہو گیا، کتاب کا بڑا ذخیرہ تو حجاز آ گیا جہاں سے عالم اسلام میں پھیل گیا، اور قاہرہ کے کتب خانوں سے یورپ اور امریکہ کی دانشگاہوں تک پہنچ گیا اسی کے ساتھ قاضی صاحب کی دوسری کتاب **العقد الثمین فیمن ورد فی الهند من الصحابة والتابعين**، کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوکر اسلامی ممالک کے دانشکدوں میں پہنچ گیا۔

ملک و بیرون ملک کے ممتاز دانشوروں سے روابط:

تیسری یا چوتھی بار قاضی صاحب نے جب حجاز کا سفر کیا اور زیارت حرمین سے فراغت حاصل کر لی تو حجاز کی سربرآوردہ علمی شخصیتوں سے ملاقات کا پروگرام بنایا اس سلسلہ میں انہوں نے صحافیوں ادیبوں، اخبارات ورسائل کے مدیروں، مہاجر علماء ومشائخ اور متعدد جامعات کے جلیل القدر اساتذہ سے معاصرانہ ملاقاتیں کیں باہمی

تعارف کے بعد اپنی اپنی تصانیف کا تبادلہ کیا معتمد و ممتاز علماء کی قیام گاہوں پر عشائیہ پر مدعو کئے گئے جہاں دوسرے اہل علم سے بھی ملاقات اور تعارف ہوا، پھر یہ روابط ان میں سے اکثر علماء و مشائخ کے ساتھ قاضی صاحب سے تادم اخیر قائم رہے ایک دوسرے کو خطوط لکھے گئے، مصر و حجاز کے لئے علماء و مصنّفین سے ان کی برابر خط و کتابت رہی، ہند پاک کے اکثر مشاہیر علماء سے ان کی مراسلت جاری تھی، آج بھی ان اکابر کے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ قاضی صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قاضی صاحب کے علمی مقام و مرتبہ کو کتنا بلند سمجھا اور ان کی عظمت کا وہ کس طرح اعتراف کرتے رہے۔

قاہرہ (مصر) میں فضیلۃ الاستاد عبدالمنعم النمر ، شیخ صلاح ابواسمعیل مقری، ڈاکٹر عبدالعزیز عزت سے ملاقاتیں رہیں، آخرالذکر حجاز میں مشہور صحافی عبدالقدوس انصاری مدیر المنہل ،مورخ الجزیرہ استاد احمد الجاسر، فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ، یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے اپنے علم و فن میں اسلامی دنیا میں اہم مقام رکھتے ہیں، قاضی صاحب کی ان سے معاصرانہ ملاقاتیں، تصانیف کا تبادلہ اور بعد میں مراسلت کا سلسلہ یہ بتاتا ہے کہ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ہند و پاک کے متعدد مشاہیر اہل علم سے ان کی مراسلت تھی جن کے خطوط قاضی صاحب کی فائلوں میں نظر آتے ہیں ان میں پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ یونیورسٹی، پروفیسر نذیر احمد دہلی، مولانا حبیب ریحان ازہری تاج المساجد بھوپال مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کلکتہ یونیورسٹی، شیخ محمد خلیل ادارۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر محمد سلیم پاکستان، شاعر مزدور احسان دانش لاہور وغیرہ کے خطوط بڑی تعداد میں ہیں۔

جہد مسلسل کی ابتدائی داستان:

قاضی صاحب آج جس بلند مقام پر نظر آتے ہیں ان کے طالب علمی کے دور

میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، عربی مدارس کے طلبہ جس ماحول میں اپنی تعلیمی زندگی گذارتے ہیں ان کی علمی ترقی ان کے ذہن وفکر میں وسعت پیدا کرنے میں اس کا کوئی رول نہیں ہوتا بس اسباق میں حاضری ایک خاص طرح کا لباس ان کی سعادتمندی کی سب سے بڑی سند ہوتی ہے، دنیا میں کیا ہو رہا ہے، جس دین کی وہ تعلیم حاصل کررہے ہیں اس پر کیا گذر رہی ہی؟ اسلام اور مسلمانوں کو کن چیلنجوں کا سامنا ہے، فراغت کے بعد وقت کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے کن صلاحیتوں کی ضرورت ہے؟ ان تمام باتوں سے ان کا ذہن خالی ہوتا ہے، دینی مدارس کے اساتذہ اور ارباب انتظام بھی اس صورت حال کو برقرار رکھنے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عربی مدارس سے جب طلبہ سند فراغت لیکر باہر آتے ہیں تو ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے، اور دس بارہ سال کی تعلیمی زندگی کی انتھک محنت بھی ان کو رائیگاں نظر آتی ہے، کسی گاؤں دیہات کے مکتب میں معلّمی تلاش کرتے ہیں، بڑے مدارس میں فرائض تدریس ادا کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی، اسٹیج پر کھڑے ہونے کے لئے علم ومطالعہ اور معلومات چاہیئے وہ ان سے محروم ہیں کیوں کہ درسی کتابوں کے علاوہ خالی اوقات میں بھی دوسری کتابوں کا مطالعہ شجر ممنوعہ تھا، قلم پکڑنے کی پوری تعلیمی زندگی میں کبھی نوبت ہی نہیں آئی تو فراغت کے بعد چند سطریں بھی ان کے لئے دشوار ہوتی ہیں۔

قاضی صاحب نے بھی اسی ماحول اور انہیں حالات میں تعلم حاصل کی اور سند فراغت حاصل کی مگر وہ دارالاقامہ کے بجائے اپنے گھر پر رہتے اوقات درس میں آتے اور پھر واپس ہو جاتے اس لئے عام طلبہ کے تفریحی مشاغل اور تضییع اوقات کی دلچسپیوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا، گھر کے حالات بھی ان کی علمی نشو ونما کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہیں تھے لیکن اپنے طبعی رجحان اور فطری ذوق وشوق کے بل بوتے کی وجہ سے حالات پر قابو پاتے اور اپنے مطالعہ کے لئے وقت نکال لیتے، ان کی خام سفالہ پوش نیم تاریک دالان ان کا دار المطالعہ تھی، وہ قدرت کی عطا کردہ فطری

صلاحیتوں کے نتیجہ میں از خود اپنے مطالعہ کی لائن متعین کرتے اور حالات سے لڑتے الجھتے، ٹکراتے اسی لائن پر آگے بڑھتے رہے، راستہ دشوار تھا مگر منزل تصور کی آنکھوں کے سامنے تھی، اور منزل تک پہنچنے کا عزم بالجزم دل میں موجود تھا۔

یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید

جس کا مسلک بن جائے اس کو منزل تک پہنچنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

آغاز سفر:

قاضی صاحب نے عام طلباء مدارس اسلامیہ کی راہ سے ہٹ کر اپنی راہ خود بنائی تھی، اس میں کسی کی رہنمائی کا کوئی دخل نہیں تھا، اس لئے اس راہ پر چلنے کے لئے دل ودماغ میں جو روشنی ہونی چاہیۓ ان کے ذہنی افق پر اس کی کرنیں پڑنی شروع ہوگئی تھیں، انہوں نے طالب علمی کے دور میں شعر وشاعری کو لے کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا تھا، ان کی نظمیں رسائل واخبارات میں آنے لگی تھیں، پھر انہوں نے چھوٹے چھوٹے اور مختصر مضامین لکھنے شروع کر دیئے، سب سے زیادہ حوصلہ ان کو رسالہ ''قائد'' مراد آباد کی جانب سے ملا، یہ رسالہ استاد محترم ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' کے مصنف مولانا سید محمد میاں صاحب نے مراد آباد سے جاری کیا تھا، مولانا سید محمد میاں صاحب کے قلم میں بڑا زور تھا ان کا اپنا ایک مخصوص طرز تحریر تھا، اردو ادب میں ان کی تحریر نے اپنی شناخت بنالی تھی، وہ فکر ولی اللٰہی کے ترجمان تھے اس لئے انہوں نے ''قائد'' کا معیار بہت بلند رکھا تھا، رسالہ میں عام اور سرسری مضامین کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے رسالہ کا بڑا حصہ خود آپ ہی کے رشحات قلم سے بھرا رہتا تھا، قاضی صاحب نے اسی رسالہ میں لکھنا شروع کیا، قائد میں قاضی صاحب کے مضامین کی اشاعت ان کے پختہ کار اہل قلم ہونے کی سند بن گئی، ان کا حلقہ تعارف بڑھنے لگا، پھر انہوں نے دوسرے رسائل میں بھی اپنے مضامین شائع کرائے، ابتدائی کامیابیوں کے بعد جوش وجذبہ کروٹیں لے کر اٹھتا ہے تو ایک مضمون کی اشاعت کے بعد دوسرے مضمون کی

داغ بیل پڑ جاتی ہے، دل میں امنگوں کا طوفان اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے، پکی روشنائی سے اپنے نام کا چھپ جانا ہر اہل قلم کے لئے ابتداءً بڑا حوصلہ افزا ہوتا ہے قاضی صاحب بھی اس فطری جذبے سے خالی نہیں تھے، اس لئے ان کے لکھنے کی رفتار بڑھ گئی، شب وروز نئے نئے موضوعات اور عنوانات سوچتے، لکھتے، کاٹتے، بناتے، سنوارتے، کچھ رسالوں کو بھیج دیتے کچھ فائل کی زینت بن کر رہ جاتے، اب قافلہ چل پڑا تھا، اب قافلہ کو منزل تک پہنچانے کے لئے حوصلے اور امنگیں اور جوش وجذبہ سب اس کے ہمرکاب ہو گئے۔

راستے کے نشیب وفراز:

جب تعلیم سے فارغ ہوئے ان کے سامنے علمی زندگی کا لق ودق میدان تھا، کوئی واضح راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں تھا، نشانات مٹے مٹے دھندلے دھندلے، زندگی کے اس چوراہے پر کھڑے ہو کر مختلف سمتوں میں جانے والے راستوں کو دیکھا کئی راستوں پر تھوڑی دور چل کر لوٹ آئے، تدریسی زندگی اختیار کی وہ راس نہیں آئی، امرتسر سے اک گمنام ادارے کا دعوتنامہ ملا، ادارہ کیسا ہے؟ اس کا کام کیا ہے؟ اس کے وسائل کیا ہیں؟ کچھ معلوم نہیں، انہوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے اور امرتسر پہنچ گئے، وہ ایک شخص کا ذاتی ادارہ تھا، تنخواہ غنیمت تھی، کام شروع کر دیا، مرکز تنظیم اہل سنت نام تھا ایک بخاری صاحب اس کے مالک تھے وہ چھوٹے چھوٹے کتابچے طبع کراتے اور تقسیم کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے ذمہ لٹریچر مرتب کرنا پھر اس کو لے کر لاہور جا کر طبع کرانا ہو گیا کیونکہ امرتسر میں کوئی اچھا اردو پریس نہیں تھا، کئی مہینے امرتسر اور لاہور کے درمیان آمدورفت جاری رہی۔

قاضی صاحب لاہور میں اخبار ''زمزم'' کے پریس میں طباعت کا کام کراتے تھے ایک دن اخبار زم زم کے مالک سے ان کی ملاقات ہوگئی، وہ غائبانہ طور پر قاضی

صاحب کی صلاحیتوں سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، انہوں نے دوستانہ مشورہ دیا کہ وہاں زندگی کیوں برباد کررہے ہیں، اس ادارہ کا کوئی مستقبل نہیں نہ اس کا کوئی وزن ہے نہ وہ آپ کی حیثیت کے مطابق حق المحنت دے سکتا ہے، آپ ہمارے یہاں آجائیں، کام بھی آپ کے ذہن ومزاج کے مطابق ہوگا اور حق المحنت بھی بہت معقول اور مناسب ہوگا۔

اس پیشکش کو ٹھکرانا حالات کے پیش نظر نادانی تھی، آپ نے بخاری صاحب سے گفتگو کرکے لاہور جانے کا راستہ صاف کرلیا اور لاہور پہنچ کر اخبار زمزم کے دفتر سے وابستہ ہوگئے مگر اخبار کی مجلس ادارت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ایک عظیم تالیف:

اخبار زمزم کے مالک عبدالرحیم انصاری اپنے پریس سے ایک نئے انداز کی تفسیر مرتب کرانا چاہتے تھے، قاضی صاحب کو اسی مقصد سے بلایا تھا زمزم اخبار جس بلڈنگ میں تھا وہ خاصی بڑی تھی اسی بلڈنگ کے ایک کمرے میں قاضی صاحب کا دارالتالیف قائم کردیا گیا جس میں قدیم علماء کی طرح زمینی فرش پر نشست تھی۔

اس تفسیر کا نام ''منتخب التفاسیر'' تجویز ہو چکا تھا کام کا خاکہ یہ تھا کی سات تفسیروں کے خلاصے ہر ہر آیت کے تحت جمع کردیئے جائیں، ساتوں تفسیریں دفتر میں فراہم کردی گئیں، کچھ تفسیروں میں ایک ایک آیت کے تحت مصنف نے کئی کئی صفحات لکھے ہیں، ان عربی تفسیروں کو اردو میں منتقل کرنا پھر لمبی لمبی بحثوں کی تلخیص اس انداز سے کرنی کہ مفسر کی رائے کا خلاصہ آجائے اور اتنی ہی سطروں میں آئے جتنی جگہ ہر صفحہ میں ایک تفسیر کے لئے مقرر رہے۔

کام بہت نازک اور ذمہ داری کا تھا، تلخیص کے لئے بڑے علم ومطالعہ کی ضرورت تھی مگر قاضی صاحب کی علمی استعداد ہر شک وشبہہ سے بالاتر تھی مگر مفسر کے مقصد کو سمجھ لینا پھر اس کو مختصر لفظوں میں اردو میں منتقل کرنا وقت طلب امر تھا اس لئے

ابتداء میں کام سست رفتاری سے چلا لیکن دو چار پاروں کے بعد ذہن وفراست نے یاوری کی، پہلے ایک پارہ بھی ایک ماہ میں نہیں ہوتا تھا بلکہ اوسطاً دو ماہ لگ جاتے تھے لیکن کام جب آگے بڑھا تو ایک ماہ میں ایک پارہ سے بھی زیادہ کا اوسط آنے لگا، تین سال میں یہ تفسیر مکمل ہوگئی۔

میں تقسیم ملک سے قبل فروری ۱۹۴۷ء میں لاہور پہنچا تو تفسیر کتابت کے مرحلے میں تھی، میں چار مہینے لاہور میں رہ کر مئی کے آخر میں وطن واپس آ گیا، قاضی صاحب لاہور میں رہے، تقسیم ملک کے عذاب کی سرخ آندھی چلنی شروع ہوگئی، فضا گرد آلود اور آسمان کے کنارے خون آلود نظر آنے لگے تھے، حالات صاف بتا رہے تھے کہ کوئی بہت بڑا طوفان امروز وفردا میں آنے والا ہے، قاضی صاحب بھی ان حالات سے بے خبر نہیں تھے، فرقہ وارانہ فسادات کا آغاز ہو چکا تھا، نفرتوں کا سیلاب پھیلتا اور بڑھتا جا رہا تھا جب حالات ایک دم بگڑ گئے تو تقسیم ملک سے دو ما قبل وسط جون میں لاہور چھوڑ کر وطن آ گئے، پھر وہ قیامت شروع ہوگئی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، آسمان سے عذاب کے انگارے برسنے لگے، کروڑوں مسلمان تباہ وبرباد ہوئے مارے کاٹے گئے، ماں بہنوں کی عصمتیں لٹیں، کئی ہزار عورتیں اغوا ہوئیں، اربوں کھربوں کی جائداد مسلمانوں کی نذر آتش ہوئی اور کچھ عرصے کے لئے مسلمان بے یار ومددگار اور بے سہارا ہوکر رہ گیا اس کی فریاد کو سننے والا نہیں رہا، قاضی صاحب اس ہمہ گیر ہنگامۂ محشر میں اپنی مصیبت بھول گئے، اچھے مستقبل کا سنہرا خواب چور ہوکر رہ گیا۔

لاہور سے واپسی کے بعد:

لاہور سے واپسی کے بعد معاش کا مسئلہ پھر اٹھ کھڑا ہوا، مگر یہ مسئلہ تو زندگی کے ساتھ ہے، دکھ کی بات یہ تھی کہ لاہور میں قاضی صاحب ترقی وشہرت کے چند زینوں ہی تک پہنچے تھے کہ وہ عمارت ہی زمین بوس ہوگئی۔

وہ چمن ہی لٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی

لاہور میں قاضی صاحب کا حلقہ تعارف بڑا پرشکوہ تھا، جن لوگوں سے ایک بار ملکر لوگ فخر محسوس کرتے تھے وہ قاضی صاحب کے حلقہ احباب اور بے تکلف دوستوں میں تھے ہندوستان کے مشہور صحافی مولانا عثمان فارقلیط اخبار زمزم کے ایڈیٹر تھے ان کا دفتر اور قاضی صاحب کا دفتر آمنے سامنے تھا، دونوں نیشنلسٹ تھے اس لئے ذہنی وفکری اتحاد نے دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا، دفتر ساتھ جانا ساتھ ہی اکثر واپس آنا، پھر قاضی صاحب اور فارقلیط صاحب اندرون بھائی گیٹ ایک ہی بلڈنگ میں رہتے تھے اس لئے شب وروز کی ملاقاتیں تھیں۔

میں نے وہیں اخبار مدینہ بجنور کے مشہور ایڈیٹر ابوسعید برنی کو دیکھا جو بھوپال کے تھے ان دنوں لاہور میں تھے وہ قاضی صاحب سے ملنے آئے یہ محفل بڑی بے تکلفی کی محفل تھی، لاہور کی ایک مشہور شخصیت شاعر مزدور حضرت احسان دانش کی تھی جو مزنگ میں رہتے تھے ان سے تو اتنے گہرے مراسم تھے کہ ہفتہ میں متعدد بار مزنگ چار بجے جانا اور عشاء کے بعد واپس ہونا معمول بن گیا تھا، اپنے قیام لاہور کے زمانے میں چار ماہ قاضی صاحب کے ہمراہ میں بھی ہوتا تھا، کبھی کبھی احسان صاحب ہم لوگوں کو روک لیتے، عشاء کے بعد ان کے دفتر میں جمع ہوتے تو آدھی آدھی رات تک اپنی نظمیں سناتے، وہ راتیں لاہور کی زندگی کی یادگار راتیں تھیں۔

لاہور میں ایک اور بھاری بھرکم شخصیت علامہ تاجور نجیب آبادی کی تھی قاضی صاحب کی ان کے پاس بھی آمد ورفت تھی اور خاطر مدارت چلتی تھی ایک بار میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔

میری اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ قاضی صاحب خلوت نشین اور زاہد خشک نہیں تھے بلکہ بزم آرائی کے بھی قائل تھے لیکن اہل علم کی محفلوں کے علاوہ دوسری اور کوئی جگہ وہ جانا پسند نہیں کرتے تھے، احسان دانش کے توسط سے دو تین باذوق نوجوان جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتے تھے ان سے بھی آمد ورفت تھی جن میں عشرت کرتپوری شعر وشاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور اظہار اثر ناول نگاری سے آج کل

ایک غازی آباد میں ہیں دوسرے دہلی میں۔

قاضی صاحب کو سب سے بڑا دھچکا یہ لگا کہ تین سال کی شبانہ روز مشقتوں کے بعد جو تفسیر مرتب کی اور ایک ہزار سے زائد صفحات میں آئی تھی اس کو کتابت کے مرحلے میں چھوڑ آئے تھے لیکن پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ اس مسودہ پر کیا گذری، تقسیم ملک کی افراتفری میں نہ کاتب کا پتہ چلا نہ مسودہ کا، نہ عبدالرحیم انصاری کا سراغ ملا اور نہ دوسرے ذرائع سے کچھ پتہ چلا، ہوسکتا ہے کہ لاہور کے فسادات، آتشزدگی، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارتگری میں یہ مسودہ بھی کہیں تباہ ہوگیا جس کا قلق قاضی صاحب کو آخر وقت تک رہا۔

منزل کی تلاش:

لاہور سے واپسی کے بعد کچھ دنوں بہرائچ میں قیام رہا، مشہور عالم مولانا محفوظ الرحمٰن نامی نے **الانصار** نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا قاضی صاحب کو اس کا مدیر بنایا تھا، قاضی صاحب نے بہرائچ جا کر ذمہ داری سنبھال لی لیکن ویکلی اخبار کے لئے جو وسائل چاہیے وہ بہرائچ میں عنقا تھے، پھر بھی کچھ دنوں تک اس کی اشاعت ہوتی رہی لیکن آخر میں مالی کمزوری کی وجہ سے اس کو بند کرنا پڑا قاضی صاحب وطن آگئے پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بحیثیت استاد ادب کے ان کی تقرری ہوگئی اور وہ ڈابھیل چلے گئے، پاکستان کے مشہور محدث، قادیانیت کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کی قیادت کرنے والے، فن حدیث میں مشہور کتاب **"معارف السنن"** کے مصنف مولانا یوسف بنوری اس زنانہ میں اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث تھے قاضی صاحب کو ان کی رفاقت حاصل ہوئی وہ بہت ہی جید الاستعداد اور بہت ہی حاضر دماغ عالم تھے جدید وقدیم عربی تصانیف پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، قاضی صاحب ان کی مجلس کے رکن بن گئے اور تدریسی فرائض انجام دیتے رہے، لیکن تدریسی زندگی ان کو راس نہ پہلے آئی اور نہ اب، اس لئے ان کا مزاج

لگی بندھی تعلیم اور ماحول سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں پیدا کر سکا، کچھ دنوں کے بعد دل کے تقاضوں نے مجبور کیا اور جامعہ اسلامیہ سے ترک تعلق کر کے وطن آ گئے۔

عروس البلاد ممبئی میں:

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں، چکر چلتا رہا، آخر میں ممبئی نے ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی، قاضی صاحب کے ممبئی جانے کی تقریب یہ ہوئی کہ جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے تعاون سے ایک اخبار ''**جمہوریت**'' کے نام سے نکالنا طے ہوا، یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے، حامد الانصاری غازی ممبئی میں قیام پذیر تھے ان کو ایڈیٹر بنایا گیا اور جوائنٹ ایڈیٹر قاضی صاحب ہوئے ساری تیاریاں کر لی گئی تو قاضی صاحب بھی ممبئی پہنچ گئے، اور اپنی ذمہ داری سنبھال لی، اخبار نکل بھی گیا لیکن اخبار کی ذمہ داری جن کے سر تھی ان میں اخلاص کے بجائے جلب منفعت کا جذبہ چھپا ہوا تھا، اس لئے اختلافات شروع ہو گئے، قاضی صاحب خالص دینی ذہن ومزاج کے آدمی تھے بازیگر سیاستداں نہیں تھے، دیانتداری اور پاک آمدنی پر یقین رکھتے تھے، غازی صاحب کو قاضی صاحب کی ادارت میں شمولیت منظور نہیں تھی وہ خود معاشی اعتبار سے پریشان حال تھے، انہوں نے ''جمہوریت'' کو ذریعہ معاش بنا لیا اور مختار کل بن گئے جمعیۃ علماء مہاراشٹر کا وزیر بلڈنگ میں دفتر تھا اس کے دو کمروں پر وہ پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے کرایہ جمعیۃ ادا کرتی اور قابض غازی صاحب تھے اب اخبار کو بھی انہوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا تو قاضی صاحب کی خودداری کو ٹھیس لگی وہ اخبار سے بے تعلق ہو گئے اور دفتر میں قیام بھی ترک کر دیا۔

اخبار انقلاب سے وابستگی:

ممبئی کا سب سے بڑا اردو اخبار انقلاب پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے جب اس کے مالک عبد الحمید انصاری کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے ''جمہوریت'' سے قطع تعلق کر لیا تو انہوں نے اپنے اخبار میں آنے کی پیشکش کی قاضی صاحب نے ان کو

امدادِ غیبی سمجھا، ان کی دعوت کو منظور کر لیا اور انقلاب میں آ گئے، اور رپن روڈ پر ایک کمرہ ان کو قیام کے لئے مل گیا پھر چالیس سالوں تک اپنا مخصوص کالم جواہر القرآن اور احوال و معارف کے نام سے لکھتے رہے، اگر ان تمام مضامین کو جمع کیا جائے تو شاید دس بارہ ضخیم جلدوں میں آئیں، اس کالم میں بالعموم علمی مسائل ہی پر لکھتے تھے، آخر میں چند سطریں حالات حاضرہ سے متعلق ہوتی تھیں۔

ممبئی کے شب و روز:

قیام ممبئی کے زمانے سے قاضی صاحب کا تصنیفی دور شروع ہوتا ہے بارہ چودہ سالوں کی صحرا نوردی کے بعد ان کو عروس البلاد ممبئی میں ایک گوشۂ عافیت مل گیا، ایک پرانا خستہ کمرہ، جس میں چٹائیوں کا فرش ایک بدرنگ ڈیسک، شکن آلود چادر پر ہر طرف کتابیں بکھری ہوئیں، قلم ہاتھ میں لئے ہوئے آنکھیں ڈیسک پر رکھے ہوئے کاغذ پر، جیسے گوتم بدھ کا کوئی مجسمہ، ساکت و صامت ممبئی جیسے شہر کے ہنگامہ خیز اور طوفاں بدوش ماحول سے ایک دم بے نیاز، قاضی صاحب علم و تحقیق کی دنیا میں گم، بت بنے گھنٹوں بیٹھے رہتے، قلم چلتا رہتا، ایک طرف مٹی کے تیل کا اسٹو واس پر ایک چھوٹی سی دیگچی میں آزوقہ تیار ہورہا ہے یہ فقیرانہ اور قلندرانہ طرز زندگی قاضی صاحب کو بہت عزیز تھا اس کے لئے وہ شاہی ضیافتوں کو بھی ٹھکرا دیتے تھے۔

شاہانہ دعوت سے انکار:

ایک بار شاہ اردن ہندوستان کے دورے پر آئے اور جب ممبئی آئے تو جوہریوں کے بادشاہ عرب جوہری نے شاہ اردن کی شاہی دعوت کی عرب جوہری نے قاضی صاحب کو مدعو کیا کیونکہ قاضی صاحب عرب ملکوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی ترجمانی کرنے کے لئے لائے جاتے تھے اس لئے عرب جوہری بھی قاضی صاحب سے واقف تھا شاہ اردن کی ترجمانی بھی قاضی صاحب کرتے تھے، ڈنر فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا اس کا دعوت نامہ قاضی صاحب کی جیب میں تھا، وہ جب اپنے

کمرے میں آئے تو دعوت نامہ کو غور سے پڑھا، اس میں ڈنر کے بعد بہت ہی اعلی پیمانے پر رقص وسرور کا بھی پروگرام تھا ممبئ کی مشہور فلمی اداکاریں اور ڈانسر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھیں، جوں ہی پروگرام کی یہ سطریں پڑھیں ان کی دینی غیرت اور عالمانہ وقار کو ٹھیس لگی، انہوں نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکائی اور چھولہے پر کھچڑی کے لئے دیگچی چڑھادی اور گنگنانے لگے

ازما بجز حکایت مہر ووفا مپرس   ماقصۂ سکندر ودارا نخوانده ایم

حافظ شیرازی کو ہندوستان کے بادشاہ نے یہاں تشریف آوری کی دعوت دی، حافظ شیرازی ان دنوں معاشی تنگیوں میں مبتلا تھے، دل میں خیال آیا کہ شاہی دربار سے وابستگی ایک شاندار زندگی کا پیش خیمہ ہے، دل میں یہ خیال ابھی آیا ہی تھا کہ اسی دوران اندر سے کنیز ایک پیالے میں دودھ لیکر آئی اور پیش کیا، دودھ پی کر شکم پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ جب تک مجھے یہ میسر ہے شیراز چھوڑنے کی ضرورت نہیں اور ہندوستان آنے سے صاف انکار کر دیا، قاضی صاحب بھی کچھ اسی ذہن ومزاج کے بزرگ تھے۔

عظمتوں کا چراغ روشن رکھا:

ایک بار شاہ ایران رضا شاہ پہلوی خیر سگالی کے دورے پر ہندوستان آئے اور ممبئ میں اسی عرب جوہری کو ان کی میزبانی کی عزت حاصل ہوئی قاضی صاحب اس ڈنر میں مدعو تھے، صبح کو اخبار میں نہ یہ خبر پڑھی کہ شاہ ایران کی عروس البلاد ممبئ میں تشریف آوری کی خوشی میں مہاراشٹر حکومت نے تین دنوں کے لئے شراب سے پابندی اٹھالی ہے ہر شخص آزادانہ شراب خرید سکتا ہے اور پی سکتا ہے میکدے کے پیر مغاں کا اعزاز یہی ہے کہ اس کی نگاہوں کے سامنے

ہر سمت ساغروں میں چھلکتی ہوئی شراب

کا دلکش منظر ہو اور رندانِ بلانوش اس کا استقبال کریں، ہندوستان کی سرزمین نے یہ شاندار روایت قائم کر رکھی ہے کہ باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کا ان کے

ذہن ومزاج کی رعایت کرتے ہوئے ان کی شایانِ شان استقبال کرتی آئی ہے۔

آزادی کے کچھ ہی دنوں بعد خادم حرمین شریفین شاہ سعود ہندوستان کے دورے پر آئے تو بنارس میں ان کا استقبال اس طرح کیا گیا کہ ان کے راستہ مین جتنے مندر پڑتے تھے ان تمام مقامات پر سفید لٹھے کے لمبے لمبے بینر بنائے گئے اوران پر بہت ہی جلی قلم سے کلمۂ شہادت لکھ کران بینروں سے مندر کو چھپا دیا گیا تا کہ شاہ کی نظران پر نہ پڑے، سڑکوں پر جگہ جگہ عظیم الشان گیٹ بنائے گئے ان پر جو بینر لگائے گئے ان پر ایکس X کی صورت میں دو تلواریں بنا کر دائیں بائیں **لا الٰہ الا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ** کی سطر جگمگا رہی تھی لاکھوں کی بھیڑ میں جب شاہ سعود ان سڑکوں سے گذرے تو ان کو محسوس ہوا ہوگا کہ وہ بنارس میں نہیں حجاز کی شاہراہوں پر چل رہے ہیں، رواداری کی یہ شاندار روایت ہمیشہ یہاں رہی، شاہ ایران کی آمد کے موقعہ پران کے ذہن ومزاج کی رعایت کرتے ہوئے ممبئی کی سرزمین نے اس روایت کو قائم رکھا، اورمیکدوں کے دروازے کھول دیئے۔

قاضی صاحب نے اخبار میں خبر پڑھتے ہی عرب جوہری سے معذرت کردی، نشہ برساتی ہوئی فضا میں قاضی صاحب کے جانے کا کیا سوال ع

قاضی شہر کجا؟ رند خرابات کجا؟

قاضی صاحب اسی شان قلندری کے ساتھ چالیس برسوں تک ممبئی میں رہے ان کے دامن فضل وکمال پر کبھی کوئی دھبہ نہیں پڑا، نشہ برساتی ہوئی ممبئی کی فضا کا ان کے دل ودماغ پر کبھی کوئی اثر نہ ہوا، یہ خودشناسی، خودداری اپنے مقام ومرتبہ کے صحیح احساس اوراستقامت کا ایسا حیرتناک کارنامہ ہے کہ اس کی مثال عملی زندگی میں بہت ہی کمیاب ہے۔

شعروادب کی مجلس میں شرکت:

قاضی صاحب عالمانہ وقار کی حفاظت ضروری سمجھتے تھے اس لئے جہاں اس کو

بھٹیں لگنے کا احتمال نہیں ہوتا تھا آپ وہاں شریک بھی ہوتے تھے مجھے یاد ہے کہ جن دنوں میں ممبئ میں تھا انہیں دنوں ایک قدیم طرز کی محفل شعر وسخن منعقد ہوئی اس میں انہوں نے شرکت کی میں خود ان کے ہمراہ تھا، حیدرآباد کے ایک رئیس زادے انس حیدرآبادی ممبئ میں رہتے تھے وہ ایک شاندار فلیٹ میں رہتے تھے انہوں نے اپنے فلیٹ کے ہال میں ایک محفل شعر وسخن منعقد کی صرف شعرا اور صرف تین چار اہل علم مدعو تھے کل بیس بائیس افراد تھے ممبئ کی مقبول ترین شخصیت حکیم اعظمی کے ہمراہ ہم دونوں بھی اس محفل میں شریک ہوئے تمام لوگ ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے تو ایک نوجوان ایک چھوٹی سے مرادآبادی سینی میں ایک موٹی سی موم بتی جلا کر لایا اور صدر مشاعرہ کے سامنے رکھ دی، انس حیدرآبادی نے صدر سے مخاطب ہوکر کہا حضرت! بسم اللہ، صدر نے شمع اپنی داہنی جانب سرکادی، شمع سامنے آنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا کلام سنائیں، شاعر نے غزل پیش کی، غزل تمام کرکے شمع اپنی داہنی جانب بڑھادی، اسی طرح شمع گردش کرتی ہوئی قاضی صاحب اور پھر میرے سامنے آئی اور جلدی سے داہنی جانب سرکادی کیوں کہ ہم دونوں کو پڑھنا نہیں تھا، شمع گردش کرتی ہوئی ممبئ ریڈیو سے وابستہ رفعت سروش کے سامنے آئی انہوں نے ایک آزاد نظم سنائی اور خوب داد وتحسین وصول کی اب شمع مہمان خصوصی ساغر نظامی کے سامنے تھی یہ ان کے شباب کا زمانہ تھا اور ان کی شاعری پر بھی شباب آیا ہوا تھا انہوں نے متعدد غزلیں اور نظمیں سنا کر شمع صدر کے سامنے بڑھادی، صدر نے پھونک مار کر شمع بجھادی، یہ مشاعرہ کے ختم ہونے کا اعلان تھا، باہر نکل کر قاضی صاحب نے رفعت سروش سے کچھ دیر باتیں کیں پھر ہم لوگ اپنے کمرے پر لوٹ آئے۔

رسالہ البلاغ:

اخبار انقلاب سے آپ وابستہ تھے لیکن اخبار کے دفتر شاذ ونادر ہی جاتے تھے جو کالم آپ کے ذمہ تھا وہ کسی بھی وقت لکھ کر جیب میں ڈال لیتے اور جب شام کو

کمرے سے نکلتے تو انقلاب کے کاتب کی قیام گاہ راستہ میں پڑتی تھی اپنی تحریر ان کے حوالے کر دیتے وہی اس کالم کی کتابت بھی کرتے تھے، قاضی صاحب اب بالکل آزاد تھے، بعد میں انہوں نے انجمن اسلامیہ کے ہائی اسکول میں دینیات کے دو گھنٹے لے لئے تھے وہاں البتہ پابندی سے جاتے تھے تیسری دل چسپی کی جگہ صابو صدیق کا مسافر خانہ تھا جہاں انجمن خدام النبی کا دفتر تھا جس کو ممبئی کے ایک دیندار مخیّر رئیس احمد غریب نے قائم کیا تھا، جس کا مقصد زائرین حرم کو سہولت فراہم کرنا تھا انہیں کی تجویز پر ایک رسالہ البلاغ کا اجرا ہوا قاضی صاحب اس کے مدیر تھے یہ رسالہ بیسیوں سال تک قاضی صاحب تن تنہا نکالتے تھے، یہ ساری مصروفیات ۴ بجے شام کے بعد کی تھیں اس کے علاوہ وہ شب وروز کا زیادہ حصہ اپنے دار المطالعہ میں تصنیف وتالیف اور مطالعہ میں گذارتے بلاضرورت کہیں آنا جانا پسند نہیں تھا آپ کی تین درجن کے قریب کتابیں اسی خلوت گزینی کے نتیجہ میں مرتب ہوئیں اور آپ کی شہرت کو چار چاند لگا ئے۔

عربی ادب کا ذوق:

قاضی صاحب کا عربی ادب کا ذوق بڑا پختہ تھا، دوارن گفتگو بے تکلف احباب کی محفلوں میں اکثر سبعہ معلقہ دیوان حماسہ مختلف جاہلی شعراء کے اشعار سناتے اور اس کی معنویت کی وضاحت کرتے، بیشمار عربی اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے، چونکہ شب وروز عربی کتابوں کا ہی مطالعہ تھا اس لئے ذرا سی توجہ سے عربی کی بہت مرصع نثر لکھتے تھے، بعض عربی کتابوں پر جوانہوں نے مقدمے اور پیش لفظ لکھے ہیں، بہت رواں دواں، سلیس اور فصیح عربی میں ہیں، کہیں کہیں سجع کی رعایت اور قافیہ پیمائی بھی نظر آتی ہے، یہی عربی ادب کا ذوق آگے چل کر مزید نکھر گیا، ان کی عربی عبارتوں میں کہیں تکلف اور آورد کی جھلک نہیں ملتی نہ کہیں اظہار مطالب میں اغلاق وابہام کا شائبہ ہے ''رجال السند والہند'' ان کی عربی کی پہلی تصنیف ہے، دوسری کتاب ''العقد الثمین''، جب آپ کے قلم سے نکلی تو عام متداول عربی تاریخ وسیر کی کتابوں کا

جو انداز ہے ٹھیک وہی انداز بیان وہی سادہ لب ولہجہ بلا کسی عبارت آرائی اور تصنع کے صاف ستھری سلیس عربی ہے، جدید صحافتی عربی ان کی کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتی جو کچھ ہے قدماء کے رنگ میں ہے جو ان کی کتابوں کے علمی معیار کو بلند کر دیتی ہے۔

قاضی صاحب کی دوراندیشی:

قاضی صاحب طالب علمی کے دور سے اردو کتابوں کے بجائے مآخذ ومراجع کی عربی کتابوں کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے تھے، ہم لوگ اپنی عمر کے طبعی تقاضوں کے زیر اثر اردو وادب، شعروشاعری، سیاسی تاریخ، افسانوں ناولوں اورادبی رسالوں کی گلریز وادیوں کی سیر کو حاصل زندگی سمجھتے تھے، قاضی صاحب تذکرہ الحفاظ، المسالک والممالک جیسی خشک کتابوں کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے تھے، معاشی حالت زیر وزبر تھی مگر کیسے کیسے چار پیسے جوڑ کر عربی کی ان کتابوں کو خریدتے، جلد سازی کرتے، اس پر کاغذ کا غلاف چڑھاتے، اور سجا کر طاق پر رکھتے ان کتابوں کو پھول کی طرح چھوتے، نہایت احتیاط اور نفاست کے ساتھ ان کے اوراق پلٹتے اور گھنٹوں ان کے مطالعہ میں منہمک رہتے، طبقات خلیفہ بن خباط، وفیات الاعیان، تہذیب التہذیب وغیرہ کتابیں اسی دور غربت وافلاس کی خرید کردہ تھیں حیرت ہوتی ہے کہ طالب علمی کے دور میں کس طرح انہوں نے ان کتابوں کی قدر وقیمت کو پہچانا جب کہ ہم لوگ ان کتابوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں تھے ان کی افادیت کا تصور بھی ہمارے دماغ سے اونچا تھا اور اگر قاضی صاحب کے بتانے سے کچھ سمجھ بھی جاتے تو اس کو کوہ کندن کاہ برآوردن سمجھتے اور کہتے تھے اور ہم ان کے مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھتے کیوں کہ ہمارا شعور خام تھا قاضی صاحب اس سے بہت آگے جاچکے تھے، ہماری جارحانہ تنقیدوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ہماری گمراہ طبیعتوں نے ہم کو رنگین کھلونے دے کر بہکا رکھا تھا اور قاضی صاحب ثریا پر کمند ڈالنے کی فکر میں مصروف تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو علمی مجلسوں میں صدر نشینی کی عزت وسرفرازی نصیب ہوئی اور ہم کو صف فعال میں بھی جگہ نہ ملی۔

قاضی صاحب کی شاعری:

ہر ذہین عالم میں شاعری کا جوہر موجود ہوتا ہے بس ذوق سلیم اور موزونی طبع درکار ہوتی ہے، قاضی صاحب بھی شاعر تھے اور اپنے دور طالب علمی میں بہت لکھتے تھے، اس دور میں ان کی شاعری ہی ان کی شناخت بن گئی تھی، وہ غزل کے بجائے صرف مذہبی واصلاحی نظمیں لکھتے تھے، جس میں جوش وجذبہ کی فراوانی تو ضرور تھی مگر لطف بیان، طرز اظہار میں جدت، زبان وبیان کی چاشنی، برجستگی وسلاست اور شگفتگی کا عنصر بہت کم تھا، انکی شاعری اصلاحی نظموں تک محدود تھی کبھی کبھار کوئی نعت لکھ دیتے تھے۔

عمر کے ساتھ ان کی شاعری پر بھی نکھار آنے لگا تھا، ان کے شعروں میں رمزیت، معنویت، استعارات کا خوبصورت استعمال اور تخئیل کی کارفرمائیاں نظر آنے لگی تھیں، جن میں زبان وادب کی چاشنی، انداز بیان کی لطافت، تخیل کی فن کاری جگہ جگہ نظر آنے لگی، اب وہ غزلیں بھی لکھنے لگے تھے ان کی کچھ غزلیں پاکیزہ اور دلکش ہیں لیکن اس کا بڑا حصہ سادگی بیان اور سادگی زبان کی وجہ سے دلکشی وجاذبیت سے عاری ہے، سچی بات یہ ہے کہ یہ قاضی صاحب کا فن نہیں تھا اور نہ ان کی ذہنی ساخت غزل کی شاعری کو قبول کرتی تھی غزل کی شاعری کے لئے حسن پرستی تھوڑی سی ذہنی وفکری آوارگی کی ضرورت ہے تبھی وہ مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑ سکتی ہے، تخیل کی بلند پروازی، محاکات کی رنگ آمیزی، طرز اظہار کی شوخی کے تام جھام کے ساتھ جب عروس غزل جلوہ افروز ہوتی ہے تبھی اس کی جانب فکر ونظر کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔

قاضی صاحب خالص علمی آدمی تھے، ان کا ذہن ومزاج تحقیقی تھا صداقت کی تلاش وجستجو اور حقیقت کی دریافت ان کی فطرت تھی اور غزل کی شاعری ہوا میں گرہ باندھنے کا کام ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ان کی تصنیفی مصروفیات میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو انھوں نے شاعری سے ایک دم توبہ کرلی۔

ان کے پاس ایک ضخیم مجموعہ کلام تھا اس میں ابتدائی دور سے لے کر آخری دور

تک کا کلام ہے، اس میں ہر طرح کا کلام ہے، مذہبی واصلاحی نظموں کا تناسب زیادہ ہے، ان میں کچھ نظمیں بڑی جاندار اور مرصع ہیں برجستگی وسلاست بھی ہے کہیں بڑے شگفتہ نمونے مل جاتے ہیں، ان کی مذہبی واصلاحی نظموں کا بڑا حصہ اس دور کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکا ہے، جن حالات اور فضا میں یہ نظمیں لکھی گئی تھیں یہ نظمیں ان کی عکاس ہیں اس لئے وہ پسند بھی کی جاتی رہیں۔

قاضی صاحب کا مکمل مجموعۂ کلام ان کے ورثاء کے پاس موجود ہے، ان کی ابتدائی زندگی کی علمی وادبی سرگرمیوں اور تدریجی ارتقا کا پورا پورا عکس ہے اگر اسی نقطۂ نگاہ سے اس کو شائع کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

آخری بات:

حضرت نانوتویؒ پر جب میری کتاب شائع ہوگئی تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے حضرت گنگوہیؒ کی سوانح حیات پر کام شروع کردیا تھا، کام بڑی تیزی سے چل رہا تھا، تقریباً دوسو صفحے سیاہ کر چکا تھا کہ ۱۴؍ جولائی کی شب میں قاضی صاحب کے صاحبزادے کا فون آیا کہ آج والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔

یہ چند لفظوں کی خبر تھی جو دل ودماغ پر بجلی بن کر گری، ہوش وحواس صبر وضبط، غور وفکر، قوت عمل سب کو خاکستر کرگئی، دماغ نے کام کرنا اور انگلیوں نے قلم پکڑنا چھوڑ دیا، چاہنے کے باوجود بھی ایک حرف نہ لکھ سکا مسودہ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا قلم ہاتھ میں لیتا قاضی صاحب کا حادثۂ وفات غموں کی سیاہ چادر آنکھوں کے سامنے تان دیتا، اس اندھیرے میں قلم نے چلنے سے انکار کردیا، میرے قابو میں اس وقت آیا جب خود یہ غمناک کہانی موضوع سخن بن گئی۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

احسان دانش

ذرہ جو آفتاب بن گیا

متوسط القامت، کسا ہوا بدن، ہلکا سانولا رنگ، کلین شیو، علی گڈھ پاجامہ، عمدہ سلی ہوئی سرج کی شیروانی، سر پر جناح کیپ، ہاتھوں میں بڑا اور خوبصورت چرمی بیگ، یہ ہیں ہندوستان کے مشہور و معتبر شاعر مزدور حضرت احسان دانش جو کبھی بن دانش کہے جاتے تھے وہ مزدوری اور گارامٹی اور معماری کرتے کرتے بزم شعر و ادب کے صدر نشین ہوگئے اور شعر و ادب کی مجلسوں میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے، ایک زمانہ تھا کہ ان کی زبان سے ان کی نظمیں سننے کے لئے لوگ دیوانہ وار ٹوٹے پڑتے تھے آزادی سے قبل جن چند مخصوص شعراء کی انقلاب آفریں نظموں کا سکہ رواں تھا لوگوں کے دلوں پر ان کی حکمرانی تھی اور جن کا ہر شعر عوام کے دلوں کی دھڑکن بن جاتا تھا انہیں میں حضرت احسان دانش بھی تھے، ان کی نظموں میں دلوں کو چھو لینے والی تاثیر تھی، جبر و استحصال کے شکار کسان اور مزدور طبقہ کی زندگی اور ان کے درد و کرب کی وہ ایسی منظر کشی کرتے تھے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی، کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر شعر دل کی گہرائیوں سے سراپا فریاد بن کر شاعر کی زبان پر آرہا ہے، فریاد کی لے یوں ہی کربناک ہوتی ہے پھر اس پر حضرت احسان دانش کے پڑھنے کا مخصوص اور پر اثر انداز، دونوں ہاتھ باندھے سرو قد اس طرح پر سکون کھڑے ہوتے کہ کسی عضو بدن میں ہلکی سی بھی جنبش نہیں ہوتی، پھر لب و لہجہ کا سوز و گداز، آواز کا درد، نہ بہت بلند اور نہ بہت پست، ایک نرم رو دریا کی روانی کی طرح وہ اپنی نظمیں سناتے تھے اور ہزاروں ہزار کی بھیڑ کے باوجود جب وہ نظمیں پڑھتے تھے تو مجمع پر ایک سناٹا چھا جاتا تھا، مشاعرہ گاہ جیسے شہر خموشاں بن جاتی تھی، ان کے لب و لہجہ میں تاثیر پیدا کرنے میں ان کے گہرے تجربات و مشاہدات کا بڑا دخل تھا جس کی وجہ سے ان کا

ہر شعر حقیقت و واقعیت کا مرقع بن جاتا تھا کیوں کہ انہوں نے وہ تمام اذیتیں جھیلی تھیں جو غربت وافلاس کے فولادی شکنجوں میں جکڑے ہوئے اس طبقہ میں عام ہیں، وہ درد و کرب کی ان تمام منزلوں سے گذرے ہیں جو مزدور طبقہ کا مقدر بن چکی ہیں اس لئے جب وہ اسٹیج پر آتے تھے تو غربت وافلاس کی گود میں پالے ہوئے وقت اور حالات کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طبقہ کے درد و کرب کا اپنے لفظوں میں اظہار کرتے تھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ احسان دانش نہیں بلکہ ظلم و جبر اور استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک مظلوم اور ستم رسیدہ انسان کی روح بول رہی ہے، چیخ رہی ہے، بین کر رہی ہے اور فریاد کر رہی ہیں چونکہ میں نے حضرت احسان کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے میرے یہ تاثرات الفاظ کی طلسم بندی نہیں، اظہار صداقت ہے۔

میں ۱۹۴۶ء کے اخیر میں ان سے لاہور میں ملا، بلکہ مجھے تین چار مہینے تک ان کی معیت حاصل رہی، ملاقات کی تقریب یہ ہوئی کہ مشہور مصنف قاضی اطہر مبارکپوری جو میرے مخلص اور بزرگ دوستوں میں سے ہیں وہ لاہور سے شائع ہونے والے واحد نیشنلسٹ اخبار ''زمزم'' سے وابستہ تھے، صحافت کو ذریعہ معاش بنانے کے ارادہ سے میں ان کے ساتھ لاہور پہنچ گیا، ہم لوگ اندرون بھاٹی گیٹ مبارک منزل میں رہتے تھے جس کے ایک حصہ میں اخبار زمزم کے ایڈیٹر مشہور صحافی عثمان فارقلیط قیام پذیر تھے اور احسان صاحب محلّہ مزنگ میں رہتے تھے، مزنگ کا فاصلہ یہاں سے دو کیلومیٹر کے قریب تھا ہم دونوں ہفتہ میں تین چار بار احسان صاحب سے ملنے مزنگ ضرور جاتے تھے، یہ ان کی بلند اخلاقی کا کرشمہ تھا کہ وہ ہم لوگوں سے برابر کے دوستوں کی طرح ملتے تھے اور کبھی کبھی اصرار کرکے شب کو روک لیتے اور مجبور کرتے کہ کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔

ایک دن حسب معمول ہم لوگ ان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے باتوں میں مصروف تھے کہ شام کی ڈاک سے ایک خط آ گیا احسان صاحب نے وہ خط مجھے دیتے ہوئے کہا

کہ استاد! پڑھو، وہ لکھنے پڑھنے والے بے تکلف دوستوں، اپنے ملنے والوں بلکہ بعض اوقات اپنے عقیدت مند شاگردوں کو بھی استاد کہہ کر مخاطب کرتے تھے، یہ ان کا اپنا مخصوص انداز خطاب تھا خط اردو میں صاف لکھا ہوا تھا مکتوب نگار نے لکھا تھا کہ میری کئی لاکھ کی جائداد کا عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے، وکیل نے کہا کہ اگر اپنے وطن کے کسی معزز اور مشہور آدمی کی شہادت عدالت میں پیش کردیں تو آپ کے حق میں فیصلہ ہوجائے گا، ازراہ کرم تشریف لاکر شہادت دیدیں تو بڑا اکرم ہوگا، خط سن لینے کے بعد انہوں نے جو کچھ بتایا اسے سن کر ہماری آنکھیں آنسوؤں سے چھلک آئیں، انہوں نے بتایا کہ یہ جن صاحب کا خط ہے وہ ہمارے وطن کاندھلہ کے بہت بڑے رئیس ہیں، میں جب اپنے وطن میں تھا تو ان کی کوٹھی میں پنکھا کھینچنے پر ملازم تھا، پہلے بجلی کے پنکھے عام نہیں تھے رئیسوں کے یہاں چھت میں کڑے لگا کر ایک لمبے تختے میں کپڑوں کے جھالردار پنکھے بنائے جاتے تھے، بیچ تختے میں ایک کڑے سے رسی باندھ کر کمرے سے باہر نکال دی جاتی تھی تاکہ نوکر کمرے سے باہر برآمدے میں بیٹھ کر پنکھا کھینچے، انہوں نے بتایا کہ ایک بار مئی یا جون کا مہینہ تھا وہ اندر کمرے میں آرام فرما تھے، دوپہر کا وقت تھا، میں برآمدہ میں بیٹھا ہوا پنکھا کھینچ رہا تھا، دیر تک پنکھا کھینچتے ہوئے تکان آگئی اور اس کے ساتھ غنودگی بھی، معلوم نہیں کب میرے ہاتھ سے رسّی چھوٹ گئی اور پنکھے کا چلنا رک گیا، میں بے خبری میں نیند کے جھونکے کھانے لگا وہ اندر کی گرمی سے پریشان ہوکر جھنجلائے ہوئے کواڑ کھول کر باہر نکلے اور مجھے اونگھتے ہوئے دیکھا تو اتنی زور سے میرے گالوں پر طمانچہ مارا کہ میرا سارا بدن جھنجھنا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے چنگاریاں ناچنے لگیں میری عمر اس وقت دس گیارہ سال تھی، آج بھی جب میں اس بھرپور طمانچے کی چوٹ کو سوچتا ہوں تو غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ اپنے گالوں پر چلا جاتا ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ابھی وہ طمانچہ میرے گالوں پر لگا ہے، یہ واقعہ سنا کر احسان صاحب تو ہنسنے لگے اور ہم پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی اور ہماری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

ایک بار ہم لوگوں کے ساتھ کچھ چیزوں کی خریداری کے لئے انارکلی چلے تو راستہ میں کئی بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ اس عمارت میں میں نے راجگیر کا کام کیا ہے، ایک بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلے کی بنی ہوئی ہے، یہاں میں نے گارا مٹی کا کام کیا ہے، اس دور کے کئی دلدوز واقعات سناتے ہوئے کہا کہ جب شام کو میں اپنے ساتھی مزدوروں کے ساتھ اپنے اڈے پر آتا تو سردیوں کے زمانہ میں دیوار کی پٹریاں جلا کر سارے مزدور ساتھی آگ تاپتے تھے، کیونکہ کسی کے پاس لحاف نہیں تھا، میں اسی الاؤ کی روشنی میں کاغذ پنسل نکال کر اشعار لکھتا تو میرے مزدور ساتھی آپس میں کہتے کہ ''سالا شاعری کرتا ہے'' انارکلی کی ایک دوکان سے انہوں نے اپنے دفتر کے لئے ناریل کا ٹاٹ خریدا، دکاندار نے ٹاٹ کو لپیٹ کر بنڈل بنایا اور اس کو ستلی سے باندھ دیا، قیمت دیکر جب احسان صاحب نے بنڈل اٹھا کر بغل میں دبایا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا چرمی بیگ اٹھایا تو میرے دوست قاضی اطہر مبارکپوری لپکے کہ ان کے ہاتھ سے بنڈل لے کر رکشے تک لے جائیں تو احسان صاحب نے کہا کہ آپ جیسے عالم فاضل میرا سامان اٹھائیں، یہ میرے لئے بڑے شرم کی بات ہے، اس کے بعد میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں آپ دونوں سے چھوٹا ہوں، مجھے دیدیجئے، لیکن احسان صاحب نے ایک نہ سنی اور کہا کہ انارکلی کی سڑکوں نے مجھے مزدوروں کے لباس میں چلتے پھرتے برسوں دیکھا ہے، آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی اور خود ہی بنڈل دکان سے رکشے تک پہنچایا، یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب احسان صاحب کے قدر شناس لاہور میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور اہل علم و فن ان کے شاعرانہ کمالات پر ایمان لا چکے تھے، اب وہ ہر مجلس میں اعزاز و احترام کے مقام پر بٹھائے جاتے تھے، لیکن وہ اپنے ماضی کو بھولے نہیں تھے بلکہ انتہائی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اس کو بیان بھی کرتے تھے، یہ ان کی فطری شرافت اور عالی ظرفی کی دلیل تھی، وہ اپنے ماضی کی عبرتناک تصویر پر حال کی سنہری چادر ڈال کر جھوٹی عزت کے قائل نہیں تھے، یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا، احسان صاحب کا کاروبار اچھا خاصا تھا،

مشاعروں سے بھی اچھی آمدنی ہوجاتی تھی، ایک دومنزلہ مکان رہائش کے لئے، اور اس کے بالمقابل ایک بڑا سا کتب خانہ تھا جو ایک ہندو شاگرد بھیم سین ظفر ادیب کی شرکت میں کامیابی سے چل رہا تھا، کتب خانہ سے متصل ان کا اپنا دفتر تھا جس میں صاف ستھرا زمینی فرش پڑا رہتا تھا، جس میں وہ اپنے ملاقاتیوں سے ملتے تھے، ان کا بڑا لڑکا ذیشان جامعہ ملیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا اور اس کو ایک معقول رقم اخراجات کے لئے بھیجتے تھے، خود بہت صاف ستھرا اور اچھا لباس استعمال کرتے تھے لیکن ابتدائی زمانہ کی تلخیوں نے ان کی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا، نمود ونمائش سے سخت نفرت تھی، سادگی، تواضع، بےنفسی، بےنیازی اس طرح ان کے دل ودماغ میں رچ بس چکی تھی، کہ پلنگ اور مسہری ہوتے ہوئے بھی یا تو تخت پر سوتے تھے یا زمین پر، محنت مزدوری کرنے والوں سے دل کھول کر ملتے تھے ان کا بڑا الحاظ وخیال رکھتے ان کے شاگردوں میں اس وقت کئی ایک حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تھے وہ چاہتے تھے کہ حضرت احسان کی کچھ خدمت کریں لیکن احسان صاحب نے ان سے ایک طرح قطع تعلق کر رکھا تھا نہ وہ کبھی احسان صاحب کے پاس آتے تھے اور نہ کبھی احسان صاحب ان سے ملنے جاتے تھے البتہ ان کے کئی شاگرد جو بعد میں اچھے شاعر اور ادیب اور مصنف ہوئے اور شہرت حاصل کی ان میں کوئی جوتے بناتا تھا کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرتا تھا، مشہور ناول نگار جو آج کل جاسوسی کہانیوں کے لئے مشہور ہیں، اظہار اثر جو دہلی میں اقامت گزیں ہیں اور شاعر عشرت کرت پوری جو غازی آباد میں سروس کرتے ہیں، درد احسانی وغیرہ اسی دور کے شاگرد اور حضرت احسان صاحب کے جاں نثاروں اور حاضر باشوں میں تھے جو احسان صاحب کے واسطے سے ہمارے بھی بے تکلف دوست ہوگئے تھے ان شاگردوں کی عقیدت کا یہ حال ہے کہ آج بھی وہ احسان صاحب کو ایک محسن کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں اور جب ان کی یاد آتی ہے تو کچھ دیر کے لئے اداس ہوجاتے ہیں، احسان صاحب صوم وصلوۃ کے پابند تھے اور جب نماز کا وقت قریب ہوتا تھا تو کان اذان کی طرف لگائے رہتے تھے نماز گھر میں پڑھتے تھے،

احسان صاحب کا وطن کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھا وہ مشہور عالم دین بانی تبلیغی جماعت مولانا الیاس کاندھلوی کو چچا کہتے تھے، ان کی تعلیم پرائمری درجات سے آگے نہیں بڑھی، کم عمری ہی سے محنت مزدوری میں لگ گئے چودہ سال کی عمر میں تلاش معاش میں لاہور چلے گئے یہیں وہ مزدور سے ترقی کر کے راجگیر (معمار) بنے اسی زمانہ میں انہوں نے شاعری شروع کی، انہوں نے لائل پور کے ایک مشاعرے میں پہلے پہل اپنی ایک نعت سنائی، کلام اور سوز وگداز میں ڈوبے ہوئے لب ولہجہ سے مشاعرہ لوٹ لیا، مشاعرہ ان کی شہرت کا سنگ بنیاد بنا، ان کے مجموعہ کلام ''نوائے کارگر'' کی بہت سی نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں ''نوائے کارگر'' کے علاوہ ''آتش خاموش'' نفیر فطرت'' چراغاں'' اور مقامات'' ان کے کلام کے مجموعے اس وقت تک شائع ہو چکے تھے، احسان فطرتاً شاعر تھے، شاعری جن حالات میں پنپتی ہے اور نشو ونما پاتی ہے ان سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، تعلیم واجبی سے بھی کمتر تھی، شعر وادب کا مطالعہ تو بہت دور کی بات، ماحول بھی اَن پڑھ مزدوروں کا ملا، نہ ذہنی وقلبی سکون میسر تھا نہ جسمانی اطمینان نصیب، فکر معاش کا زہریلا نشتر رگ رگ میں پیوست تھا، ان تمام باتوں کے باوجود وہ شاعری کرتے رہے، پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑوں میں مشاعروں میں شرکت کرتے رہے، خوش لباس شاعروں کے طعنے سنتے رہے اوان کی استہزاء کا شکار ہوتے رہے لیکن جب وہ مشاعرہ میں اسٹیج پر آتے، درد وکرب اور سوز وگداز سے بھرپور لب ولہجہ میں اپنی نظمیں سناتے تو اکثر لوگوں کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں اور استہزاء کرنے والے شعراء اپنی نگاہوں میں خود رسوا ہو جاتے۔

احسان غزل شاذ ونادر ہی لکھتے تھے، وہ غزل کے نہیں، نظموں کے شاعر تھے، وہ اس درد وکرب کے ترجمان تھے جو غربت وافلاس کے سینوں میں پرورش پاتا ہے، اس لئے جب وہ مشاعروں میں اپنی نظم پڑھتے تھے تو مجمع پر ایک سناٹا چھا جاتا تھا، داد وتحسین کا سلسلہ رک جاتا تھا، پورے مشاعرہ میں صرف ایک غمناک اور درد سے بھری ہوئی آواز گونجتی تھی اور وہ آواز احسان کی ہوتی تھی۔

احسان ایک خاموش انقلاب کے پیامبر تھے، وہ روح آزادی کو صرف بیدار کرنے کا فرض انجام دے رہے تھے، جو طبقہ جبر واستحصال کا شکار تھا وہ اس طبقہ کے نمائندہ تھے، وہ اس طبقے کی رگ وپے میں جو درد جو غم جو کرب کروٹیں لے رہا تھا اس کا اظہار کرتے تھے تا کہ غیرت وحمیت اور خوددار انسانیت بیدار ہو جو جہاد آزادی کی پہلی منزل ہے، رجز یا آتش نوائی کے لئے ان کا لب ولہجہ سازگار نہیں تھا، وہ کاروان آزادی کے حدی خواں تھے کہ یہ کارواں سبک رفتاری سے آگے بڑھتا جائے، کہیں راہ میں رکنے نہ پائے، اسی لئے ان کے لے کی آواز دھیمی تھی جو نشاطِ سفر تو پیدا کرتی تھی، جوش وخروش نہیں۔

ان کی قادرالکلامی اور پر گوئی کا بھی مجھے ایک تجربہ ہوا، میں نے ایک دن اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے پیش کی انہوں نے کہا پڑھئے میں نے پوری غزل سنادی وہ خاموشی سے سنتے رہے غزل تمام ہونے کے بعد کہا لکھئے، انہوں نے ایک شعر لکھوایا پھر دوسرا پھر تیسرا یہاں تک کہ میری غزل سے بڑی ایک دوسری غزل تیار ہوگئی، اور وہ قافئے استعمال کئے جو میری غزل میں استعمال نہیں ہوئے تھے، میرے کسی شعر میں کوئی ترمیم کی نہ کوئی مصرعہ بدلا، میری غزل اس سے پہلے اخبار مدینہ بجنور میں شائع ہو چکی تھی۔

احسان صاحب کے اس اضافہ کو اپنی غزل کے ساتھ تبرکاً لکھ لیا، اصلاح کا یہی طریقہ تھا وہ شاگردوں سے زبانی سنتے اور زبانی اصلاح دیتے جاتے تھے، ایک دن ہم لوگ حسب معمول حاضر ہوئے اور سلسلۂ گفتگو دراز ہو گیا تو انہوں نے اصرار کے ساتھ کھانے پر مجبور کیا، کھانے سے فراغت کے بعد جب دفتر میں آئے تو سلسلۂ گفتگو میں انہوں نے اپنی ایک رباعی سنائی جس میں اندھیری رات میں جگنوؤں کی چمک کو جنوں کی برات سے تشبیہ دی گئی تھی یہ ایک نئی تمثیل تھی میں نے اس کی تحسین کرتے ہوئے اس کی تشریح کی، تو بہت خوش ہوئے اور پھر جو رباعیات اور قطعات سنانے کا سلسلہ شروع ہوا تو رات کے دو بج گئے اور احسان صاحب سناتے چلے گئے پھر از راہ

ذرہ نوازی انہوں نے کہا کہ سنج تو بہت ملتے ہیں لیکن سخن فہم بہت کم، آج جی بھر کر آپ لوگوں کو میں نے اس لئے سنایا کہ آپ لوگوں نے اس ماحول، فضا اور کیفیت کو پا جانے کا احساس دلایا جو میں نے ان رباعیوں اور قطعات کو کہتے ہوئے پیش نظر رکھا تھا۔

آج ۴۸ سال بعد ان پر کیف مجلسوں کو یاد کرتا ہوں تو ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے، جنوری ۱۹۴۷ء کی ابتداء میں میں بیمار ہو کر وطن واپس آ گیا، مارچ ۱۹۴۷ء سے لاہور میں ہنگاموں کی ابتداء ہو چکی تھی فضا میں تناؤ اور تلخی بڑھتی جا رہی تھی، تقسیم ملک کا عذاب قریب آتا جا رہا تھا اور چند مہینوں بعد آنے والی قیامت کے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی تھی جس کا آغاز ملک میں فسادات، قتل وغارتگری، اور خوں ریزی کی تباہیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ ہو چکا تھا اس لئے جون ۱۹۴۷ء کے آخر میں رفیق محترم قاضی اطہر مبارکپوری اور مولانا عثمان فارقلیط اپنے اپنے وطن لوٹ گئے، دو مہینے بعد ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا، پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے پوری دنیا واقف ہے، پانچ سال بعد معلوم ہوا کہ احسان صاحب کے پارٹنر بھیم سین ظفر ادیب دہلی آ گئے یہیں اپنی پوری زندگی گذاری اور یہیں وفات پائی وہ احسان صاحب کی زندگی پر کوئی کتاب مرتب کر رہے تھے اس سلسلے میں وہ کئی بار لاہور جا کر احسان صاحب سے ملے بھی تھے پھر پتہ نہیں چلا کہ کتاب کا کیا حشر ہوا؟ قاضی صاحب سے معلوم ہوا کہ خود احسان صاحب نے ''جہان دانش'' کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی، لیکن مجھے وہ کتاب نہیں مل سکی، تقسیم کے بعد حضرت احسان دو تین بار ہندوستان مشاعروں میں آئے لیکن میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی، یہ بھی سنا تھا کہ وہ مزنگ کا مکان چھوڑ کر انارکلی میں آ گئے ہیں یہیں ان کا رہائشی مکان بھی ہے اور کتب خانہ بھی۔

احسان صاحب اپنی عسرت وتنگدستی کی وجہ سے پرائمری سے آگے نہیں پڑھ سکے تاہم اپنے ذوق وشوق سے نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی کا وسیع مطالعہ اس زمانہ میں کیا جب وہ مزدوری کرتے تھے اور بڑی ادبی مہارت پیدا کی، مزدوری،

معماری، باغبانی، اور چوکیداری جیسے پیشوں کو اختیار کرتے رہے لیکن کتب بینی برابر جاری رہی، احسان صاحب شاعر مزدور تھے یہ رنگ پسند گروپ سے ہمیشہ علیحدہ رہے ان کی بہت سی نظموں نے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی جس مشاعرہ میں پہنچ جاتے اسے لوٹ لیتے۔

اعظم گڈھ میں ۱۹۳۸ء میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا جس میں ملک کے مشاہیر شعراء کے ساتھ احسان صاحب بھی شریک ہوئے تھے، میں نے اسی مشاعرہ میں ان کی مشہور نظم ''جشن بیچارگی'' پڑھتے ہوئے سنی، نظم میں ایک غریب مزدور کی لڑکی کی شادی کی منظر کشی کی گئی ہے، غربت وافلاس کی گود میں پلی ہوئی لڑکی سرخ جوڑے میں ماں باپ سے رخصت ہونے کے لئے کھڑی ہے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی بار بار آنکھوں کو پونچھتی ہے، سسکیوں اور ہچکیوں سے پورا بدن کانپ رہا ہے کہ افلاس کا مارا اس کا بوڑھا باپ آخری نصیحت کرنے اور اپنی لخت جگر کو رخصتی کے الفاظ کہنے کے لئے آتا ہے، دولہن بنی ہوئی بیٹی کے سر پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھتا ہے اور ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان نصیحت کرتے ہوئے تسلی دیتا ہے۔

زیور جو نہیں ہے تو خدا ساتھ ہے بیٹی
لاج اس مری ڈاڑھی کی تیرے ہاتھ ہے بیٹی

درد وکرب کا یہ کلائمکس اور نقطۂ عروج ہے، پوری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے غربت وافلاس کا زہر جو باپ کی نس نس میں سمایا ہوا ہے اس کا علاج تو اس کے بس میں نہیں تھا اس لئے اپنی بیٹی سے جو اس کے گھر سے رخصت ہو کر اجنبی لوگوں میں جارہی ہے دل کے پورے درد کے ساتھ ہر آنے والی مصیبت کو برداشت کرنے کی نصیحت کرتا ہے اور سب سے کربناک جملہ کہتا ہے کہ لاج اس مری ڈاڑھی کی ترے ہاتھ ہے بیٹی! احسان صاحب کے پڑھنے کے انداز نے کچھ ایسا سماں باندھا کہ جو مشاعرہ دوسرے شاعروں کے کلام پر داد تحسین کے ہنگاموں سے گونج رہا تھا ابھی احسان صاحب نے اپنی نظم کے چند ہی اشعار پڑھے تھے کہ مجمع پر شہر خموشاں کی کیفیت

طاری ہوگئی، مشاعرہ کے بعد ہر شخص کی زبان پر احسان صاحب ہی کا نام رہ گیا، یہی نظم حاصل مشاعرہ ہوکر رہ گئی، جب وہ اعظم گڈھ کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرہ میں گئے جو دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا یہی نظم سنائی تو وہاں کے ایک استاد نے اپنے مضمون میں لکھا کہ اس نظم کو سن کر سامعین میں سے کچھ ایسے آبدیدہ ہوگئے کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اس کے بعد دو تین دنوں تک احسان صاحب علی گڈھ میں رہے جس پروفیسر کے یہاں جاتے تو اندرون خانہ سے اسی نظم کی فرمائش ہوتی اور اس کو سن کر مستورات کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔

(قومی آواز لکھنؤ ۴؍اپریل ۱۹۸۲ء)

۲۴؍ مارچ ۱۹۸۲ء کے قومی آواز میں حضرت احسان کی وفات کی خبر شائع ہوئی تو پڑھ کر کلیجہ دھک سے ہوگیا، افسوس

خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

ایک عہد ساز شخصیت

جس نے اسلامی ہند کو اندلس نہیں بننے دیا

یورپ کی سامراجی طاقتوں نے اپنی اپنی ہوس ملک گیری کے عفریت کو مذہبی لباس پہنا کر اپنی حکومت کے استحکام کا ایک تجربہ آج سے ڈھائی تین سو سال قبل اندلس میں کیا جہاں نوسوسالہ مسلم حکومت کو اپنی متحدہ فوجی طاقت اور سیاسی حکمت عملی سے فتح کیا اور اپنی حکومت کو دیرپا اور اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کا جال بچھایا اور عیسائی پادریوں کی ایک پوری فوج کو اس مورچہ کے فتح کرنے پر لگا دیا لیکن جب یہ مرحلہ دیر طلب محسوس ہوا تو انہوں نے جبر وقہر کی سان چڑھائی ہوئی تلواریں سونت لیں اور ہر سر کو مجبور کیا کہ وہ صلیب کے سامنے سجدہ ریز ہوجائے اور جو اکڑنے کی کوشش کرے اس کی گردن ماردی جائے، تجربہ ان کا کامیاب رہا پر اس طرح پورے اندلس پر صلیب پرستوں کا ایسا جابرانہ وقاہرانہ قبضہ ہوگیا کہ کسی بھی توحید پرست متنفس کو اندلس کی فضاء میں سانس لینے کی اجازت نہیں رہی، کسی مسلمان کو اپنی نوسوسالہ عظمت واقتدار کی نشانیوں کو مڑ کر دیکھنے کی بھی مہلت نہیں دی گئی جہاں کبھی وہ شان وشوکت اور رعب ودبدبہ کے ساتھ حکمراں رہے اسی سرزمین میں ان سے ایک محکوم اور غلام کی حیثیت سے بھی جینے کا حق چھین لیا گیا ان کا پُرہیبت آوازوں میں اعلان تھا یا تو عیسائی ہوجاؤ یا اس سرزمین سے دور نکل جاؤ پھر دوبارہ اس کی عظمت کی طرف مڑ کر دیکھا تو تمہارا سر تمہارے قدموں میں ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پورے ملک میں ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار مسلمانوں کو عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا ننگی تلواروں کے سائے میں ان کو بپتسمہ دیا گیا، جن بزدل، بے غیرت اسلام کا نام لینے والوں نے ایمان کے بجائے اپنی جان کی حفاظت کو

اولیت دی وہ سب کے سب عیسائی ہو گئے جو غیرتمند ایمان پر ثابت قدم تھے انہوں نے اندلس کی سرزمین ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی اور کئی نسلوں تک خانہ بدوشی کی مصیبت بھری زندگی گذارتے رہے۔

یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا کہ حکمراں عیش پسند اور تملق پسندوں کے نرغے میں گھرے رہے وہ اس شدید غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ دولت وحکومت ان کی زرخرید کنیز ہے وہ ہمارے قبضہ واختیار سے کبھی باہر نہیں جاسکتی ملک کے علماء ومشائخ تقرب سلطانی حاصل کرنے، دولت دنیا سمیٹنے اور پیری مریدی کی دکان سجانے میں لگے رہے ان کے سینوں میں اسلامی غیرت وحمیت مر چکی تھی، ایمانی جرأت وشجاعت دنیا طلبی کے بوجھ سے دم توڑ چکی تھی اور جب عیسائیت ان پر حملہ آور ہوئی تو وہ بزدلوں اور بے غیرتوں کی طرح گوشۂ عافیت تلاش کرتے رہے اور سامان تعیش چھن جانے پر عورتوں کی طرح ٹسوے بہاتے رہے اسلام کے مٹ جانے اور شمع ایمان کے بجھ جانے کا غم نہیں تھا اسلام کے تحفظ اور ایمان کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دینے کا جذبہ فنا ہو چکا تھا اس لئے وہ دشمن کا مقابلہ کر کے عیسائیت کی یلغار کو روکنے کی نہ ان میں ہمت وجرأت تھی اور نہ ان کے بازوؤں میں طاقت وقوت وہمت وغیرت، حد یہ ہے کہ غرناطہ کا حکمراں ابوعبداللہ فرڈی فنڈ اور ازابیلا کو قلعہ کی کنجیاں جان کی امان پر حوالہ کر کے محل میں روتا ہوا اپنی بہن عائشہ کے سامنے گیا تو اس کی غیور اسلامی حمیت وغیرت اور جرأت ایمانی کی پیکر جذبات سے کھولتی ہوئی بہن نے جو کہا وہ اسلامی تاریخ میں آب زر سے لکھا گیا، اس نے خشمگیں نگاہوں سے بھائی کو دیکھا اور کہا:

''جب تم نے بہادر مرد اور غیرت مند مسلمان کی طرح اپنی حکومت اور اسلامی اقتدار کی حفاظت کیلئے اپنی جان نہیں دے دی تو اب عورتوں کی طرح آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟ تم کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے، تم نے ناموران اسلام اور اپنے غیور آباء واجداد کی آبرو خاک میں ملا دی، مجھے ایسے بے غیرت بھائی کی بہن بننا منظور نہیں''

☆☆☆

انجام کار:

صلیب پرستوں کے سامنے پسپائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نو سو سالہ حکومت کے دور عروج کی ساری علامتیں اور نشانیاں حرف غلط کی طرح مٹا دی گئیں قلعہ حمرا کی بلند و بالا فصیلوں سے اسلامی پرچم کو اتار کر وہاں صلیبی جھنڈا لہرا دیا گیا دنیا کی مشہور ترین عظیم الشان مسجد قرطبہ جو اپنے طول وعرض اور اپنی آرائش وزیبائش اور عظمت وجلال کے اعتبار سے لاثانی اور بے مثال تھی وہ گرجا گھر بنا دی گئی کسی مسلمان کو وہاں سجدہ ریز ہونے تک کی اجازت نہیں رہی جس دن ایوان حکومت سے اسلام کا پرچم اتارا گیا اس دن سے آج تک اندلس کی ہزاروں ہزار مسجدوں کے بلند میناروں سے صدائے توحید اللہ اکبر کی آواز فضا میں بلند نہیں ہوئی اور آج تک وہ سرزمین اللہ اکبر کی آواز سے محروم چلی آرہی ہے، اتنا وسیع وعریض، سرسبز وشاداب، حسین وجمیل ملک مسلمانوں سے ایک دم خالی ہوگیا، آج بھی کوئی مسلمان سیاح قرطبہ میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ لے یہ ناممکن ہے، اندلس کی شکست اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کی بدترین شکست ہے اس شکست سے اسلام اور مسلمانوں کی پوری تاریخ داغدار ہوگئی، اندلس کی تاریخ پڑھتے ہوئے غیور اور حساس دل کے سارے زخم ہرے ہوجاتے ہیں اور ان سے خون رسنے لگتا ہے۔

ہندوستان میں دوسرا تجربہ کرنے کی کوشش:

اندلس پر قبضہ کرنے کے سو سال بعد ہندوستان میں بھی انگریزی سامراج نے یہی تاریخ دہرانے کی کوشش کی، ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کو مکمل طور پر شکست دینے کے لئے عیسائیت کو ہندوستان پر مسلط کرنے کی ہر امکانی کوشش کی، لیکن ایک مرد مسلمان ایک مجاہد اسلام نے اپنی قوت ایمانی سے وہ حیرتناک کارنامہ انجام دیا کہ اتنی بڑی جابر وقاہر حکومت کی منصوبہ بندی کی شیرازہ بندی ٹوٹ

کراس کا ہر ورق ناکامی کی فضاؤں میں اڑ کر گم ہو گیا۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے نہیں تاجر اور سوداگر کی حیثیت سے آئے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی ان کے کاروباری ادارے کا نام تھا یہ بنگال اور مدراس میں بانس، بھوسہ، مچھلی اور تیل کی تجارت کرتے تھے اور اس کے منافع پر گذر بسر کرتے تھے یہاں محنت ومشقت کر کے جو کمائی کرتے تھے وہ اپنے خاندان والوں کو اپنے وطن بھیجتے رہتے تھے بالکل ایسے جیسے آج خلیجی ممالک یا ملیشیا وغیرہ میں ہندوستانی تجارت یا ملازمت کر کے گذر بسر کرتے ہیں، بالکل یہی حال انگریزوں کا تھا لیکن اس کاروباری زندگی میں ان کو کچھ تجربے حاصل ہوئے، انہوں نے دیکھا کہ یہاں ضمیر اور ایمان بھی سستے نرخ پر مل جاتا ہے۔

ہندوستان میں طوائف الملوکی:

ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی اس لئے پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی ہر علاقہ میں چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں تھیں ہر دربار میں اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے سازشیں ہوتی رہتی تھیں ہر جگہ برسر اقتدار حکمراں کے خلاف ایک مخالف طاقت ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتی تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی اس صورت حال سے واقف تھی انگریزوں نے اپنے کاروباری مفادات کے لئے ایک چھوٹی سی فوج مرتب کر رکھی تھی، جس میں ٹامی نسل کے لچے لفنگے، غنڈے یورپ کے شہروں کے جرائم پیشہ افراد یورپ سے بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے ان کو کمپنی نے اپنی فوج میں شامل کر لیا، ان کو جدید طرز کے اسلحہ فراہم کرائے گئے وہ انتہائی خونخوار اور جری تھے بظاہر یہ تجارت کی حفاظت کے لئے تھے، لیکن ہندوستان میں فتوحات کا دروازہ اسی فوج نے کھولا، بنگال کے حکمراں سراج الدولہ کے دربار میں اقتدار کے لئے رسہ کشی چل رہی تھی سراج الدولہ کے مقابلہ میں محمد قاسم تخت حکومت کا دعویدار تھا اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد طلب کی کمپنی اس کی مدد کے لئے حق المحنت طے

کر کے تیار ہوگئی اور سراج الدولہ کے وزیر جنگ میر جعفر کو خرید لیا جب سراج الدولہ اور کمپنی کی فوج کا مقابلہ ہوا تو سراج الدولہ کی فوج کی توپوں میں گولوں کے بجائے بھس بھرا ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند گھنٹوں میں سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو چند ہزار انگریزی فوج نے شکست دے دی میر قاسم کو تخت حکومت مل گیا اور کمپنی کو اتنی بڑی دولت ملی کہ سال بھر کی تجارت میں بھی اتنا منافع نہیں مل سکتا تھا، سب سے بڑا افائدہ کمپنی کو یہ ہوا کہ بنگال کی حکومت پر کمپنی کا درو بست قائم ہوگیا جس کو چاہا تخت پر بیٹھا دیا جس کو چاہا تخت سے اتار دیا۔

کرناٹک میں نواب محمد علی اور چاند شاہ کو لڑا کر یہی کھیل کھیلا گیا، میسور میں سلطان ٹیپو کے خلاف اس کے وزرا میر صادق اور پورنیا وغیرہ کو لالچ دے کر ان کو خرید لیا اور ان کو اپنی سازش میں شریک کر کے اتنی طاقتور اور مضبوط حکومت کو کمپنی نے تہس نہس کر کے رکھ دیا مرہٹوں کی طاقت نا قابل تسخیر مانی جاتی تھی لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی ناک میں نکیل ڈال کر اپنا مطیع وفرماں بردار بنالیا حیدر آباد کو فوجی دباؤ میں لے کر نواب حیدر آباد کے دربار میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا جس کی مرضی کے بغیر نواب صاحب کوئی حرکت نہیں کر سکتے تھے واجد علی شاہ کو بیک بنی ودو گوش لکھنؤ سے نکال کر مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کر دیا، آخر آخر میں دہلی دربار میں کمپنی کا دخل بڑھ گیا حکومت چھین کر بادشاہ کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور اس کو بے دست و پا کر دیا گیا اس طرح پورے ملک میں کہیں بھی انگریزوں کو کسی بڑی فوج کشی کی نوبت نہیں آئی اور پورے ملک پر قبضہ ہوگیا اور یہ قبضہ اتنے رعب داب اور دبدبہ کے ساتھ تھا کہ ان چند مٹھی بھر انگریز کے سامنے کسی کو کھڑے ہونے کی جرأت وہمت نہیں ہوتی تھی چند انگریز ہندستانیوں کے بڑے سے بڑے مجمع کی طرف سے گذر جاتے وہ مجمع کائی کی طرح پھٹ جاتا، اس صورت حال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دماغ آسمان پر پہنچا، لندن میں عیش وعشرت کے شادیانے بجنے لگے۔

☆☆☆

اقتدار کو مستحکم کیا جائے:

اب ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے مقبوضات پر قابو رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی فوجی طاقت کو مضبوط بنائے اور فوج بھی مکمل وفادار ہو ہندوستان کے باشندوں پر بھروسہ کرنا خطرہ مول لینا تھا اور اتنی بڑی تعداد میں یورپ سے انگریزوں کو یہاں لانا ممکن نہ تھا جو پورے ہندوستان پر کنٹرول کرسکیں اس لئے انگریزوں نے یہیں کے ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ فوج بنائی، بالکل ویسی ہی جیسی مغلیہ دورِ حکومت میں مشترکہ فوج تھی اسی نہج پر بلکہ بڑی حد تک وہی قدیم فوج ایسٹ انڈیا کمپنی کی وفادار ہوگئی، لیکن کمپنی کبھی بھی اس ہندوستانی فوج پر کلی طور سے مطمئن نہیں رہی، کسی بھی وقت وطن پرستی کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہے اور کمپنی کی حکومت و اقتدار کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے، کمپنی کے ڈائرکٹروں نے لندن میں اپنے ذہین ترین افراد سے اس سلسلہ میں استصواب رائے کیا انگلینڈ کی حکومت سے صلاح ومشورے کئے، بہت غور وفکر کے بعد طے کیا گیا کہ جس طرح اندلس میں عیسائیت کی تبلیغ کر کے پورے ملک کو عیسائی بنا کر حکومت کو استحکام دیا گیا اور اس کو نا قابل تسخیر بنایا گیا بالکل اسی نہج پر ہندوستان میں بھی یہاں کے باشندوں کی اکثریت کو عیسائی بنا کر اس تجربہ سے فائدہ اٹھایا جائے جب حاکم ومحکوم دونوں کا مذہب ایک ہوجائے گا تو فطری طور پر رعایا حکومت کی وفادار ہوگی اس طرح ہندوستان پر ہماری حکومت زوال کے خطرے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجائے گی، اندلس میں مسلم حکومت کے سقوط کے بعد عیسائی حکومت کو اسی لئے استحکام حاصل ہوا کہ اب اس سرزمین میں کوئی غیر عیسائی نہیں رہ گیا تھا۔

پورے ملک کو عیسائی بنادیا جائے:

انگلینڈ کی حکومت نے کمپنی کے مشورے کی تائید کی اور لندن پارلیمنٹ میں اس اسکیم کی توثیق کی گئی، حکومت نے اس اسکیم کے خاکے میں رنگ بھرنے کا آغاز کردیا۔

شہری آبادی سے بہت دور جنگلی علاقہ میں جہاں عام لوگوں کا گذر نہیں تھا وہاں

ایک فصیل بند مدرسہ قائم کیا اسلامی علوم وفنون کے ماہر اساتذہ فراہم کئے اور شہری علاقہ کے نوجوانوں کو ان علوم اسلامی وفنون کے ماہر اساتذہ فراہم کئے اور شہری علاقہ کے نوجوانوں کو ان علوم اسلامی کی تحصیل کے لئے داخل کیا گیا ان کو بیش قرار ماہوار وظیفہ اور تعلیم کی تکمیل کے بعد بہترین مستقبل کی ضمانت دی گئی، تعلیم وتربیت کا طریقہ یہ رکھا گیا کہ اس ادارہ میں اسٹاف اور طلبہ کے علاوہ کسی بھی شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں رکھی گئی اگر مصلحت کا تقاضا ہوا کہ کسی کو اس ادارہ کا معائنہ کرایا جائے تو انگلینڈ کی حکومت کے وزیر داخلہ سے باضابطہ اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہوگا، عام شاہراہ سے جو ذیلی سڑک ادارہ کی طرف جاتی ہے اس روڈ پر جلی قلم سے لکھا ہوا بورڈ لگا ہوا تھا ''یہ عام راستہ نہیں ہے'' یعنی اس سڑک پر سواری کے مڑتے ہی پولس گذرنے والے کو گرفتار کرسکتی تھی، سرکاری اجازت نامہ صرف قانونی گنجائش تھی ورنہ عملاً کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جاتی تھی حکومت کے اہم ترین ارکان ہی ادارہ کی ضرورتوں کے تحت وہاں جاسکتے تھے، ادارہ میں تمام اساتذہ انگریز تھے جو اسلامی علوم وفنون قرآن وحدیث فقہ وتفسیر اور تاریخ وسیرت کے ماہرین مانے جاتے تھے، عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ان کو درجہ کمال حاصل تھا اور فصیح زبان بولتے اور لکھتے تھے، کئی درجن انگریز اساتذہ اور طلبہ یونیفارم لمبی لمبی سفید عبائیں، عمامے، مولویانہ پاجامے، چہرے پر خوبصورت داڑھیاں عربی وضع قطع، عربی میں سلام وکلام مزاج پرسی سوال وجواب بالکل ایسے ہی جیسے دارالعلوم دیوبند میں طلبہ واساتذہ رہتے ہیں کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ سب سخت قسم کے عیسائی ہیں، اس ادارہ میں پہنچ کر ایک مسلمان حیرت زدہ رہ جائے کہ اس جنگلی علاقے میں علماء اسلام کی یہ مقدس جماعت زمین سے نکل پڑی ہے یا آسمان سے اتر آئی ہے، قدآور خوبصورت گورے چٹے صاف شفاف اسلامی لباس میں ملبوس اساتذہ وطلبہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے نورانی فرشتوں کی کوئی جماعت اس سرزمین پر اتر پڑی ہے، خالص اسلامی ماحول اس ادارہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

چھ سات سال کے نصاب اور دوران تعلیم یونیفارم عربی اور اردو زبان کی پابندی ہر ایک کے لئے لازم تھی، کسی بھی وقت اپنی مادری زبان استعمال کرنے کی ان کو اجازت نہیں تھی، اس طرح یہ ادارہ ۱۸۰۰ء سے اپنے طلبہ کو تعلیم دے رہا تھا اور ان کو تربیت دیتا تھا ہمارے عربی مدارس کی کتابیں داخل درس تھیں انہیں کتابوں سے ان کو اسلام پر اعتراضات کرنے کا فن سکھایا جاتا تھا اور جب نصاب مکمل ہوجاتا تھا تو انکو ماہر علوم اسلامیہ کی ڈگری دے دی جاتی تھی اور وہ بڑے بڑے گرجا گھروں میں پادری بن کر لمبی سے لمبی تنخواہ پاسکتا تھا اور انگلینڈ کی حکومت اپنے کسی مقبوضہ ملک میں سرکاری الاؤنس اور تنخواہ پر بھیج سکتی تھی، اس ادارہ کے طلبہ تکمیل نصاب کے بعد عربی اردو زبانوں کے ماہر، فراٹے سے ان زبانوں میں تقریریں کرنے والے، اسلامی کتابوں کے حوالے دینے والے، احادیث اور روایتوں پر نقد و جرح کرنے والے تیز وطرار عالم مانے جاتے تھے۔

ہندوستان میں پادریوں کی فوج:

اسی ادارہ کے تربیت یافتہ پادریوں کو ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں بھیجا گیا تاکہ پورے ملک کو عیسائی بنانے کی مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

یہ ادارہ انیسویں صدی کے آخر تک رہا، اس کے تربیت یافتہ نوجوان جوش وجذبہ سے بھرے ہوئے پادری ہندوستان کے ہر خطہ میں متعین کردیئے گئے، ملتان وپشاور سے لے کر آسام و برما تک ان کی تگ و دو جاری ہوگئی اور دارالحکومت دہلی میں لندن کا اسقف اعظم پادری پی فنڈر اپنے معاون پادریوں کی ایک ٹیم کے ساتھ عیسائی پادریوں کی فوج کی کمان سنبھالے ہوئے تھا اور خود اس کی ذاتی سرگرمیاں دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے شروع ہوکر اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کی مجلسوں تک جاری تھیں۔

یہ عیسائی مشنریز اپنے ساتھ پریس بھی لائے تھے جب کہ ہندوستان میں ابھی پریس نہیں تھا سردھنہ اور مرزاپور میں ان کے بڑے بڑے پریس تھے ان چھاپہ خانوں میں

اہل قلم عیسائی پادری مقرر کئے گئے جو اردو میں اسلام کے خلاف کتابیں لکھ کر طبع کراتے اور ملک میں مفت تقسیم کرتے، بازاروں، میلوں ٹھیلوں میں اس کی اشاعت کرتے تمام پادریوں کی ذمہ داری تھی کہ جن جن مواقع پر ہندوستانیوں کا اجتماع ہوتا ہے جیسے ہندوؤں کے سالانہ میلے، تیرتھ گاہیں، مسلمانوں کی نماز جمعہ اور عیدین کے تیوہار وہاں اپنے اسٹال لگائیں، اردو زبان میں عیسائیت کے فضائل ومناقب پر تقریریں کریں اپنا لٹریچر اور انجیل کے چھوٹے چھوٹے نسخے تقسیم کریں۔

حکومت کے تمام افسران، عہدیداران گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر ان کو بنایا جائے جو خود بھی پکے عیسائی ہوں اور اسی کے ساتھ مشنری ذہن ومزاج کے ہوں اور ان کو عیسائیت کی تبلیغ اور فروغ سے ذاتی دلچسپی ہو، تمام انگریز افسران کو حکم تھا کہ جن علاقوں میں پادری تبلیغ کے لئے جائیں پولیس کو ان کی حفاظت کے لئے مقرر کریں، پولیس پادری کے ساتھ ساتھ رہے تا کہ کسی کو پادریوں سے الجھنے کی ہمت نہ ہو اور نہ کوئی خلفشار پیدا کرنے کی جرأت کرے، ترغیب وترہیب کے سارے وسائل اختیار کرنے کا ان کو حق حاصل تھا، ہندوؤں یا مسلمانوں میں جو معزز شخص عیسائیت قبول کرلے اس کو اعزاز واکرام عزت وعہدہ حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقعہ دیا جائے ان کو ہر طرح کے عیش وآرام کی سہولتیں فراہم کرائی جائیں، ان کو فروغ عیسائیت کے معاملہ میں شریک صلاح ومشورہ کیا جائے اگر مسلمانوں کے اہل علم طبقہ میں سے کوئی عیسائی ہوجائے تو اس کو پادری کا عہدہ اور تنخواہ دی جائے، پادری محی الدین پشاوری، پادری صفدر علی، پادری علی، پادری عبدالکریم، پادری عمادالدین وغیرہ اس دور کے مشہور اور سرگرم پادری تھے جو علماء اسلام سے مناظرہ کرنے اور اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے میں پیش پیش تھے۔

دہلی کی جامع مسجد کو گرجا گھر بنانے کا فیصلہ:

مسلمان اور ہندو جو سرکاری ملازم تھے ہر ایک کو اتوار کے دن اپنے افسر کے

بنگلہ پر حاضر ہوکر پادریوں کی تقریریں سننی ضروری تھیں اور وہ اس کی پابندی کرنے لگے تھے، پھر اس کے بعد براہ راست تمام مسلمانوں اور ہندو ملازموں کو فرداً فرداً خط لکھا گیا کہ جلد سے جلد عیسائیت قبول کرلیں ورنہ ملازمت سے سبکدوش کردیئے جائیں گے اور سب سے آخر میں کلکتہ کے لاٹ پادری ویڈمنڈ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دارالحکومت کلکتہ میں رہتا تھا جو پورے ملک میں عیسائیت کی مہم کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار تھا اس نے ایک کھلا خط شائع کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہر ہندوستانی از خود جلد از جلد عیسائیت قبول کرلے اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا ورنہ نتیجہ کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، یہ آخری الٹی میٹم تھا کہ اب اس کے بعد بزروطاقت ان کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کردیا جائیگا، اتنی سخت وارننگ کے باوجود پورے ملک سے احتجاج کی ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی انگریزی حکومت نے سمجھ لیا ہندوستانیوں کی حمیت وغیرت مرچکی ہے، بالخصوص مسلمانوں کی غیرت ایمانی دم توڑ چکی ہے اب اس میں کسی جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رہ گئی ہے اس لئے اس نے دہلی کی مشہور شاہجہانی جامع مسجد جو قلب شہر میں واقع ہے اس کو بڑا گرجا گھر بنانے کا فیصلہ کرلیا اور بڑی سرگرمی سے گردوپیش کا جائزہ لے کر اس سلسلہ میں عملی اقدام کے امکانات کا جائزہ لیا جانے لگا، لندن کے اسقف اعظم پادری پی فنڈر کو اسی جائزہ کے لئے لندن سے بلا کر دارالحکومت دہلی میں متعین کیا گیا۔

پادری فنڈر کا چیلنج:

پادری پی فنڈر نے لندن میں قیام کے دوران ایک کتاب ''میزان الحق'' کے نام سے اردو میں لکھی تھی، جس میں دین عیسوی کے برحق ہونے کے دلائل اور اسلام کے باطل ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا اور جب اس کو شائع کیا گیا تو لندن میں ہر حلقہ سے کتاب کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا اور پادریوں کی اکثریت نے کہا کہ یہ کتاب الہام سے لکھی گئی ہے اس کا جواب دینا ممکن نہیں، جو کتاب الہام سے لکھی گئی ہو اس کا

جواب دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، ہر چہار جانب کی تعریفوں سے پادری فنڈر کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اس نے یقین کرلیا تھا کہ علماء اسلام سے اس کا جواب ناممکن ہے وہ یہی کتاب ''میزان الحق'' لے کر دارالحکومت دہلی آیا اور کتاب تقسیم کر کے چیلنج کیا کہ اگر مسلمان اپنے کو اہل حق سمجھتے ہیں تو اس کتاب کے دلائل کو توڑ دیں اور کتاب کا جواب لکھ دیں۔

چیلنج منظور ہے:

یہ ۱۸۵۴ء کے آغاز کی بات ہے، پورے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا اور حکومت پورے ملک کو عیسائی بنانے پر تلی ہوئی تھی پورا ملک اس کی مٹھی میں تھا، ہر شخص سہما ہوا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ فنڈر کی زبان میں ایک ظالم و جابر حکومت بول رہی ہے، فنڈر کا جواب دینے کا مطلب حکومت سے جنگ کرنی ہے اور اس کے لئے کوئی تیار نہیں تھا، عوام کی تو کیا حیثیت تھی بادشاہ وقت خود لال قلعہ کی چہار دیواری میں قید تھا اور کمپنی کا وظیفہ خوار تھا قلعہ کی فصیل کے باہر اس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی پوری دہلی پر کمپنی حکمراں تھی ہندوستان میں اسلام اسی بے بسی و بے کسی کے عالم میں تھا کہ ایک غیرتمند مرد مسلمان اٹھا اور پادری پی فنڈر کے چیلنج کے جواب میں پوری قوت ایمانی کے ساتھ اعلان کیا کہ میں مجمع عام میں پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہوں وہ مرد مسلماں اور مجاہد اعظم **مولانا رحمت اللہ کیرانوی** تھے۔

مناظرہ کے وقت ماحول اور فضا:

تبلیغ عیسائیت کا ماحول اتنا گرم ہو چکا تھا کہ سرسید جیسا انگریز پرست بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ دارالحکومت دہلی میں جتنے سرکاری ملازم تھے اور چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز تھے چاہے وہ ہندو رہے ہوں یا مسلمان ہر ایک کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ امروز فردا میں ہم سب لوگوں کو چاہے بہ رضا و رغبت چاہے بہ جبر و اکراہ عیسائیت قبول کر لینا

پڑے گا، فرداً فرداً ملازم کو چٹھیوں اور سرکلر کے ذریعہ ان کو عیسائیت قبول کرنے کی دعوت ملتی رہتی تھی۔

ابھی جبر وقہر کا مرحلہ نہیں آیا تھا البتہ کلکتہ کا بڑا پادری ایک کھلا خط تمام ہندوستانیوں کے نام لکھ چکا تھا کہ اب ہر شخص کو عیسائیت قبول کر لینا ضروری ہو گیا ہے خط پڑھ کر کچھ ضمیر فروش تو عیسائیت قبول کر چکے تھے کچھ تذبذب میں تھے، بقیہ تمام لوگ کانپ کر رہ گئے کہ اب ایمان کی خیر نہیں، ہفتہ دو ہفتہ میں جبری حکم نافذ ہو کر رہے گا اگر ہم نے عیسائیت قبول نہیں کی تو ہم سے اس سرزمین پر زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جائے گا، یہ سوچ کر جن کے دلوں میں ایمان کی حرارت تھی ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا نہیں کوئی ان کو صحیح راہ دکھانے والا نہیں کوئی بھی ان کی فریاد سننے والا نہیں تھا حتی کہ کوئی صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں تھا مرعوبیت کا وہ عالم تھا کہ اس جبر وقہر کے مقابلہ میں کسی کو زبان سے انکار کا لفظ برملا کہنے کی بھی ہمت نہیں تھی، بس گوشہ تنہائی میں آنسو بہا کر رہ جانا ان کا مقدر بن چکا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے غراتے ہوئے شیر کے سامنے ہرن اور خونخوار درندوں کے سامنے بکریاں کھڑی خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہیں آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا، ٹھیک اسی کربناک اور خوف زدہ ماحول میں **مولانا رحمت اللہ کیرانوی** جیسے مرد مسلمان نے دہاڑتے ہوئے طوفان سے لڑنے کا اعلان کر دیا اور کہہ دیا

یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید

پادری فنڈر کے چیلنج کے جواب میں مولانا موصوف کے اعلان کا مطلب یہ تھا کہ توحید پرستوں کے بدن میں جب تک جان ہے وہ کبھی بھی تم کو ہندوستان کو اندلس بنانے کا موقعہ نہیں دیں گے، تمہارے خواب کو چکنا چور کر دیں گے نعرۂ توحید کی تثلیث پرستی کے شور وشغف سے دبانے، توحید کے مراکز ومساجد کو تثلیث پرستوں کا اڈا بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جب تک اس سرزمین پر ایک بھی توحید پرست زندہ رہا وہ کبھی تمہارے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دے گا۔

وہ مرد مسلمان کون تھا؟

شیر جیسا کلیجہ رکھنے والا مرد مسلمان کون تھا؟ جس نے تن تنہا اپنی جان ناتواں کی ایمانی طاقت سے کام لے کر اتنی جابر و قاہر حکومت کو چیلنج کر دیا، اس میں حیرت کی کیا بات ہے اسلامی تاریخ یہی رہی ہے، تنہا ایک فرد نے ملکوں کی کایا پلٹ دی ہے فاتح سندھ محمد قاسم نے ہندوستان کی زمین کو روند ڈالا اور اسلام کی روشنی کو کہاں تک پہنچا دیا طارق بن زیاد ہی کے عزم جواں نے سمندروں کو کشتیوں کے ذریعہ عبور کر کے کشتیوں کو ساحل سمندر پر جلا کر خاکستر کر دیا کہ اب اس سرزمین کو فتح کر کے ہم کو یہیں قیام کرنا ہے وطن لوٹ کر جانے کا کیا سوال؟

ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

سعد بن وقاصؓ کی قوت ایمانی تھی کہ سیلاب سے چنگھاڑتے ہوئے دجلہ میں گھوڑے ڈال دیئے اور پار اتر گئے اور غضبناک سیلاب منہ دیکھتا رہ گیا اگر ہندوستان کا ایک مرد مجاہد عیسائیت کے طوفان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا کہ یا تو طوفان کو رکنا ہوگا ورنہ میری لاش اس سیلاب کو روک کر رہے گی تو اس میں حیرت و استعجاب کی کیا بات ہے؟ مسلمان قوم تو عجائبات کو وجود میں لانے والی قوم ہی رہی ہے، اندلس کے بے غیرت عیش پسند حکمرانوں نے بزدلی دکھائی تو ہندوستان کے علماء اتنے بے غیرت نہیں وہ نہتے ہو کر جنگ کرنا جانتے ہیں، ایمان کی طاقت ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی، ضلع مظفر نگر کے ایک معمولی قصبہ کیرانہ کا وہ شیر دل مسلمان جن کو بہت کم لوگ جانتے تھے اور چند دنوں کے بعد ہندوستان ہی نہیں تمام اسلامی ممالک بلکہ ان سے کہیں زیادہ یورپ کے ممالک کی زبانوں پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام جاری ہو گیا اور وہ عالمی شہرت کے مالک ہوئے کیونکہ انہوں نے ایسے کربناک سناٹے میں اپنی زلزلہ افگن آواز سے ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں جان ڈال دی تھی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی:

مولانا موصوف کیرانہ ضلع مظفرنگر کے محلّہ دربار کلاں میں جمادی الاول ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے والد کا نام خلیل اللہ عرف مولوی خلیل الرحمٰن تھا، یہ کیرانہ کے عثمانی شیوخ میں سے تھے، مولانا کے مورث اعلیٰ میں ایک حکیم محمد حسن تھے جو اپنے والد کے ساتھ شہنشاہ اکبر کے ایک حادثے میں زخمی ہوجانے پر معالج رہے، صحت کے بعد اکبر نے خوش ہوکر حکیم محمد حسن کو پرگنہ کیرانہ ومضافات بطور جاگیر دیا ذی قعدہ ۹۱۵ھ کو فرمان شاہی جاری ہوا یہ فرمان شاہی آپ کے خاندان میں محفوظ رہا، کیرانہ جاگیر میں ملنے کے بعد یہ خاندان پانی پت سے کیرانہ منتقل ہوگیا تب سے یہ خاندان یہیں آباد ہے، آپ کے خاندان کے افراد ہر دور میں مغلیہ دور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر ہمیشہ فائز رہے، شاہجہاں بادشاہ بھی کیرانہ میں تین دن اس خاندان کا مہمان رہا اس نے اپنی یادداشت میں اس کا ذکر کیا ہے غرضیکہ مولانا رحمت اللہ ایک بڑے جاگیردار گھرانے کے فرد تھے، نہایت شان وشوکت کے ماحول میں آپ نے پرورش پائی، دینداری اس گھرانے کی ایک بڑی خصوصیت تھی اسی لئے مولانا رحمت اللہ نے مشاہیر علماء ہند سے اسلامی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر آپ نے دہلی کا سفر کیا اور مدرسہ مولانا محمد حیات دہلی میں داخل ہوئے اور مدرسہ کے دارالاقامہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی اسی دوران آپ کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب دہلی میں مہاراجہ ہندوراؤ کے میر منشی مقرر ہوکر دہلی میں قیام پذیر ہوگئے مولانا رحمت اللہ صاحب بھی اپنے والد کے ساتھ رہنے لگے اور مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے دہلی کے بعد آپ نے بغرض تعلیم لکھنؤ کا سفر کیا اور اس دور کے مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی بالخصوص مفتی سعد اللہ صاحب سے زیادہ استفادہ کیا اور پھر اپنی خاندانی روایت کے مطابق فن طب کی تعلیم حکیم فیض محمد صاحب سے حاصل کی اور مسٹر لوکارثم سے ریاضی بھی پڑھی آپکے مشہور اساتذہ میں مولانا محمد حیات صاحب دہلی مولانا مفتی

سعد اللہ صاحب مولانا احمد علی صاحب بڈولی ضلع مظفر نگر جو بعد میں وزیر مہاراجہ پٹیالہ ہوئے، مولانا عبدالرحمٰن چشتی مولانا امام بخش صہبائی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد:

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ اپنے وطن کیرانہ واپس ہوئے اور اپنے محلّہ دربار کلاں کی مسجد میں درس وتدریس کا آغاز فرمایا اور پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینی علوم وفنون کی تعلیم دینے لگے، اگرچہ تعلیم وتدریس کا یہ دور بہت مختصر رہا لیکن ہندوستان کے درجنوں مشاہیر علماء نے اسی مختصر دور میں آپ سے تعلیم حاصل کی اور درجہ کمال کو پہنچے، مولانا عبدالوہاب ویلوری بانی مدرسہ باقیات الصالحات ویلور مولانا بدرالاسلام عثمانی کیرانوی (جوترکی جا کر شاہی کتب خانہ حمیدیہ کے مہتمم ہوئے) مولانا احمد اللہ چکوالی اور مولانا عبدالسمیع رامپوری جیسے مشہور علماء آپ کے تلامذہ میں شامل ہیں آپ کے سلسلہ تدریس کو ابھی چند ہی سال گذرے تھے کہ مہاراجہ ہندوراؤ دہلی نے آپ کے والد مولوی خلیل اللہ اور آپ کو دہلی بلا کر ان کو نگراں امور ریاست اور مولانا رحمت اللہ صاحب کو اپنا میر منشی مقرر کردیا، کچھ ہی دِنوں کے بعد آپ کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب کا انتقال ہوگیا، خاندانی حالات کا تقاضا ہوا تو آپ نے اپنی جگہ چھوٹے بھائی مولوی محمد جلیل کو میر منشی مقرر کردیا، اور خود کیرانہ واپس آ گئے اور ازسر نو درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔

ردعیسائیت کا عزم بالجزم:

دوبارہ تدریسی سلسلہ شروع کرنے کے وقت ملک میں حالات تشویشناک حد تک بگڑ چکے تھے، کمپنی کے مقبوضات کا دائرہ انتہائی وسیع ہوچکا تھا سلطنت مغلیہ کا آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر لال قلعہ کے اندر ضرور تھا لیکن دارالحکومت دہلی پر کمپنی کا قبضہ تھا اور بادشاہ بے دست وپا ہوکر لال قلعہ کے حصار میں بند تھا، پادریوں کی فوج

پورے ملک میں دندناتی پھر رہی تھی خود دارالحکومت دہلی میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے چیلنج بنی ہوئی تھی، دہلی میں یورپ کا مایۂ ناز عالم پادری پی فنڈر کی لن ترانیاں پورے زور وشور سے جاری تھیں یہ خبریں مولانا رحمت اللہ صاحب کو برابر ملتی رہتی تھیں ان کے جیسا بیدار مغز اور حساس عالم دین اس سے صرف نظر کیسے کرسکتا تھا مگر وہ دہلی سے دور اپنے وطن کیرانہ میں درس وتدریس میں مصروف تھے مگر عیسائی پادریوں کے ان اعتراضات سے باخبر تھے جو وہ اسلام پر کرتے تھے اور اپنی تقریروں میں زور وشور کے ساتھ بیان کرتے تھے اسلئے کیرانہ کے دوران قیام آپ نے ان اعتراضات کے جواب میں ایک کتاب ''ازالۃ الاوھام'' کے نام سے لکھنی شروع کردی۔

جہاد کی راہ میں:

صورتِ حال کی کربنا کی نے مولانا رحمت اللہ صاحب سے سلسلہ تدریس چھڑا دیا اور وہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکل پڑے، دہلی کی شاہجہانی مسجد کو گرجا گھر بنانے کی افواہ مسلمانوں میں بڑے زوروں سے گردش کررہی تھی، پادری فنڈر جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کو چیلنج کررہا تھا کہ اگر کسی مسلمان میں جرأت وہمت ہے تو سامنے آئے اور دین مسیحی کو باطل قرار دے اور کسی بھی مسلمان عالم کو اپنے مذہب کے حق ہونے کا دعویٰ ہے تو میری کتاب ''میزان الحق'' کا جواب دے، جامع مسجد کے اطراف میں مسلمانوں کا جم غفیر آباد تھا، اس کی تقریروں میں ہزاروں مسلمان بھی شریک ہوتے تھے، لیکن پادری فنڈر کے جواب میں ایک آواز بھی کسی سمت سے نہیں اٹھتی تھی کسی میں لب کشائی کی جرأت ہی نہیں تھی، جب کہ دہلی علماء سے بھری ہوئی تھی اور یہ علماء بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے لیکن کوئی بھی سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ پادری فنڈر کی ہفوات کا جواب دینا اپنے قتل کے محضر پر دستخط کرنا ہے اس لئے ہر طرف سناٹا تھا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو اس صورت حال سے سخت بے چینی تھی ان کے دل

کو جو چوٹ پہنچتی تھی اس کا مداوا صرف یہ تھا کہ پادری فنڈر کی زبان کو لگام دی جائے اور جب تاب ضبط نہیں رہی تو ایک دن آپ نے پادری فنڈر کے چیلنج کا جواب دے دیا اور اعلان کر دیا کہ پادری فنڈر جب چاہے جہاں چاہے اور جس موضوع پر چاہے میں اس سے مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

مولانا موصوف نے اس اعلان ہی پر بس نہیں کیا بلکہ براہ راست پادری فنڈر کی قیام گاہ پر جا کر بالمشافہہ چیلنج دینے کا عزم بالجزم کر لیا، مولانا موصوف کے ایک مخلص دوست مولوی امیر اللہ میر مختار مہاراجہ بنارس تھے وہ پادری فنڈر سے بھی واقف تھے مولانا موصوف نے ان سے اپنے فیصلہ کا اظہار کیا اور فرمایا کہ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا پادری فنڈر سے مل کر اس کو چیلنج دینا ہے، وہ تیار ہو گئے، آپ ان کو لے کر پادری فنڈر کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

پادری فنڈر کو براہ راست چیلنج:

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے جب پادری فنڈر کا جواب دینے کا اعلان کیا تھا اس وقت یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ پادری فنڈر کی ہفوات کے جواب میں مسلمان اب تک خاموش رہے، یا اس کی کتاب ''**میزان الحق**'' کا جواب نہیں دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا اس کی تقریریں لاجواب اور اس کی کتاب الہام سے لکھی گئی ہے، ہماری طرف سے اس کا جواب اس لئے نہیں دیا گیا کہ ہم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ ''**میزان الحق**'' میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کی حیثیت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں تھی۔

اس غیر مبہم اور واضح اعلان کے بعد آپ براہ راست گفتگو کے لئے اس کے گھر پہنچے اتفاق سے وہ گھر پر نہیں تھا اس لئے بذریعہ تحریر اس کو چیلنج کیا گیا جس کا اس نے جواب دیا یہ خط و کتابت مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے درمیان ۲۳/ مارچ ۱۸۵۴ء سے ۷/ اپریل ۱۸۵۴ء تک چلتی رہی، عنوان مناظرہ، تاریخ، اور مقام مناظرہ

سب پادری فنڈر کی صوابدید کے مطابق طے ہوا، مولانا موصوف نے اپنی طرف سے اس کی کسی تجویز کو رد نہیں کیا، کیونکہ آپ ہر حال اور ہر طرح کے ماحول میں اس سے مناظرہ کر کے اس کو اس کی اوقات بتا دینے کا تہیہ کر چکے تھے، کیونکہ آپ اس کے مبلغ علم کا اندازہ کر چکے تھے مناظرہ ۱۰؍اپریل ۱۸۵۴ء کو بمقام کٹرہ عبدالمسیح آگرہ ہونا طے پا گیا۔

مناظرہ گاہ:

یہ مناظرہ ایک عیسائی کے احاطہ میں تمام اعلیٰ عہدیداران حکومت کی موجودگی میں ہونا طے ہوگیا حکومت کی پوری مشنری کو اس پر حیرت تھی، اب تک کمپنی کے انگریز افسران اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو پورے ملک میں ایک آواز بھی سنائی نہیں دی تھی کہ سرکاری طور پر تبلیغ عیسائیت کی جو مہم چلائی جارہی ہے اس کے خلاف آواز کسی ہندوستانی نے اٹھائی ہو یا کسی نے اس میں رخنہ اندازی کی کوشش کی ہو اس طرح کی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں ملی تھی، یہ پہلا تجربہ تھا کہ یورپ کے مایۂ ناز پادری کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا گیا تھا، وہ حیرت زدہ بھی تھے اور ان کو غصہ بھی تھا کہ حکومت کے پلان کو سبوتاژ کرنے کی کسی ہندوستانی کو کیسے جرأت ہوئی؟ پادری فنڈر نے تبلیغ عیسائیت کا جو طریقہ کار اختیار کیا تھا اس کا منطقی نتیجہ تو یہی تھا، چیلنج کا جواب چیلنج ہی ہوتا ہے، للکار کا جواب للکار ہی سے دیا جاتا ہے اس لئے مجبوراً ان کو اس مناظرہ کا نظم ونسق سنبھالنا پڑا۔

عام مسلمان تو دہشت زدہ تھے اس لئے عام تماشائی کی حیثیت سے بھی شریک ہونے کی ہمت نہیں رکھتے تھے دوسرے یہ کہ مناظرہ کا ماحول ایسا رکھا گیا جیسے کوئی سرکاری پروگرام منعقد ہو رہا ہے ہر طرف مسلح پولس ہتھیار لگائے افسران، بڑے سے بڑے فوجی افسر سرکاری عہدیداران ہر طرف چھائے ہوئے تھے عام مسلمان اس راہ سے گذرنے کو بھی خطرے سے خالی نہیں سمجھتے تھے، صرف علماء اسلام اور شہر آگرہ کے کچھ معزز افراد اس مناظرہ میں موجود تھے، حکومت کے افسران کچھ تو اپنے عہدہ کی

ذمہ داری اور ڈیوٹی سمجھ کر شریک ہوئے اور بہت سے اونچے درجے کے انگریز افسر ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اپنے طور پر بصد ذوق وشوق مناظرہ گاہ میں حاضر تھے ان کو سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ آج یورپ کا سب سے بڑا عیسائی عالم جب مجمع عام میں علماء اسلام کو ذلت آمیز شکست دے گا اور ان کا منہ بند کر دے گا تو پورے ملک میں عیسائیت سیلاب کی طرح پھیل جائیگی اور حکومت کی منشا از خود پوری ہو جائے گی، اس مناظرہ میں مسلمانوں کی شکست کے بعد عیسائیت کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ جائے گی، اسی خوش فہمی کی وجہ سے اعلیٰ عہدیدار، مشنری ذہن ومزاج کے انگریز افسران اپنی پوری وردی میں اپنی کرسیوں پر غرور وتمکنت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، مناظرہ کی رودادوں میں جن مخصوص حاضرین کے نام دیئے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچین سکنند صدر صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر ایڈلی ترجمان حکومت کمپنی، پادری ولیم گلین، پادری فنڈر، پادری فرنچ اور دوسرے پادریوں کی فوج قطار اندر قطار مولوی فیض احمد سرشتہ دار صدر بورڈ، مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد، مولوی امیر اللہ میر مختار راجہ بنارس، مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، منشی سراج الحق، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر علی خان وغیرہ یہ پہلے دن کی فہرست ہے دوسرے دن ایک ہزار کے قریب مجمع تھا افسران کی تعداد بھی زیادہ تھی اور مسلمانوں کا مجمع دوسرے تیسرے دن زیادہ ہوتا چلا گیا۔

مناظرہ شروع ہوتا ہے:

یہ مناظرہ تین دنوں تک چلتا رہا پہلے دن نسخ پر بحث ہوئی اور سارے دن اسی موضوع پر گفتگو چلتی رہی دوسرے دن انجیل میں تحریف وترمیم کی بحث چلی یہ بحث کافی ہنگامہ خیز بھی رہی اور فیصلہ کن بھی۔

یہ مناظرہ تاریخ کے انتہائی نازک موڑ پر ہو رہا تھا اس کی شہرت پورے

ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ انگلینڈ تک تھی اور اس کے نتیجہ کا انتہائی بے چینی کے ساتھ ہر طرف انتظار کیا جا رہا تھا، مناظرہ کا پہلا اجلاس صبح سویرے ۱۰/اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۱/رجب ۱۲۷۰ھ بروز دوشنبہ شروع ہوا سب سے پہلے پادری فنڈر اسٹیج پر آیا اور اپنی افتتاحی تقریر سے مناظرہ کا آغاز کیا اس نے اپنی تقریر میں کہا، یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ مناظرہ کیوں کر منعقد ہوا، یہ مولانا رحمت اللہ کی سعی وکوشش اور خواہش کا نتیجہ ہے، اس سے فائدہ کی صورت میرے نزدیک نظر نہیں آتی، میری تمنا یہ ہے کہ دین عیسوی کی حقیقت مسلمانوں کے سامنے رکھوں، مباحثہ کے عنوانات نسخ وتحریف، الوہیت وحیات مسیح، تثلیث، رسالت محمدی طے ہوئے ہیں۔

پھر اس نے دین عیسوی کے برحق ہونے اور انجیل کے کلام الٰہی ہونے اور اس کے محفوظ اور ہر قسم کی تحریفات سے پاک صاف ہونے پر روشنی ڈالی گویا اس نے فریق مخالف کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کر دیا کہ ہمارا مذہب حق ہے ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔

پھر اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ رسالت محمدی کے بعد دین عیسوی منسوخ ہو گیا اب دین عیسوی پر عمل کر کے آخرت میں نجات ممکن نہیں، پورے دن اسی موضوع پر سوال وجواب ہوتا رہا۔

دوسرے دن کا اجلاس:

پہلے دن پادری نے مدعی بن کر اپنا دعویٰ پیش کیا فریق مخالف کو اس کا جواب دینا تھا اور اس کے دعوے کو غلط ثابت کرنا تھا دوسرے دن کے اجلاس میں مولانا رحمت اللہ صاحب مدعی ہوئے اور تقریر کے لئے کھڑے ہوئے نسخ پر بحث ہو چکی تھی آج تحریف انجیل پر بحث ہونی تھی مسلمان مدعی تھے کہ انجیل محرف ہے مولانا کیرانوی نے اپنی تقریر میں انجیل کے محرف ہونے پر متعدد دلائل دیئے اور ثابت کیا کہ آج آپ کے ہاتھ میں جو انجیل ہے وہ انجیل نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی،

اس کی حفاظت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے لے کر اب تک کوئی قابل اعتماد طریقہ کار اختیار نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے انجیل میں جگہ جگہ تحریف ہوتی رہی جو مذہب ایک ایسی کتاب پر منحصر ہو جو اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہی وہ مذہب برحق کیسے ہوسکتا ہے، اسلئے دین محمدی کے مقابلہ میں عیسوی کو پیش کرنا قرین انصاف نہیں۔

سوال وجواب:

مولانا موصوف کی مفصل اور مدلل تقریر کے بعد پادری فنڈر نے کہا کہ آپ کی دلیلوں سے انجیل کا محرف ہونا نہیں ثابت ہوتا اس لئے آپ کے دلائل ہمارے لئے کچھ مضر نہیں، تحریف کی ایسی دلیل پیش کی جائے جس سے انکار کی گنجائش نہ ہو، اس جواب پر مولانا نے براہ راست فنڈر سے پوچھا کہ آپ کو کس طرح کی دلیل چاہئے، آپ بتائیں تو ہم اس طرح کی بھی دلیل پیش کرسکتے ہیں، پادری فنڈر نے کہا کہ آپ موجودہ انجیل میں کوئی ایسی عبارت بتایئے جو پہلے کے نسخوں میں موجود نہیں تھی اور آج کی انجیل میں ہے تو ہم اس کو تحریف تسلیم کرلیں گے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا کہ ابھی لیجئے، آپ نے اپنے رفیق ڈاکٹر وزیر خاں سے فرمایا کہ وہ عبارت نکال کر پیش کیجئے جو دیکھی گئی ہے، انہوں نے یوحنا کے پہلے خط باب ۵ آیت ۷-۸ کا حوالہ دیا اور کہا کہ سب مانتے ہیں کہ یہ آیات قدیم نسخوں میں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے نسخوں میں موجود ہیں۔

اس کھلی ہوئی شہادت اور ناقابل انکار ثبوت پر پادری فنڈر نے کہا کہ ہاں صاحب! اس جگہ، اس کے علاوہ ایک دو جگہ اور اس طرح کی تحریف ہوئی ہے، یہ اعتراف مجمع عام میں ہوا تھا اور پورا مجمع گوش برآواز تھا حاضرین پوری توجہ سے بحث سن رہے تھے اس لئے جوں ہی پادری فنڈر نے تحریف کا اعتراف کیا مسلمانوں میں جوش وخروش پیدا ہوگیا، مسلمانوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے رومال اور ٹوپیاں فضا میں اچھال کر اپنی خوشی کا مظاہرہ کرنے لگے، یہ منظر دیکھ کر پادریوں کے چہرے فق

ہو گئے، انگریز افسران متحیر تھے کہ یہ کیا ہو گیا، چونکہ یہ بحث اردو میں ہو رہی تھی اور وہ اردو سمجھ نہیں رہے تھے اس لئے مسٹر اسمتھ صدر دیوانی نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے پادری فرنچ سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیا بات ہوگئ؟ یہ اظہار مسرت کیسا ہے؟ تو پادری فرنچ نے انگریزی میں سمجھایا کہ مولوی صاحب انجیل کے مفسروں کی کتابوں سے چھ سات مقامات جہاں تحریف ہوئی ہے ڈھونڈ کر لائے ہیں۔

اس کے بعد پادری فنڈر کے معاون پادری فرنچ نے کھڑے ہو کر کہا کہ فنڈر صاحب بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ انجیل مقدس میں سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے، پادری فرنچ کے اس اعلان پر مولوی قمر الاسلام صاحب امام جامع مسجد آگرہ نے منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار سے کہا کہ نوٹ کر لیجئے کہ پادری فنڈر نے آٹھ جگہ انجیل میں تحریف کا اقرار کیا ہے، پادری فنڈر نے یہ سن کر کہا، ہاں صاحب ضرور لکھ لیجئے میں کہتا ہوں کہ سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے۔

اب وہ مجمع جس پر پہلے خوف و ہراس طاری تھا بے قابو ہوتا جا رہا تھا ایک طرف ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور مسلمان ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے دوسری طرف پادریوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مردنی چھائی ہوئی تھی، ان کی آنکھیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں، شرمندگی وندامت اور شکست کی ذلت کا وہ عالم تھا کہ حکومت کی پوری طاقت کے باوجود ان کی زبان گنگ ہوئی جا رہی تھی، ایسی روشن اور واضح شکست ہوئی کہ عوام وخواص کسی سے بھی چھپی نہیں رہ گئی اگر افسران کی اتنی بڑی تعداد موجود نہ ہوتی تو شاید وہ بہت کچھ ہو جاتا جو ہندوستان کا مزاج ہے لیکن صرف اظہار مسرت تک بات رہ گئی۔

ذلت پر ذلت:

پادری فنڈر اب حواس باختہ ہو چکا تھا اور حواس باختہ انسان جو بھی حرکت کرتا ہے وہ اس کے خلاف ہی جاتی ہے اور مزید ذلت ورسوائی کا باعث ہوتی ہے، ناقابل

برداشت ذلت سے جھنجھلا کر پادری فنڈر جوش میں کھڑا ہوگیا اس نے ایک لمبی تقریر کی اور کہا کہ ایسی تحریفوں سے انجیل کی اصولی تعلیم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اپنی تقریر میں زور بیان پیدا کرنے کے لئے اس نے مفتی ریاض الاسلام صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ مفتی صاحب! آپ ہی بتایئے کہ اس قسم کی تحریفات سے انجیل مقدس کی اصولی تعلیم اور انجیل کے مطالب میں کیا فرق پڑتا ہے؟ فنڈر کا روئے سخن مفتی ریاض الاسلام کی طرف تھا تو مفتی صاحب ہی کھڑے ہوئے اور جو کچھ فرمایا وہ ایک غیر تمند انسان کے لئے ڈوب مرنے کی بات ہے آپ نے فنڈر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ پادری صاحب! جب کسی وثیقہ یا دستاویز میں ایک جگہ بھی ملاوٹ جعل سازی ثابت ہوجائے تو پورا وثیقہ اور دستاویز قابل اعتماد نہیں رہ جاتا اگر بقول آپ کے انجیل میں سات آٹھ جگہ تحریف ہوگئی تو اس کا اعتماد تو اٹھ گیا کیا ثبوت ہے کہ دوسرے مقامات میں تحریف نہیں ہوئی اس لئے آپ کے ہاتھ میں جو انجیل ہے اس میں اصلی کتنی ہے؟ نقلی اور جعلی کتنی ہے کیا معلوم؟ پادری صاحب آپ غور فرمائیں کہ انجیل میں جہاں کہیں دو عبارتیں ہوں دونوں میں تضاد یا اختلاف ہو تو کیا دونوں کو خدا کا کلام کہہ سکتے ہیں؟ پادری فنڈر نے اس کے جواب میں کہا نہیں، ان میں سے کوئی ایک ہی خدا کا کلام ہوسکتا ہے، تب مفتی صاحب نے پرروز الفاظ میں فرمایا کہ اہل اسلام کا یہی دعویٰ ہے کہ موجودہ بائبل کا مجموعہ سب کا سب خدا کا کلام نہیں ہے، اس کا جواب پادری فنڈر کے پاس کچھ نہیں تھا **فبهت الذی کفر**، وہ ایک دم چپ ہوگیا اور وقت کے ختم ہونے کا بہانا بنا کر جلسہ کے ختم ہونے کا اعلان کردیا۔

مناظرہ کے تین دن:

یہ تاریخ ساز مناظرہ تین دنوں تک جاری رہا ان تین دنوں میں پادری سطحی باتوں اور عوام اور ان پڑھ لوگوں کے سامنے کی جانے والی تقریروں کو دہراتے رہے، علماء اسلام کی مدلل بحثوں کے سامنے وہ طفل مکتب ثابت ہوتے تھے، کسی مسئلہ پر

پادری فنڈر چند منٹوں سے زیادہ نہیں ٹھہر سکا، تیسرے دن مسلمانوں کی فتح مبین اور جوش وخروش کو دیکھ کر اس کی ہمت ٹوٹ گی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی آگرہ میں قیام پذیر ہوکر روز تقاضے کرتے رہے کہ چوتھا اجلاس بلایئے مگر پادری فنڈر کو اپنی ساری لن ترانیاں بھول گئیں اونٹ پہاڑ کے سامنے بلبلا کر رہ گیا، اس کے معاون پادریوں پر بھی مایوسی طاری رہی، باہمی صلاح ومشورہ سے تمام پادریوں نے طے کیا کہ آئندہ مناظرہ کا سلسلہ بند ہوجانا ہی مصلحت کا تقاضا ہے، حالانکہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے پادری فنڈر کا جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہ طے ہو چکا تھا کہ جب تک نسخ وتحریف کے مسئلہ پر پوری بحث نہ ہوجائے مناظرہ کا سلسلہ جاری رہے گا، لیکن تین دنوں کی ذلتوں کے یہ پہاڑ سے دن کسی طرح پادریوں کے سروں سے گذر گئے اب مزید ذلت برداشت کرنے کے لئے وہ کسی قیمت پر تیار نہیں تھے اس لئے وہ اپنے طور پر طے کر چکے تھے کہ اب مناظرہ کسی قیمت پر جاری نہیں رکھا جائے گا، مولانا رحمت اللہ صاحب اپنے رفیق ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ آگرہ میں ہفتوں مقیم رہے اور بار بار پادری فنڈر سے مطالبہ کرتے رہے کہ مناظرہ کے جلسے بلایئے تاکہ بحث مکمل ہوجائے مگر وہ کسی حال میں تیار نہیں ہوا۔

پادری فنڈر کا فرار:

مولانا رحمت اللہ صاحب آگرہ میں کئی ہفتے قیام کے بعد وطن واپس آ گئے اب ان کو یقین تھا کہ پادری فنڈر کی لفاظیاں، لن ترانیاں، اور چرب زبانیاں یقیناً بند ہوجائیں گی اور ان شاء اللہ یہ مناظرہ ہندوستان میں فروغ عیسائیت کا خواب دیکھنے والوں کی نیندیں حرام کردے گا ان کا خواب چکنا چور ہوجائے گا، آپ ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ ایک دن آپ نے سنا کہ پادری فنڈر ہندوستان میں فروغ دین عیسوی کی مہم چھوڑ کر راتوں رات لندن فرار کر گیا کیوں کہ عام پادریوں اور حکومت کے اعلیٰ افسران کی نگاہوں میں اس کی قدر وقیمت ختم ہوچکی تھی، حکومت کے ذمہ داروں کی

رپورٹ سے لندن میں یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ ہندوستان میں پادری فنڈر کو ذلت آمیز شکست ہوگئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لندن میں جس عہدہ پر تھا اس سے معزول کر دیا گیا، کیونکہ مناظرہ میں اس کی شکست سے حکومت کا وہ منصوبہ جو پورے ملک کو عیسائی بنا کر اندلس کی طرح حکومت کو مستحکم بنانا پیش نظر تھا وہ منصوبہ فیل ہو گیا۔

انقلابی اقدام:

بظاہر یہ دو مذہبوں کے عالموں میں مباحثہ ومناظرہ تھا جو اکثر ہوتا رہتا ہے لیکن یہ صرف مناظرہ نہیں تھا بلکہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مستقبل میں دین عیسوی کی اشاعت کا طریقہ کار کیا ہوا، اس مناظرہ سے یہ اندازہ کرنا تھا کہ مسلمانوں میں اپنے دین کی طرف سے مدافعت کی کتنی طاقت ہے کیا علمی سطح پر ان کو شکست دے کر احساس کمتری میں مبتلا کیا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو عیسائیت کے فروغ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی اگر کوئی طاقت حائل ہونے کی جرأت بھی کرے گی تو جبر وقہر کی تلوار ان کا سارا نشہ ہرن کر دے گی مگر اس تجربہ کا نتیجہ ان کی توقعات کے بالکل خلاف نکلا، مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کی موجودگی میں پادری فنڈر کو ذلت آمیز شکست دے کر وارننگ دے دی کہ جو لوگ اسلامی ہند کو اندلس بنانا چاہتے ہیں عیسائیت کو بہ جبر واکراہ نافذ کر کے اسلام کو شکست دینے کا خواب دیکھتے ہیں وہ یہ خواب دیکھنا چھوڑ دیں، یہ اندلس نہیں ہندوستان ہے یہاں کے علماء عیش پسند نہیں خارزار وادیوں کو روندنے والے ہیں اور انگاروں پر چل کر اپنے دین کی حفاظت کا حوصلہ رکھتے ہیں، اندلس کے بزدل حکمراں نہیں کہ میدان جنگ میں مردانہ وار جان دینے کے بجائے عورتوں کی طرح روتے ہوئے قلعہ کی کنجیاں حوالے کر دیں، مولانا رحمت اللہ نے اپنے رفقاء کو ہمراہ لے کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ مناظرہ کر کے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا کہ تثلیث پرستی کی سیاہی سے نیر اسلام کی تابانیوں کو اس سرزمین میں شکست دینا ممکن نہیں ہے۔

مناظرہ کے اثرات:

مناظرہ آگرہ میں ہوا وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک ہزار انسانوں کی موجودگی میں لیکن اس کے دوررس اثرات مرتب ہونے سے مسلمان اور ہندو دونوں طبقوں میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ انگریزوں کی یہ نئی حکومت دونوں کے مذہبوں کی دشمن ہے، وہ اس ملک کی دونوں بڑی قوموں کے مذہبوں کے نام ونشان مٹادینا چاہتی ہے اس لئے نئی حکومت کے خلاف پورے ملک میں نفرت بتدریج بڑھتی رہی یہاں تک کہ فوج تک اس کے اثرات پہنچ گئے، اور میرٹھ چھاؤنی میں نفرت کا پہاڑ آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا، میرٹھ چھاؤنی کے فوجیوں کو جو کارتوس دیئے گئے ان کو دانت سے کاٹ کر بندوق میں لگانا پڑتا تھا، ان کارتوسوں کے بارے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اس میں گائے اور سور کی چربی لگائی گئی ہے مسلمان اور ہندو دونوں طرح کے فوجیوں نے یقین کرلیا کہ ہمارے مذہب اور دھرم کو نشٹ کرنے کی حکومت نے سازش کی ہے۔

مناظرہ آگرہ کے تین سالوں بعد مئی ۱۸۵۷ء میں اسی مسئلہ کو لے کر بغاوت ہوگئی جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، باغی فوجیوں نے اپنے انگریز افسران پر بندوق تان لی اور جو سامنے آیا باغیوں کی گولی اس کے سینہ سے پار کر گئی میرٹھ کی فوج دہلی تک چڑھ آئی انگریزوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا ان کی زندگی کے برے دن آ گئے۔

خون آشام انتقام:

ملک کو عیسائیت پر مجبور کرنے اور ہندوستان کو اندلس بنانے کا خواب چکنا چور ہو گیا اب وہ یہ خواب دیکھنے کی پوزیشن ہی میں نہیں رہے بڑی مشکلوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی حکومت بچائی، اور جب فوجی بغاوت پر اپنی ہزاروں جانیں گنوا کر قابو پالیا تو جوش انتقام میں انگریز وحشی درندہ بن گیا اور چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی

طرح گرد وپیش کے ہر شخص کوڈ سنے کے لئے اس کی زبان لپلپانے لگی اس فوجی بغاوت کے دبانے کے بعد انگریزوں نے اپنے ان دشمنوں کو فراموش نہیں کیا جو آگرہ میں مناظرہ کر کے عیسائیت کی راہ میں سنگ گراں بن گئے اور حکومت کے پلان کو ناکام کر دیا تھا اس سلسلہ میں سرفہرست مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں تھے، ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے بیدار مغز علماء اور مجاہدین اسلام کی ایک پوری جماعت بھی انگریزوں کی مجرم بن گئی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی صرف زبان ہی سے اپنا فرض انجام دینے کے قائل نہیں تھے وہ تلوار کے بھی دھنی تھے اس لئے تین سال قبل کے واقعہ مناظرہ کو مدنظر رکھ کر ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کرایا گیا، فوج اور پولس ان کی گرفتاری کے لئے دوڑ پڑی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی ہجرت:

مولانا رحمت اللہ صاحب بھی دشمن کی طرف سے غافل نہیں تھے شاہانہ زندگی گذارنے والے نوکروں چاکروں کی فوج جلو میں رکھنے والے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی عالم دین بھی تھے اسلام کے محافظ تھے اس لئے دین کی حفاظت کے لئے انہوں نے جو قدم اٹھایا تھا اس پر ثابت قدم بھی تھے جان ہتھیلی پر رکھ کر انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا تھا، اس لئے ہر قسم کے مصائب جھیلنے کا بھی ان کے دل میں حوصلہ تھا، صحرانوردی، بادیہ پیمائی اور آبلہ پائی کے لئے بھی وہ پہلے سے تیار تھے، اور انہوں نے عملی طور پر کر کے اسے دکھا بھی دیا، کس طرح ان کے محل پر چھاپہ پڑا، کیسے پنجیٹھہ کے دیہات میں گھاس کاٹی؟ کیسے نام بدل کر ہزاروں میل جنگلوں اور بیابانوں کا سفر کر کے کراچی کی بندرگاہ پہنچے؟ یہ ایک طویل ترین داستان ہے، بادبانی کشتی کے ذریعہ مکہ مکرمہ پہنچے، یہ ہندوستان کے اس دور کے کئی علماء مجاہدین کی داستان ہے جو دردناک و کربناک ہے درس غیرت وحمیت اور حوصلہ بخش بھی پولیس اور فوج ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہاتھوں میں لئے ناکام واپس ہوگئی، مولانا رحمت اللہ صاحب

اللہ کی حفاظت میں پہنچ گئے، انگریزی حکومت دانت پیس کر رہ گئی، نہ سرکاری پادریوں کے ذریعہ ان کو شکست دے سکی اور نہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لے کر کتوں کی طرح دوڑنے والی پولیس ان کا کچھ بگاڑ سکی کیوں کہ

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی ترست

خدا نے اپنے دین کی حفاظت کرنے والے کی حفاظت فرمائی پیادہ پائی سے تلوے ضرور لہولہان ہوئے لیکن دل اپنی کامیابی پر مسرور اور خوش تھا مکہ معظمہ پہنچ کر اللہ کے گھر کے سائے میں طرح اقامت ڈال دی۔

مناظرہ کے بعد کے تین سال:

۱۰/ اپریل ۱۸۵۴ء کو مناظرہ ہوا، اور مئی ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خلاف بغاوت کا کوہ آتش فشاں پھٹا اس درمیانی مدت میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی خاموش بیٹھے نہیں رہے بلکہ شب وروز اس طرح کے پیش بندیوں میں مصروف رہے کہ مستقبل میں حکومت تبلیغ عیسائیت میں کسی طرح کامیاب نہ ہو سکے مولانا موصوف اس کے لئے جدوجہد کرتے رہے آپ کو اب یہ یقین تھا کہ یورپ کا بڑا سے بڑا پادری بھی ہندوستان آ کر کسی مسلمان عالم دین سے مجمع عام میں مناظرہ ومباحثہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا، البتہ اپنے اپنے حلقہ عمل میں پادریوں کی کوششیں جاری رہیں گی اور وہ ناخواندہ عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہیں گے اس لئے اس کا انسداد بھی ضروری ہے آپ نے ضروری سمجھا کہ عیسائیت اور صلیب پرستی جیسے باطل مذہب کی بخیہ ادھیڑ کر عوام کے سامنے رکھ دی جائے اور اہل علم کی رہنمائی کے لئے علمی انداز کی تصانیف مرتب کی جائیں تاکہ ہر پڑھا لکھا مسلمان پادریوں کے ہر طرح کے سوالات کے جوابات دے سکے اور پھر پلٹ کر ان سے سوال کر کے ان کا منہ بند کر سکے، اس لئے وہ مسلسل اور شب وروز تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور ایسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھ دیں کہ یورپ کے اخباروں نے صاف

اعتراف کیا کہ اگر یہ کتابیں شائع ہوتی رہیں تو کبھی بھی کوئی شخص عیسائیت کے قریب نہیں جائے گا عیسائیت اپنے خول میں بند ہوکر رہ جائے گی۔

تصانیف:

مولانا موصوف کے پیش نظر عیسائیت کے سیلاب کو روکنا وقت کا سب سے اہم ترین فریضہ تھا اس لئے آپ نے اپنی ساری توجہ اسی طرف رکھی تھی جب کہ اس دور میں باصلاحیت علماء کی کمی نہیں تھی لیکن قدرت کو جس سے جو کام لینا ہوتا ہے اس کام کی اسی کو توفیق ملتی ہے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو ہندوستانی تاریخ کے اس نازک موڑ پر قدرت نے اسی اہم اور نازک کام کے لئے خلعت وجود بخشا تھا اس لئے اس مہم میں اس وقت آپ کا کوئی شریک و سہیم نہیں تھا آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ **اظہار الحق:** یہ کتاب مناظرہ آگرہ کی مکمل روداد ہے جو ترکی کے بادشاہ سلطان عبدالعزیز خاں کی خواہش اور خیرالدین پاشا تونسی صدر اعظم کی تحریک پر پادری فنڈر سے اکبرآباد آگرہ میں مناظرہ کی مفصل کیفیت اور تمام مسائل کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مناظرہ سے دس برس بعد جب آپ ہجرت کرکے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے تو سلطان ترکی کی دعوت پر آپ ترکی تشریف لے گئے تھے وہیں قسطنطنیہ میں ۱۶؍رجب ۱۲۸۰ھ میں اس کتاب کی تالیف شروع کی اور آخری ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں ختم ہوئی اور ۱۲۸۱ھ میں سب سے پہلے قسطنطنیہ سے شائع ہوئی، پھر صدر اعظم موصوف کے حکم سے ایک ترک عالم نے عربی سے ترکی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور **ابراز الحق** کے نام سے مکمل ترکی میں ترجمہ شائع ہوا، پھر یورپ کی متعدد زبانوں میں ترکی حکومت کی طرف سے اس کے ترجمے کراکے شائع کئے گئے، جن کو پادری خاص کوشش اور اہتمام سے تلف کرنے کی کوشش کرتے رہے، کتاب مصر سے متعدد بار شائع ہوچکی ہے، مولانا سلیم اللہ صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، مولوی غلام محمد بھانجا راندیری نے گجراتی زبان میں ترجمہ

کر کے شائع کیا، اظہار الحق کے انگریزی ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد ٹائمنز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے، ابواب کی تفصیل اس طرح ہے باب اول بیان و تفصیل کتب عہد قدیم و جدید باب دوم بیان و تفصیل اثبات تحریف انجیل باب سوم نسخ انجیل باب چہارم ابطال تثلیث باب پنجم قرآن کا کلام اللہ ہونا باب ششم اثبات نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم واعتراضات و جوابات پادریان۔

۲- **ازالة الاوهام:** یہ ضخیم کتاب بڑے سائز کے ۶۵۴ صفحات پر مشتمل ہے سید المطابع بلاقی بیگم دہلی میں سید قوام الدین کے زیر اہتمام فارسی میں ۱۲۶۹ء میں شائع ہوئی، ردِ نصاریٰ کے اکثر مباحث کا مسکت جواب ہے، اس میں پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق میں جو اعتراضات ہیں ان کے دنداں شکن جوابات بھی شامل ہیں۔

۳- **ازالة الشكوك:** یہ کتاب عیسائیوں کے ۳۹ سوالات کا جواب ہے، ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں ہندوستان میں تصنیف ہوئی اور دو جلدوں میں شائع ہوئی اس میں نبوت محمدی اور تحریف بائبل کے مدلل ثبوت ہیں دونوں جلدیں ایک ہزار ایک سو سولہ صفحات پر مشتمل ہیں اس کتاب کے سبب تالیف کے متعلق مولانا مرحوم نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے:

> ۱۲۶۹ میں دو امر باعث ہوئے کہ پادریوں کے سوالات کا جواب لکھوں ایک یہ کہ بعض عیسائیوں نے ان سوالوں میں اصلاح دے کر اور چھ سوال اور بڑھا کر ان کو جناب مستطاب مرزا محمد فخر الدین ولی عہد بہادر دام اجلالہٗ کی خدمت بابرکت میں بھیجا اور جناب مفخم الیہ نے مجھ سے درخواست کی کہ ان کا جواب لکھوں اور ان کا امر ماننا پڑا۔

مولانا مرحوم کے ایک شاگرد مولانا عبدالوہاب ویلوری بانی مدرسہ باقیات

الصالحات ویلور نے کتاب کی پہلی جلد مدراس میں چھپوائی دوسری جلد ان کے صاحبزادے مولانا ابوالفضل ضیاء الدین محمد صاحب مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات ویلور نے طبع کرائی اس طرح ماہ شعبان ۱۲۸۸ھ میں کتاب مکمل دو جلدوں میں شائع ہوگئی۔

۴- **اعجاز عیسوی:** اس کتاب میں مولانا مرحوم نے کامل طور پر بائبل کا غیر معتبر ہونا اور اس کا محرف ہونا ثابت کیا ہے، یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں آگرہ میں لکھی گئی پہلی بار آگرہ ہی سے اور دوسری بار مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی، ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۵- **احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث:** دلائل عقلیہ ونقلیہ سے تثلیث کو باطل ثابت کیا گیا ہے، ۱۲۷۱ھ میں مناظرہ اکبرآباد کے فوراً بعد تصنیف ہوئی اور مطبع رضوی دہلی سے ۱۲۹۲ھ سے طبع ہوکر شائع ہوئی، انجیل کی تحریف پر بہت ہی محققانہ بحث ہے جو صرف ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے متوسط تقطیع پر اسی زمانہ میں فخر المطابع دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

غیر مطبوعہ تصانیف:

مولانا کیرانوی کو قدرت کی طرف سے ردعیسائیت کے سلسلہ میں وہبی طور پر وہ علم دیا گیا تھا کہ ان کا قلم رکنا جانتا ہی نہ تھا، کچھ کتابیں حالات اور ماحول کے تقاضوں کے تحت شائع ہوتی رہیں لیکن کئی کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں میرے لئے علم کا کوئی ذریعہ نہیں کہ معلوم کروں کہ یہ مخطوطے کہاں اور کس حال میں ہیں؟ لیکن مولانا مرحوم کے ورثاء نے ان تصانیف کا ذکر کیا ہے، خاندانی تحریروں سے غیر مطبوعہ کے نام اور ان کے مباحث کا پتہ چلتا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

بروق لامعہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا مدلل اثبات اور خاتم المرسلین پر ختم رسالت کو ثابت کیا ہے کتاب میرے علم کے مطابق اب تک طبع نہیں ہوئی۔

معدّل اعوجاج المیزان: یہ کتاب میزان الحق مولفہ پادری پی فنڈر کا جواب ہے مولانا محمد سلیم صاحب سابق مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کی ایک تحریر سے

معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ''نور افشاں'' (۳۰ جلد ۱۲) مطبوعہ ۲۴؍ جولائی ۱۸۸۴ء میں پادری صفدر علی کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ ان کے پاس ہے۔

تقلیب المطاعن: یہ کتاب ''تحقیق دین'' مؤلفہ پادری لاسمند کا رد اور جواب ہے، کتاب غیر مطبوع ہے۔

معیار التحقیق: یہ کتاب ''تحقیق الایمان'' مؤلفہ پادری صفدر علی کا دندان شکن جواب ہے۔

مناظرہ کی رودادیں:

مناظرہ اکبر آباد (آگرہ) چونکہ ہمہ گیر شہرت کا مالک تھا اس لئے پورے ملک میں اس کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں مناظرہ تین دن تک چلا روزانہ کی رودادیں اس دور کے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں جن کی دستیابی اب ممکن نہیں رہی کچھ رودادیں کتابی شکل میں شائع ہوئیں، ایک روداد ''**البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف**'' کے نام سے وزیر الدین صاحب نے مرتب کی تھی جو حافظ عبداللہ صاحب کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ میں مناظرہ کے فوراً بعد فخر المطابع دہلی میں طبع ہوئی اور ولی عہد بہادر مرزا فخر الدین ابن بہادر شاہ ظفر دہلی کے حکم سے چھپ کر انہیں کے حکم سے ہندوستان کے اطراف واکناف میں اشاعت پذیر ہوئی یہ روداد مناظرہ اکبر آباد آگرہ کے سلسلہ میں مولانا موصوف اور پادری فنڈر کے آخری خطوط کا مجموعہ ہے۔

ایک روداد مناظرہ دو حصوں میں اسی زمانہ میں سید عبداللہ اکبر آبادی نے مرتب کی تھی ایک حصہ کا نام ''مباحث مذہبی'' اور دوسرے حصہ کا نام ''مراسلات مذہبی'' تھا، دونوں حصے اسی دور میں ۱۲۷۱ھ میں ۱۸۷ صفحات پر مشتمل مطبع منعمیہ اکبر آباد سے چھپوا کر شائع کئے گئے، اور سب سے جامع اور مکمل روداد خود مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے قلم سے اظہار الحق کے نام سے شائع ہوئی اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے اور شائع ہوئے۔

تاریخ ساز کارنامہ:

روداد یں جھوٹی سچی جتنی بھی شائع ہوئیں لیکن ان کا وجود مٹ گیا لیکن یہ حقیقت پتھر کی لکیر کی طرح تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ یورپ کا مایۂ ناز پادری جو پادریوں کی پوری فوج کا امیر لشکر اور سپہ سالار تھا جس کی لن ترانیاں آسمان کو چھورہی تھیں وہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام سن کر کانپنے لگا تھا وہ ہندوستان سے اس طرح فرار ہوا جیسے خرگوش شکاری کی آہٹ پا کر بے تحاشا بھاگتا ہے اور پھر دوبارہ اس کو ہندوستان کی طرف کسی کھڑکی سے بھی جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے معلوم نہیں کہاں مرکھپ گیا، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا سب سے بڑا اور عہد ساز کارنامہ یہ ہے کہ اندلس کی اسلامی حکومت اپنے لاؤ لشکر کے باوجود عیسائیت کے جس سیلاب کو نہ روک سکی انہوں نے نہتے اور تن تنہا یورپ کی اس طوفانی یلغار اور عیسائیت کے سیلاب کو اس طرح روک دیا کہ یہ سیلاب پھر اپنے مخرج اور منبع میں بند ہوکر رہ گیا اور انگریزوں کی دوسوسالہ حکومت ہندوستان کو اندلس بنانے کا خواب نہ دیکھ سکی۔

ہجرت کے بعد:

انگریزی حکومت کے پنجۂ عذاب سے بچ کر مکہ مکرمہ جب آپ پہنچے تو آپ سے کچھ ہی دنوں پہلے حاجی امداداللہ تھانوی جو انگریزوں سے جہاد کرنے میں سرخیل علماء تھے انہیں مصیبتوں سے گذر کر جن سے مولانا کیرانوی گزرے تھے مکہ مکرمہ پہنچ کر رباط داؤدیہ میں قیام پذیر تھے، مولانا کیرانوی کی حاجی صاحب سے مطاف میں ملاقات ہوئی، طواف سے فراغت کے بعد حاجی صاحب مولانا موصوف کو اپنی کوٹھری میں لے گئے اور وہیں قیام فرمایا کچھ ہی دنوں بعد مولانا موصوف اساتذۂ حرم کی فہرست میں شامل کرلئے گئے اس دور میں حرم مکہ کے شیخ العلماء سید احمد دحلان تھے

مولانا سے سوال و جواب کے بعد ان کو مولانا موصوف کے علمی مقام و مرتبہ کا اندازہ ہو گیا پھر اپنے گھر پر بلا کر بڑا اعزاز و اکرام کیا انہوں نے مولانا موصوف سے انگریزی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا پورا واقعہ سنا تو بہت متاثر ہوئے، انہیں کی سفارش پر مسجد حرم میں مولانا مرحوم کا باقاعدہ درس شروع ہوا اور علماء حرم کے دفتر میں باقاعدہ آپ کا نام درج کر کے وظیفہ مقرر ہوا، پھر آپ ہجرت کی نیت سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا۔

حکومت ترکی کی طرف سے دعوت:

اس وقت حجاز پر ترکی کی حکومت تھی اور سلطان عبدالعزیز خان تخت حکومت پر متمکن تھے ترکی حکومت کے گورنر شریف عبداللہ بن عون بن محمد امیر مکہ تھے مولانا کیرانوی کا ان سے تعارف ہو گیا امیر مکہ نے مناظرہ کی پوری روداد سن کر بہت مبارک باد دی تھی پھر وہ مولانا کی از حد قدر و منزلت کرنے لگے اس طرح مولانا کیرانوی اپنے دینی مرکز میں عزت و احترام کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

وقت جب کسی کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو کیسے کیسے حیرتناک طریقوں سے اس کی رسوائی پر مہر لگا دیتا ہے، پادری فنڈر ہندوستان سے فرار کے بعد جرمنی، سوئزرلینڈ اور انگلستان میں رہا مگر وہ کہیں پاؤں نہیں جما سکا آخر کار چرچ مشنری سوسائٹی لندن نے اس کو ترکی بھیج دیا اور وہ قسطنطنیہ پہنچ گیا وہ اپنی شرانگیز فطرت سے مجبور تھا اس لئے ترکی جا کر تقریریں شروع کیں بیشتر تقریروں میں ہندوستان میں اپنی شاندار کارگذاری کو بیان کرتا اور اعلان کرتا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیت کی شاندار فتح اور اسلام کو شکست ہو چکی ہے، ہندوستان کے تمام علماء لاجواب ہو چکے ہیں ان میں اب جرأت نہیں کہ مجھ سے گفتگو کر سکیں، آج پورے ہندوستان میں عام طور سے مسلمان عیسائیت قبول کر رہے ہیں عنقریب پورا ہندوستان عیسائیت کی آغوش میں آجائے گا اور ہندوستان سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ترکی کے بادشاہ سلطان عبدالعزیز خاں کو پادری فنڈر کی یہ لن ترانیاں پہنچتی رہتی تھیں، وہ دین پسند اور مذہبی جذبات رکھنے والا بادشاہ تھا اس کو ہندوستان کے بارے میں یہ باتیں سن کر انتہائی فکر لاحق ہوئی ان کو حقیقت حال کے لئے بے چینی ہوئی، انہوں نے فوراً حکم دیا کہ امیر مکہ عبداللہ کو خط لکھ کر تاکید کی جائے کہ اس سال ہندوستان سے حج کے لئے آنے والوں میں سے ان لوگوں کو تلاش کیا جائے جو آگرہ میں عیسائیوں سے ہونے والے مناظرہ کے بارے میں مستند معلومات رکھتے ہوں، یہ حکم نامہ لکھ کر امیر مکہ کو پہلی فرصت میں بھیج دیا گیا، امیر مکہ کو جب یہ خط ملا تو اس نے بواپسی ڈاک جواب دیا کہ جس عالم سے ہندوستان میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا تھا وہ عالم خود ہی مکہ مکرمہ میں موجود ہیں اور مناظرہ کے مختصر حالات جو مولانا موصوف سے اس کو معلوم ہوئے تھے وہ بھی تحریر کردیئے، سلطان ترکی کو جوں ہی یہ خط ملا فوراً یہ حکم نامہ جاری کیا کہ مولانا موصوف کو شاہی مہمان کی حیثیت سے قسطنطنیہ بھیج دیا جائے، ہم ملاقات کے مشتاق ہیں، امیر مکہ نے مولانا موصوف سے خط وکتابت کی ساری باتیں بتائیں اور کہا کہ شاہ ترکی کی طرف سے آپ کو قسطنطنیہ بلایا گیا ہے، سرکاری طور پر ہم اس کا انتظام کردیں گے، چنانچہ مولانا کا یہ سفر قسطنطنیہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں ہوا۔

شاہی اعزاز و پذیرائی:

امیر مکہ نے مولانا موصوف کو پورے اعزاز کے ساتھ قسطنطنیہ کے لئے روانہ کیا، جس دن مولانا موصوف دارالحکومت قسطنطنیہ پہنچے پادری فنڈر کو اس کی خبر مل گئی، وہ اسی رات میں قسطنطنیہ سے خفیہ طور پر فرار ہوگیا اور ترکی کی حدود سلطنت سے باہر چلا گیا پھر اس کے بعد تاریخ میں کہیں فنڈر کا نام نظر نہیں آتا گمنامی کی زندگی گذار کر راہی ملک عدم ہوا مولانا شاہی مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر ہوئے سلطان نے ایک مجلس علماء منعقد کی جس میں وزراء سلطنت کے علاوہ اہل علم اصحاب کو بلایا گیا اور

مولانا مرحوم سے ہندوستان میں مذہب عیسوی کی شکست اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے مفصل حالات سنے، دوسرے دن سلطان نے دولت عثمانیہ میں اس فتنہ وفساد کو روکنے کے لئے ترکی کے سارے مسیحی مبلغین کو گرفتار کر کے جیل بھیجنے کا حکم جاری کردیا اوران کی ساری کتابیں ضبط کرلی گئیں اوران کی اشاعت پر پابندی عائد کردی گئی ان کو مجمع عام میں تقریر کرنے سے حکماً روک دیا گیا، اس طرح سلطان ترکی نے صلیب پرستوں کی ریشہ دوانیوں سے ترکی کو پاک صاف کردیا۔

مولانا مرحوم شاہی مہمان کی حیثیت سے مقیم تھے سلطان ترکی اکثر نماز عشاء کے بعد مولانا مرحوم کو شرف باریابی بخشتے اس وقت صدر اعظم خیرالدین پاشا تونسی اور ترکی حکومت کے شیخ الاسلام وغیرہ بھی شریک مجلس ہوتے تھے، سلطان عبدالعزیز مولانا مرحوم کی جلیل القدر دینی و مذہبی خدمات اور آپ کے مجاہدانہ کارناموں سے بہت متاثر تھے، اس لئے مولانا کے اعزاز واکرام اوران کی عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر خلعت زریں کے ساتھ تمغہ مجیدی درجہ دوم اور گرانقدر وظیفہ ماہانہ سے سرفراز فرمایا، سلطان کی خواہش اور خیر الدین پاشا کی تحریک پر رجب ۱۲۸۰ھ میں مولانا موصوف نے اپنی مشہور عالم کتاب اظہار الحق لکھنی شروع کی، اور ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ یعنی چھ ماہ میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔

قسطنطنیہ ہی میں قیام کے دوران ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں حشر ونشر، نزول وحی، بعثت ونبوت کے مسائل کو عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھایا ہے اس رسالہ کی تحریر سے جمادی الثانی ۱۲۸۱ھ میں فراغت ہوئی، خیرالدین پاشا کے حکم سے یہ رسالہ طبع ہوا، اظہار الحق مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر بھی یہ رسالہ شائع کیا گیا۔

دارالہجرۃ واپسی اور مدرسہ صولتیہ کا قیام:

کئی ماہ مسلسل قسطنطنیہ میں قیام کے بعد آپ نے مکہ مکرمہ واپسی کی اجازت طلب کی، مکہ مکرمہ واپس آکر مسجد حرم میں درس وتدریس کا سلسلہ حسب سابق شروع کردیا، لیکن حرم میں جو تعلیم وتدریس کا طریقہ تھا آپ اس سے مطمئن نہیں تھے، آپ

مکہ میں ایک مستقل مدرسہ جاری کر کے اپنے مرتب کردہ نصاب کے مطابق تعلیم دینا چاہتے تھے، چند معززین سے صلاح ومشورہ کے بعد مدرسہ کے لئے زمین خریدی گئی اور عام مہاجرین سے چندہ کی اپیل کی گئی جس کی پذیرائی ہوئی اور ماہوار چندہ دینے والوں کی ایک فہرست مرتب ہوگئی۔

ابھی اس تحریک پر تین چار ماہ ہی گذرے تھے کہ موسم حج میں کلکتہ کی ایک مالدار بیوہ صولت النساء بیگم اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ حج میں آئیں، ان کا ارادہ تھا کہ مکہ مکرمہ میں اپنی طرف سے کوئی رباط (مسافر خانہ) بنوائیں، بیگم کے داماد مولانا کیرانوی کی مجلس میں آیا کرتے تھے، ایک دن انہوں نے اپنی خوشدامن صاحبہ کے ارادہ کا ذکر مولانا موصوف سے کیا اور آپ سے اس سلسلہ میں مشورہ چاہا مولانا نے ان کو سمجھایا کہ مکہ مکرمہ میں رباطیں بہت ہیں اس سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ یہاں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے، مولانا کی مجلس سے اٹھ کر اپنی خوشدامن کے پاس گئے اور مولانا کے مشورہ کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور خود جا کر مولانا مرحوم سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ مدرسہ کے لئے زمین کی گفتگو فرمائیں اور میں اپنی موجودگی میں مدرسہ کی تعمیر کرانا چاہتی ہوں، چنانچہ وہ زمین خریدی گئی جس پر آج مدرسہ صولتیہ قائم ہے زمین کی خریداری کے بعد اس پر تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا، اکثر اوقات بیگم صاحبہ تعمیر کی جگہ آ کر اس کی نگرانی کرتیں جب تعمیر مکمل ہوگئی تو مولانا مرحوم نے اس نیک خاتون کی اس نیک یادگار کو اسی کے نام سے موسوم کر کے مدرسہ صولتیہ نام تجویز کیا جو آج تک اس شریف نیک اور مخیّر خاتون کی اس مقدس سرزمین پر مبارک یادگار اور صدقہ جاریہ ہے۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں:

مولانا مرحوم یکسوئی کے ساتھ مدرسہ صولتیہ میں درس وتدریس اور اسلامی اتحاد کی پرخلوص جدوجہد میں مصروف رہے، حجاز بدستور ترکی حکومت کے ماتحت تھا، سلطان عبدالعزیز خاں کے انتقال کے بعد سلطان عبدالحمید خان سریر آرائے تخت

خلافت تھے اب حجاز کا گورنر عثمان نوری پاشا کو بنایا گیا، یہ ۱۲۹۹ھ کا زمانہ ہے گورنر خالص فوجی دل ودماغ کا تھا اس لئے مزاج میں ایک گونہ سختی تھی، تدبر، دوراندیشی، نظم مملکت کی حکمت عملی اور مصلحت بینی کا فقدان تھا کچھ خود غرض اور فتنہ انگیز لوگوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مدرسہ صولتیہ کی طرف سے بدظن ہوگیا اور اس کو ایک اجنبی ملک کی تحریک سمجھ کر اس کی مخالفت کرنے لگا، اور اپنے عندیہ کو ترکی حکومت پہنچادیا، مولانا کو اس کا علم ہوا تو گورنر کی رپوٹ کے بعد انہوں نے اپنی معروضات بارگاہ سلطانی میں ارسال فرمائیں اس کے بعد سلطان عبدالحمید خاں نے مولانا مرحوم کو قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی دعوتنامہ موصول ہونے کے بعد آپ قسطنطنیہ روانہ ہوگئے، مولانا مرحوم کا یہ دوسرا سفر ترکی تھا اور پہلے سفر کے ۱۹ سال بعد ہورہا تھا، مولانا کی عمر ۶۷ سال کی ہوچکی تھی قویٰ میں اضمحلال آچکا تھا، اس سفر میں مولانا کے ہمراہ آپ کے برادر زادہ مولوی بدرالاسلام کیرانوی اور مولوی حضرت نور صدر مدرس مدرسہ صولتیہ تھے، اس وفد کا شاہانہ استقبال ہوا، تمام وزرائے سلطنت باری باری مولانا کی قیام گاہ پر آتے رہے اور شرف ملاقات حاصل کرتے رہے، تینوں حضرات کو خلعت سلطانی دیا گیا، دوسرے دن تمغہ مجیدی درجہ چہارم پیش کیا گیا سلطان ترکی عبدالحمید خاں کی جیب خاص سے پانچ ہزار قرش (تقریباً ڈھائی ہزار روپئے) ماہانہ اور دس ہزار قرش (تقریباً پانچ ہزار روپئے) نقد عطا کئے گئے، مزید اعزاز کے لئے کیسۂ مفتاح کعبہ، تسبیح عقیق البحر ایک ایک تسبیح سنگ مقصود کی عنایت فرمائی گئی اور حکومت ترکی کی طرف سے مولانا موصوف کو ''پایۂ حرمین شریفین'' کا خطاب دیا گیا قصر خاص میں جب مولانا موصوف کی حاضری ہوئی تو بادشاہ نے تخت سے دو قدم اٹھ کر آپ کا خیر مقدم کیا اور خوش آمدید کہا۔

مولانا مرحوم اس سفر میں دو سال کے قریب قسطنطنیہ میں رہ گئے اس مدت میں سلطان نے متعدد بار شرف ملاقات بخشا، مولانا کے برادر زادہ مولوی بدرالاسلام بھی ایک بار بادشاہ سے ملاقات کے وقت حاضر تھے، سلطان ترکی نے ان کے متعلق فرمایا

کہ یہ میرے پاس رہیں گے اور کتب خانہ حمیدیہ (سلطان عبدالحمید خاں کا شاہی کتب خانہ جو دنیا کے چند خاص کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے جس میں آل عثمان کے بادشاہوں کے دور کی تمام کتابوں کو جمع کیا گیا ہے) جو قصر یلدز میں ہے اس کا ان کو مہتمم مقرر کرتا ہوں اس لئے مولانا بدرالاسلام وہیں رہ گئے اور آخر وقت تک سلطان کے معتمد علیہ رہے دوسال سے زائد قیام کے بعد سلطان نے مکہ مکرمہ مراجعت کی اجازت دی اور ایک مرصع تلوار عنایت کرتے ہوئے فرمایا:

''ہتھیار ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زینت ہے''

مولانا موصوف ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے مکہ مکرمہ تشریف لائے یہاں آپ کا بڑا پرشکوہ اور شاہانہ استقبال کیا گیا اور سب سے حیرتناک بات یہ تھی کہ عثمان نوری پاشا گورنر حجاز جس کی وجہ سے یہ سفر پیش آیا تھا وہ سب سے آگے تھا اور سب سے پہلے اس نے مولانا مرحوم سے بغلگیر ہو کر آپ کو مبارک باد دی اور اپنی غلط فہمیوں کی آپ سے معافی چاہی۔

مکہ مکرمہ میں مصروفیات:

قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کے نظم ونسق کو درست کرنے میں مصروف ہوگئے، اس دوران حجاز کے بہت سے مسائل، ضروریات، حالات وکیفیات کے سلسلہ میں ترکی حکومت کے وزراء عمائدین سلطنت، مشیران سلطانی اور کبھی کبھی خود بارگاہ خلافت میں خطوط لکھتے رہے اور اہل حجاز کے مسائل کو حل کراتے رہے، کبرسنی اور کثرت مشاغل کی وجہ سے آپ کو ضعف بصر کی شکایت ہوگئی اور بڑی تیزی کے ساتھ نظر گرنے لگی نزول الماء (موتیابند) کا عارضہ تھا یہاں تک کہ ۱۳۰۳ھ میں آپ لکھنے پڑھنے سے معذور ہوگئے، یہ خبر سرکاری طور پر سلطان ترکی کو پہنچی تو بارگاہ سلطانی سے حکمنامہ آیا کہ مولانا کو قسطنطنیہ بھیجنے کا فوراً بندوبست کیا جائے تاکہ ماہر ڈاکٹروں کے ذریعہ بہتر سے بہتر علاج کیا جاسکے مولانا موصوف کو شاہی طلبی کی اطلاع ملی تو ضعف اور کمزوری کی وجہ سے یہ سفر بہت دشوار محسوس ہوا مگر علاج کی

غرض سے یہ سفر کرنا تھا اس لئے مجبوراً بعض رفقاء کو لے کر آپ نے ترکی کا یہ تیسرا سفر کیا۔

ترکی کا تیسرا سفر:

۲؍رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ کو آپ استانبول پہنچے قصر شاہی میں ٹھہرائے گئے، رمضان کا مہینہ تھا افطار کے وقت اکثر شاہی دسترخوان پر آپ بلائے جاتے رہے، ایک دن افطار کے بعد بادشاہ نے کہا کہ کل میں ترکی کے مشہور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بلاؤں گا جو آپ کی آنکھ کا معائنہ کر کے علاج کا فیصلہ کریں گے چنانچہ دوسرے دن پانچ ماہرین امراض چشم ڈاکٹر حاضر ہوئے اور بڑے اہتمام سے معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ نزول الماء کا سلسلہ ابھی جاری ہے اس لئے علاج میں ابھی کم از کم دو ماہ کا وقفہ ضروری ہے، دو ماہ کے بعد ہی علاج کیا جاسکتا ہے، سر دست علاج ملتوی ہو گیا، انہیں مصروفیات میں عید آ گئی شاہی حکم سے مولانا کے لئے لباس تیار کرایا گیا، عید کی نماز مولانا نے استانبول میں پڑھی، مولانا واپسی کی اجازت کے خواہاں تھے اگرچہ ابھی زبان سے اس کا اظہار نہیں فرمایا تھا کہ ایک دن سلطان عبدالحمید خان نے مولانا سے فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ آپ میرے یہاں مستقل رہیں، اس کے جواب میں مولانا مرحوم نے جو کچھ فرمایا وہ صدق واخلاص کی کتاب میں آب زر سے لکھنے کے لائق ہے، مولانا نے بادشاہ سے کہا:

> ''اعزہ واقارب کو چھوڑ کر، ترک وطن کر کے خدا کی پناہ میں اس کے دروازے پر آ کر پڑا ہوں، وہی لاج رکھنے والا ہے آخری وقت میں امیر المومنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا''۔

سلطان کے دل کو یہ بات لگ گئی، جو خلوص، جو درد ان چند جملوں میں چھپا ہوا تھا اس کی قدر و قیمت کو اس نے پہچان لیا مولانا کے اعزاز واحترام کے جذبات اس کے دل میں اور افزوں ہو گئے، بادشاہ نے کہا کہ علاج ہو جانے کے بعد آپ دارالہجرۃ تشریف لے جائیں مجھ کو کوئی ملال نہیں ہوگا لیکن مولانا اس وقت آپریشن کے لئے تیار

نہیں ہوئے اجازت کے طالب ہوئے، سلطان کو بھی مولانا کی از حد دلداری مقصود تھی اس لئے آپ کی مرضی کے خلاف اصرار نہیں کیا، سلطان سے اجازت لے کر ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ میں آپ مکہ مکرمہ واپس آئے سال بھر بعد ۱۳۰۵ھ میں مکہ مکرمہ کے ایک ڈاکٹر سے آنکھ کا آپریشن کرایا مگر آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔

کف بصر کے بعد:

آپریشن کی ناکامی کے بعد جب لکھنے پڑھنے سے ایک دم معذور ہو گئے تو مولانا موصوف کے بڑے بھائی حکیم علی اکبر کے لڑکے محمد صدیق پنجاب کے ایک مشنری اسکول میں ماسٹر تھے انہوں نے اپنے لڑکے محمد سعید کو بھی تعلیم کے لئے وہیں داخل کرادیا تھا، مولانا مرحوم کو یہ صورت حال معلوم ہوئی تو اپنے بھتیجے محمد صدیق کو بہت سخت خط لکھا کہ محمد سعید کو مشن اسکول سے نکال کر فوراً مرے پاس مکہ مکرمہ بھیج دو، اس کی تعلیم وتربیت میں کروں گا، چنانچہ محمد سعید مکہ مکرمہ آ گئے تھے مولانا مرحوم نے ان کی تعلیم مکمل کرائی اور حضرت حاجی امداداللہ تھانوی کی خدمت میں حاضری دینے کی تاکید فرماتے رہے اس طرح تعلیم وتربیت کے بعد مولوی محمد سعید ایک پختہ کار عالم ہو چکے تھے، مولانا کے کف بصر کے بعد انہوں نے مولانا مرحوم کے خط وکتابت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی شب وروز حاضر خدمت رہتے تھے صرف نماز مغرب سے نماز عشا تک مولانا محمد سعید حضرت حاجی امداداللہ تھانوی کی خدمت میں حاضر رہتے وہاں حاجی صاحب کے نام آئے ہوئے خطوط کو سناتے اور ان کے حکم کے مطابق خطوط کے جوابات لکھتے تھے۔

وفات:

اب مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی عمر ۷۵ سال کی ہو چکی تھی، چار سالوں سے وہ آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے، چلنے پھرنے کی طاقت جواب دے چکی تھی آخر وقت موعود آ گیا، ۲۲/ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ یوم جمعہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، خادم

اسلام جس کو پایۂ حرمین شریفین کا خطاب حاصل تھا اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک لمبی زندگی دین کی خدمت میں گذاری اس کے صلہ میں قدرت کی طرف سے ایک مقدس سرزمین میں جنة المعلاة مکہ مکرمہ میں ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے جوار میں آسودۂ خواب ہوئے جہاں ان کے رفیق خاص حاجی امداد اللہ تھانوی محوخواب ہیں۔ **اللّٰھم اغفر وارحم وانت ارحم الراحمین.**

اللہ اللہ کیا انقلاب زمانہ اور گردش ایام کے کرشمے ہیں، مولانا رحمت اللہ کیرانوی جن کے آباء واجداد کو اکبر جیسا بادشاہ جاگیر پیش کرتا ہے، جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ کا تخلیق کار بادشاہ شاہجہاں جس گھرانہ کا مہمان بنتا ہے جس کا شاہانہ کروفر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس کے محلّہ کو دربار کلاں کہا جاتا تھا جہاں خدم وحشم کے جلو میں زندگی بسر ہوئی جس کی شرافت وطہارت کی قسم کھائی جاسکتی تھی جس کے اعزاز واحترام میں عقیدت کی پیشانیاں جھک جاتی تھیں جس کی سچائی اور راست گفتاری جس کا صدق واخلاص جس کی پاکبازی و پاک دامنی بے مثال تھی ایسا شریف النفس انسان انگریزی حکومت کا مجرم بن کر حلیہ اور نام بدل کر پیادہ پا جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھان کر چور اور ڈاکوؤں کی طرح کا مجرم بن کر روپوشی کی حالت میں کمپنی کے حدود سلطنت سے نکل رہا ہے، جیسے اس سے بڑا کوئی مجرم نہیں، پولیس بیڑیاں اور ہتھکڑیاں لے کر کتے کی طرح پیچھا کررہی ہے، اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ ایک مخلص اور سچا مسلمان ہے حق کا پرستار ہے، باطل سے برسر پیکار ہے، وہ صداقت کو دل میں رکھنے کے بجائے برملا کہنے کا طرفدار ہے وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ تثلیث پرستی کی ظلمت اسلام کی روشنی پر چھا جائے وہ ضلالت کو صداقت کہنے کے لئے تیار نہ تھا، بس اسی جرم میں اس کی اتنی بڑی ریاست کو ظالم وجابر حکومت نے اس کے خاندان کو نان شبینہ کا محتاج بنادیا اور وہ اپنے اعزا واقرباء اور اپنے وطن پر آخری حسرت بھری نگاہ ڈال کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوا اور اسی عالم میں جاں جاں آفریں کو سپرد کردی، دین کی راہ میں اس کی انہیں قربانیوں کا خدا کی طرف سے اس کو، اس کے نیک نام اور اس

کے کارناموں کو زندہ جاوید بنایا گیا اور ظالم و جابر حکومت کا ہندوستان سے وجود مٹا دیا گیا۔

تاریخ ساز شخصیت:

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے حالات کی نزاکت، خطرات کے ہجوم میں انگریزی حکومت کے منصوبہ کو سبوتاژ کرنے کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ان کو پیش نظر رکھ کر اگر ان کی شخصیت کو ایک عہد ساز شخصیت کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا، سوچنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی حکومت نے پورے ہندوستان میں حکومت کی طاقت کے بل بوتے پر جو مہم شروع کی تھی وہ وقتی جوش اور ہنگامی جذبات کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی اور پچیس تیس سالوں کی شب و روز کی جدوجہد، ادارے کا قیام، علوم اسلامی کی تنفیذ، درس وتدریس، عربی فارسی اور اردو زبانوں کی مکمل تعلیم اور ہزاروں افراد کو اس نظام تعلیم سے وابستہ کر کے ایک پوری ٹیم پر ماہر اساتذہ نے اپنی ساری صلاحیتیں لگا دیں تب پادریوں کی یہ فوج تیار ہوئی اور ہندوستان کے مورچہ پر اپنی مہم انجام دینے کے لئے بھیجی گئی، ظاہر ہے کہ ان پادریوں اور عیسائی مشنریز کی فوج سے انگلینڈ کی حکومت کی بہت سی امیدیں، امنگیں اور اس کے جذبات وابستہ تھے، ان کے لئے حکومت کی سطح پر سارے وسائل مہیا کئے گئے تاکہ منصوبہ کسی بھی مرحلہ پر فیل نہ ہونے پائے جہاں کہیں اس مورچہ میں کمزوری نظر آئے حکومت اس کو فوراً دور کرنے کے لئے آمادہ و تیار، ایسی منصوبہ بندی اور پلاننگ کے بعد اتنی طاقتور حکومت اپنی مہم کا آغاز کرتی ہے اور کئی برس تک بلا روک ٹوک اس مہم کو سر کرنے میں صرف کر چکی ہے اور ہر اگلے قدم پر اس کو کامیابی کی امیدیں حسب توقع بڑھتی چلی جاتی ہیں ٹھیک اسی ماحول میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے تن تنہا پادری فنڈر کو نہیں انگریزی حکومت کو گویا چیلنج کر دیا، کیا کوئی مغرور حکومت جس کو اپنی قوت پر ناز ہے اس چیلنج کو برداشت کر سکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود مولانا رحمت اللہ کیرانوی حکومت کے سارے منصوبے کو خاک میں ملانے میں کامیاب ہو گئے کیا یہ

محیر العقول کارنامہ نہیں؟ کیا کوئی شخص اس دور میں ایسا سوچ سکتا تھا مولانا کیرانوی نے اپنی جان داؤ پر لگادی، اپنی پوری ریاست لٹوادی تختہ داران کا منتظر رہا، پھانسی کے پھندے ان کی نگاہوں کے سامنے جھولتے رہے لیکن انہوں نے یہ ہولناک منظر دیکھ کر اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹایا ان کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا رہا یہاں تک کہ اس مورچہ کو فتح کرلیا۔

انگریزی حکومت کے منصوبے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یورپ کے مایہ ناز اہل علم اور مفکرین اور چرب زبان مقررین کے ذریعہ مسلمان قوم کے اہل علم کو ذہنی وفکری محاذ پر شکست دے دی جائے تاکہ تبلیغ عیسائیت کی راہ میں علماء اسلام جوسنگ راہ بن سکتے ہیں ان کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے راستے سے ہٹا دیا جائے تاکہ تبلیغ عیسائیت کی راہ آسان ہوجائے پھر پورے ملک کو عیسائی بنالینا آسان ہوجائے گا، لیکن حکومت کو پہلے ہی محاذ پر سخت ناکامی ہوئی نتیجہ ان کی امیدوں کے برخلاف نکلا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ مناظرہ اکبرآباد میں ناکامی کے بعد بھی تبلیغ عیسائیت کی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی تھی اس لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کامیابی وقتی چیز تھی اوراس کے اثرات ایک مخصوص دائرے تک ہی رہے، حکومت اپنے منصوبے پر عمل کرتی رہی مگر آپ کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اس مناظرہ نے پورے ملک پر سب سے پہلا اور گہرا اثر ڈالا کہ اس ملک کے تمام مسلمان اور ہندوؤں کو یقین ہوگیا کہ کمپنی کی یہ حکومت ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہب کی دشمن ہے اس لئے حکومت کی طرف سے ذہنوں میں ایک نفرت بیٹھ گئی اوراسی شدید نفرت کا نتیجہ تھا کہ مناظرہ کے تیسرے سال عام بغاوت کا کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا اور کمپنی کو اپنی حکومت بچانی دشوار ہوگئی اس بغاوت نے حکومت کی چولیں ہلادی حکومت نے یقین کرلیا کہ اگر تبلیغ عیسائیت کا یہی سلسلہ جاری رہا تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک ایک انگریز کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دی جائے گی، حکومت کی بقا کا تو کوئی سوال ہی نہیں اور بغاوت کے بعد فوراً تبلیغ عیسائیت کی پالیسی بدل گئی یہ مولانا کیرانوی کے مناظرہ اکبرآباد میں شاندار کامیابی کا ثمرہ تھا انہوں نے ڈائنامیٹ کے

فلیتہ میں آگ لگائی جس نے تین سال بعدزبردست دھماکہ کیا اور حکومت کے دماغ کا نشہ ہرن ہوگیا۔

احساس فراموش قوم:

جو کام اندلس غرناطہ، قرطبہ کے بادشاہوں نے اپنے تمام لاؤلشکر کے باوجود انجام نہیں دیا اور پورے اسپین کو اسلامی عظمتوں کا قبرستان بننے کے لئے بے یارومددگار چھوڑ دیا اور آج ڈھائی سوسال سے اس سرزمین کواللہ اکبر کی آواز سننے سے محروم کردیا، وہ کام ہندوستان میں تن تنہا ایک عالم نے انجام دیا جب کہ اس کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں تھی لیکن یورپ کے تمام ذہنی وفکری قلعوں کو فتح کر کے رکھ دیا ہندوستان کو مکمل طور پرعیسائی بنانے کا جو فیصلہ لندن پارلیمنٹ نے کیا تھا اس فیصلہ کو اپنے جوتوں سے روندکررکھ دیا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اسلامی ہند کی ایک بے مثال شخصیت تھی مگر احسان فراموش ہندوستان ان کو بہت جلد بھول گیا، صاحبان جبہ ودستار انگریزی حکومت کے پرستار ووفادار اور دشمنان اسلام کے کاسہ لیس مسلمانوں کے مسیحا جن کے نامۂ اعمال میں زرطلبی، نام ونمود، عیش وراحت کی طلب کے علاوہ کوئی کارنامہ نہیں آج ان پر ضخیم ضخیم کتابیں لکھی جارہی ہیں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی پر ہندوستان میں کوئی کتاب بلکہ کوئی اہم تحقیقی مقالہ تک نہیں لکھا گیا اور نہ ان کے عظیم کارناموں کو علمی دنیا کے سامنے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ذہنی وفکری غلامی میں مبتلا قوموں کی بدبختی کا آخری اسٹیج یہی ہے کہ وہ اپنے محسنوں کو بھی فراموش کردیتی ہے اور ایسے لوگوں کو سال بہ سال یاد کرنے کی تاریخیں مقرر کرتی ہے جو اسلام کے ایوان کی ایک ایک اینٹ بیچ کر اپنی اپنی عظمت واقتدار کا محل تعمیر کررہے تھے اپنے گھر اور خاندان کے لئے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کراتے رہے۔

تفوبر تو اے چرخ گردوں تفو

تاریخ عرب

ایک عیسائی مستشرق کے قلم سے

قوموں کا عروج و زوال قوانین قدرت کے تحت ہے، عروج کے جس طرح کے اصول وضوابط اور شرائط ہیں اسی طرح زوال کے بھی کچھ مخصوص اسباب ہوتے ہیں، عقیدہ میں صلابت، نصب العین سے بے پناہ محبت، عزم وعمل میں طاقت وقوت، اپنے قائد پر غیر متزلزل اعتماد کسی قوم کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر بام فلک پر پہنچا دیتا ہے، فتح وظفر اس کے قدم چومتی ہیں، اس کے اقتدار کا پرچم فضائے آسمانی میں شان وشوکت کے ساتھ اس طرح لہراتا ہے، جیسے صیقل شدہ ننگی تلوار کسی بہادر کے ہاتھ میں لہراتی ہے، اور کسی کو اس کی طرف نظر بھر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، پہاڑ اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے موجیں مارتا ہوا دریا اس کے لئے راستہ بنا دیتا ہے، اس اولوالعزم قوم کے گھوڑوں کی ٹاپ زمین پر اس طرح پڑتی ہے جیسے مشکلات ومصائب اور دشواریوں کے سروں پر ہتھوڑے برس رہے ہیں، مسلمانوں کا دور عروج ان جملوں کی عملی تصویر ہے، مؤرخ نے لکھا، ان حقیقتوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا، اپنوں نے قلم بند کیا، غیروں نے اس کی تصدیق کی اور اس کا اعتراف کیا، آج ہم اپنے آباء واجداد کے ان کارناموں کو دہراتے ہیں تو ہماری موجودہ ذلت ونکبت، پسماندگی وادبار کی وجہ سے حقیقت افسانہ بن جاتی ہے اور ''پدرم سلطان بود'' کا طنز سننا پڑتا ہے اور ہماری وہ حیثیت ہو جاتی ہے جیسے کوئی دلق پوش فقیر دست سوال دراز کئے ہوئے ہے اور خود شاہی خاندان کے فرد ہونے کا اعلان کرتا ہے، سننے والے ہنس دیتے ہیں کیوں کہ اس کی موجودہ حالت ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے، مگر ماضی ایک ٹھوس حقیقت ہے، کسی کے تمسخر واستہزا سے بدل نہیں سکتا، کلکتہ میں سلطان ٹیپو شہید کے ورثہ کو رکشا چلاتے ہوئے دنیا نے دیکھا ہے، مٹیا محل برج کے آس پاس شاہان اودھ کے امراء کی اولاد کو

قلی اور مزدوروں کی شکلوں میں دیکھا گیا ہے، دہلی میں شاہانِ مغلیہ کی شہزادیوں کو لوگوں کے گھروں میں جھاڑو لگاتے ہوئے اور برتن مانجھتے ہوئے پایا گیا، ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ حکومت حیدرآباد کے دور کے امراء کی اولاد کو لوگوں کی چارپائیاں بنتے ہوئے اور رکشہ کی مرمت کرتے ہوئے دیکھا گیا، ان سبھوں کی پیشانیوں پر تحریر تھا۔

ہم بھی کبھی تخت وتاج کے مالک تھے

ہمارا عروج افسانہ نہیں حقیقت ہے، اس کی کہانیاں ٹھوس سچائیاں ہیں، ہم ان حقیقتوں کو فراموش نہیں کر سکتے ان کو فراموش کر جانا ہماری موت ہے اور ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اسلام وایمان کی بخشی ہوئی توانائیوں سے یکسر خالی نہیں ہو گئے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ اس زوال کی تاریکیوں سے ہی ہمارے اقبال کا سورج طلوع ہوگا اس لئے اپنی تاریخ دہراتے رہیں گے کیونکہ تاریخ کے انہیں اوراق میں ہماری طاقت کا راز پوشیدہ ہے، ہمیں یقین ہے کہ ماضی کی توانائیوں کا تسلسل مستقبل سے جڑا ہوا ہے اس لئے مسلمانوں کو ماضی کی زرخیز اور شاداب وادیوں میں لے جاکر ان کی اصل طاقت سے واقف کرانا وقت کا اہم ترین فریضہ ہے، عالمی پیمانے پر یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے، روئے زمین پر بسنے والے ۹۵ کروڑ مسلمانوں میں زندگی کی حرارت اگرچہ بہت اہم ہے لیکن یہ معمولی حرارت غمازی کرتی ہے کہ اندر اندر توانائیوں کی بھٹی سلگ رہی ہے اور یہ ایک اچھی علامت ہے، ہماری تاریخ ہمارے آباء واجداد کے کارنامے زندگی کی حرارت میں اضافہ کا بہت اچھا ذریعہ ہیں، بس اسی نقطہ نگاہ سے میں آپ کو آپ کے دور عروج کی کچھ جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں مگر میں آج کی صحبت میں مسلم مؤرخوں کی کتابوں کے بجائے ایک ایسے غیر مسلم مورخ کی کتاب کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو اسلام کا دوست اور مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں بلکہ مستشرقین کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، جنہوں نے تقریباً ایک صدی سے اسلامی علوم وفنون کی خدمت کے خوبصورت عنوان سے نخل اسلام کی جڑوں میں ہمیشہ گرم پانی دیا ہے تا کہ یہ درخت قبل از وقت سوکھ جائے۔

مصنف کا نام پروفیسر فلپ کے ہٹی اور اس کی کتاب کا نام ''ہسٹری آف عرب'' ہے، کتاب ۱۹۳۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہ کتاب بہت بڑی تعداد میں امریکی حکومت نے شائع کر کے اپنے فوجیوں میں تقسیم کی، کتاب کے ترجمے متعدد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں، اردو میں اس کا ترجمہ پچاس سال پہلے شائع ہوا تھا، وہی اردو ایڈیشن میرے پیش نظر ہے، مسلمانوں کے دور عروج کی افسانوی کہانی اور مسلمانوں کی بے مثال تہذیبی وتمدنی ترقیوں سے چونکہ مصنف کا کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے اس لئے اس کے بیان میں کسی مبالغہ آرائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے دل کی آواز اور اس کے صحیح جذبات ہیں، کتاب کا نام اگرچہ تاریخ عرب ہے لیکن عرب کی تاریخ تو اس گفتگو کا نقطۂ آغاز ہے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اس کا اصل موضوع ہے، چونکہ اسلام کا سورج سرزمین عرب کے افق سے طلوع ہوا اس لئے کتاب کے آغاز میں عربوں کی سرزمین اور اس کے باشندوں کی زندگی سے تاریخ کی روشنی میں قاری کو روشناس کرایا ہے، اس نے قبل از اسلام عربوں کی زندگی کی ایک حقیقی تصویر پیش کرتے ہوئے لکھا:

> ''عرب کا ملک تقریباً سارا کا سارا ریگستانی ہے، عرب اپنے ملک کو جزیرہ کہتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ عرب ایک ایسا جزیرہ ہے جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف ریت ہے، اپنے آباء واجداد کی طرح بدوی اب بھی بھیڑوں اور اونٹوں کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے ہیں، اپنے گلّوں کو انہیں قدیم چراگاہوں میں چراتے ہیں اور بھیڑوں کی گلہ بانی کے سوا ایک حد تک گھوڑوں کی پرورش وپرداخت، شکار اور لوٹ مار بھی بدوؤں کی زندگی کے مخصوص مشغلے ہیں''۔

مصنف عربوں کے ذہن ومزاج اور ان کی وحشت بھری زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ قوم سخت دل اور انتہائی جفاکش ہے اس کا بیان ہے:

''بدوی کے جسم کی وضع قطع اور اس کے ذہن کی بناوٹ، اس کے ریگستانی وطن کی آب وہوا کی یکسانیت اور خشکی کی سچی آئینہ دار ہے، بدوی عصبوں، نسیجوں اور ہڈیوں کہ ایک گٹھری ہوتا ہے، کھجور اور دودھ اس کی ذوقۂ حیات کے اہم ترین اجزاء ہیں، صرف کھجور اور اونٹ کا گوشت ہی اس کی ٹھوس غذائیں ہیں، کھجور کی گٹھلیوں کی روٹیاں اس کے اونٹ کے روزانہ کی غذا ہے ہر بدوی کھجور اور پانی پر تصرف پانے کا خواب دیکھتا ہے۔

غذا کی طرح اس کا لباس بھی بہت مختصر ہوتا ہے، ایک لمبی قمیص پر کمر بند لپٹا ہوا اور ایک ڈھیلی ڈھالی عبا جو تصویروں میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے، سر پر ایک شال جس کو ایک ڈوری سے باندھ لیا جاتا ہے، پاجامہ نہیں پہنا جاتا، جوتا کم ہی استعمال ہوتا ہے''۔

فلپ بتاتا ہے کہ عربوں کی پوری زندگی اونٹ کی رہین منت ہے، اس کو زراعت سے نفرت ہے، کوئی پیشہ یا حرفت اپنانے کے لئے نااہل ہے وہ نیم وحشی جانور کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اس کی کل کائنات صرف اونٹ ہے اور کچھ وہ جانتا ہی نہیں کہ زندگی بسر کرنے کے اور دوسرے بھی بہت سے راستے ہیں اس کی زندگی صرف اونٹوں پر منحصر ہے اس کے علاوہ وہ کچھ سوچتا ہی نہیں اور نہ اس میں سوچنے کی صلاحیت ہے وہ ہمیں تفصیل سے بتاتا ہے:

''عرب کے چوپایوں میں دو جانور بہت اہم ہیں ایک اونٹ اور دوسرا گھوڑا، اونٹ کے بغیر تو یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ریگستان بھی کوئی بسنے کا مقام ہوسکتا ہے، اونٹ بدوی کا کفیل، نقل وحمل کا ذریعہ، اس کے کاروبار میں ذریعہ مبادلہ رہا ہے، دلہن کا جہیز، خوں بہا، قمار بازی کی جیت اور شیخ کی دولت یہ ساری چیزیں اونٹ ہی کی اصطلاح میں شمار کی جاتی ہیں، اونٹ بدوی کا جاں نثار رفیق ہے، پانی کے بجائے وہ اونٹ کا دودھ پیتا ہے اور پانی اپنے چوپایوں کے لئے بچا رکھتا ہے، اس کا گوشت کھاتا ہے، اس کی کھال اوڑھ لیتا ہے، اس کے بالوں سے اپنا خیمہ بنتا ہے، اس کی مینگنیاں ایدھن کے طور پر، اس کی

پیشاب کو سر کے بالوں میں مقوی دوا کے طور پر ڈالتا ہے، کیڑے مکوڑوں کو کاٹنے سے محفوظ رہنے کے لئے اسے اپنے چہرے میں ملتا ہے غرضیکہ اس کے حق میں اونٹ کی حیثیت جہاز صحرا سے بھی زیادہ ہے''۔

فلپ لکھتا ہے کہ قتل و غارت گری، انتقام در انتقام اس طرح کی زندگی گزارنے والوں کی فطرت اور ذہن و مزاج ہی ہوتا ہے، چھوٹے چھوٹے گروہ قبیلہ بنا کر رہتے ہیں وہی ان کی دنیا ہے، یہی قبیلہ ان کی حکومت ہے، ان کا ہر آدمی فوجی ہے، قبیلہ کے کسی فرد پر اگر کسی دوسرے قبیلہ کے فرد نے حملہ کر دیا، لوٹ لیا، یا قتل کر دیا تو پورے قبیلہ کی ذمہ داری ہے کہ قاتل قبیلہ سے انتقام لے، سمجھوتہ، صلح نامہ، باہمی گفت وشنید کا کیا ذکر؟ جب تک دوسرے قبیلہ کے کسی فرد کے خون سے ان کی تلوار کی پیاس نہیں بجھتی تب تک ان کی تلوار میان میں نہیں جا سکتی، اگر انتقام کے بعد یہ جنگ بڑھ گئی تو برسہا برس تک انتقام در انتقام اور خون کا بدلہ خون کا چکر چلتا رہتا ہے یہ بدوی کچھ ایسے ہی خونخوار تھے، مصنف لکھتا ہے:

''ریگستان کے قدیم دستور کی رو سے خون کا بدلہ خون ہی ہے، اس کے لئے انتقام کے سوا اور کوئی سزا تسلیم نہیں کی جاتی، سزا کی ذمہ داری مقتول کے قریب ترین رشتہ داروں پر عائد ہوتی ہے خون کا جھگڑا چالیس سال بھی جاری رہتا ہے، قبیلہ داری اسپرٹ افراد قبیلہ سے نامحدود اور غیر مشروط وفاداری کی طالب ہوتی ہے، اس کا تصور یہ ہے کہ اس کا قبیلہ ایک خود مکتفی اور مطلق العنان وحدت ہے، اس کو قانوناً حق حاصل ہے کہ دوسرے قبیلوں کو اپنی لوٹ مار اور ہلاکت آفرینیوں کا ہدف بناتے اسلام نے اپنے فوجی مقاصد کے سلسلہ میں قبیلہ داری نظام سے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔

فلپ لکھتا ہے کہ ایسی وحشیانہ زندگی بسر کرنے کے باوجود یہ بدوی حد درجہ مغرور ہوتے ہیں اور دنیا کی کسی قوم کسی فرد کو وہ عزت دینے کے لئے تیار نہیں، وہ خود کو سب سے برتر سب سے بلند و بالا اور بلند رتبہ سمجھتے ہیں وہ لکھتا۔

اپنے کو موجودات کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ سمجھتا ہے اس کے نزدیک عرب قوم دنیا کی تمام قوموں کے مقابلہ میں سب سے اونچے درجے والی عالی ظرف قوم ہے، بدوی کے اسی نقطۂ نظر سے متمدن انسان اطمینان قلب کے لحاظ سے کم مطمئن اور مرتبہ کے لحاظ سے بہت گرا ہوا ہے، عرب اپنے بے میل خون، اپنی ثقافت اپنی شاعری، اپنی تلوار، اپنے گھوڑے اور سب سے بڑھ کر اپنے اعلیٰ حسب نسب پر بے انتہا فخر کرتا ہے وہ انساب میں غیر معمولی تحقیق کا شیدائی ہوتا ہے، اکثر اپنے سلسلہ نسب کو حضرت آدم تک گنا تا ہے۔

فلپ نے بڑی تفصیل سے عرب کے جغرافیائی حالات، عربوں کے ذہن ومزاج بود وباش اوران کی قبائلی زندگی کی خصوصیات کو پیش کیا ہے، ان کے عقائد، ان کے مذہب اور افکار وخیالات سے کم بحث کی ہے اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ریگستانی علاقوں میں رہنے والوں کے لئے دن بہت سخت ہوتا ہے، وہ رات کو زیادہ راحت محسوس کرتے ہیں، کیوں کہ دھوپ کی شدت ریگستان میں نا قابل برداشت ہوتی ہے وہ رات ہی میں سفر کرتے ہیں رات کے پچھلے پہر چلنے والی خوشگوار ہوا کی وہ ہمیشہ تعریف کرتے ہیں **نسیم الصبا جاءت بری القرنفل** جیسے مصرعے باد صبا کی اسی فرحت بیزی کی وجہ سے ہیں، رات میں چاند ان کا رفیق ہوتا ہے ستارے ان کی رہنمائی کرتے ہیں اس لئے چاند کی پرستش کا رجحان ضرور تھا، مصنف نے بتایا ہے کہ عرب جغرافیائی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہے ایک حصہ میں تجارت اور دوسرے ملکوں میں آنے جانے کا بھی سلسلہ تھا ان سفروں سے وہ بہت سے تجربات بھی حاصل کرتے تھے۔

فلپ کا انداز بیان مسلم مؤرخین کے انداز بیان سے مختلف ہے اس نے صرف تاریخ کے حوالے سے عربوں کو جیسا پایا اس نے ان کی زندگی کو پوری دیانتداری سے پیش کردیا ہے اور بدویوں کی زندگی کے ان پہلوؤں پر زیادہ گفتگو کی ہے جن کو مسلم مؤرخین نظر انداز کردیتے ہیں کیوں کہ یہ ان کی نجی زندگی کے واقعات ہیں اور ان کی

وجہ سے ان کی معاشرتی زندگی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے،اس کی تصویر کشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب ایک نیم وحشی قوم ہے البتہ فلپ نے عربوں کی شاعری کی دل کھول کر تعریف کی ہے اس فن میں ان کے کمال کا پورا پورا اعتراف کیا ہے۔

فلپ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم عرب کے بارے میں اس کی معلومات بہت وسیع ہیں قبل مسیح کی روایات سے بھی اس کو مکمل واقفیت ہے،مجموعی طور پر اس کی تفصیلات پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ ریگستان اور اس کی آب وہوا، گلہ بانی کرنے، شب وروز جانوروں کے ساتھ جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے عربوں کی زندگی میں کہیں سے یہ جھلک نظر نہیں آتی کہ وہ ریگستان اور اس کی کانٹے دار جھاڑیوں سے آگے بھی کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والی مخلوق ہے وہ ایسی سنگلاخ چٹانوں کے مانند کھردرے، ناہموار، سخت اور ناقابل تسخیر انسانی جسم رکھنے والی مخلوق ہے وہ ایسی سنگلاخ چٹانوں کے مانند تھے جن کو تراشنے والا کوئی ماہر کاریگر کبھی نہیں آیا ایسی ہی قوم میں مسلمانوں کے پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جنہوں نے ان سنگلاخ چٹانوں کے اندر مخفی یاقوت وزمرد جیسے قیمتی اجزا نکالے اور تہذیب وتمدن کے بازار میں ان کی قدر وقیمت کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا اور یہی اونٹ اور بھیڑ چرانے والے تہذیب وتمدن کے بانی اور ساری دنیا کے تہذیب وثقافت کے معلم بن کر ساری دنیا پر چھا گئے اور کئی سالوں تک انہیں بدویوں نے بے مثال نظام حکمرانی قائم کر کے دنیا کو تہذیب وثقافت اور بے مثال تمدن اور اخلاق وشائستگی کا سبق پڑھایا۔

مصنف نے صرف دس صفحات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی کے اہم ترین اور بنیادی واقعات کو سمیٹ لیا ہے جس کی جزئیات سیکڑوں صفحات میں مسلم مؤرخین نے بیان کی ہیں، کیوں کہ فلپ صرف ایک مورخ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں برپا ہونے والے انقلاب کے وہ اجزا جو تاریخ عالم میں زندۂ جاوید بن جانے والے تھے صرف انہیں کو اپنے ذہن ومزاج کے مطابق

اخذ کیا ہے یہاں تک کہ مکہ فتح ہوکر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور اسلامی حکومت قائم ہوگئی جس کا دارالحکومت مدینہ قرار پایا اور بحیثیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں میں جو ذہنی وفکری اور عملی تبدیلیاں کی ہیں ان کو مناسب موقعوں پر پیش کرتا چلا گیا ہے، عربوں میں قبیلہ واریت کا جو روگ تھا جس کو مسلمانوں نے عصبیت جاہلیہ کا نام دیا ہے اس کی جڑ کاٹ دی، مصنف نے حجۃ الوداع کا ذکر کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نقل کیے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ’’لوگو! میری باتوں کو غور سے سنو، دل لگا کر سنو، جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، تم سب کا تعلق ایک برادری سے ہے اس لئے تم میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے بھائی کی کسی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر اپنے قبضہ یا استعمال میں لائے، اس طرح عربوں کے تعلقات، یعنی قبائلی رشتہ داری کی گرہ ایک ہی وار میں کٹ گئی اور اس کی جگہ ایمان کی مضبوط گرہ لگادی گئی، ملک عرب کے لئے ایک طرح کی اسلامی برادری قائم کر دی گئی، اسی نئی جماعت میں نہ تو کسی طرح کا کاہنی نظام تھا نہ ہی پیشواؤں کی حکومت تھی اور نہ کوئی مرکزی دینی عدالت تھی اس کی مسجدیں مشترک عبادت کا مقام ہونے کے علاوہ عام اجتماعی اور فوجی تربیت کا مقام بھی ہوتی تھیں، مسجد میں امام عبادت کے موقعوں پر مسلمانوں کی قیادت کرنے کے سوا میدان کارزار میں اسلامی فوجوں کا سپہ سالار بھی ہوا کرتا تھا اور تمام مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ وہ ساری دنیا کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی امداد اعانت کریں اور حفاظت کریں ......اسلام نے پچھلی زندگی کی باتوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا، شراب اور قمار بازی، جو عورت کے بعد عربوں کی زندگی کے دو محبوب ترین مشغلے تھے ایک ہی آیت کے ذریعہ حرام کر دیا گیا‘‘۔

مدینہ میں جو معاشرہ ابھر رہا تھا اس کے اندر جو انقلابی تبدیلیاں ہو رہی تھیں عربوں اور بدویوں کے ذہن ومزاج کو جس سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا مصنف نے

اس کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اس نے بتایا کہ مدینہ میں نظم ونسق کے اعتبار سے ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہوگئی تھی لیکن یہ حکومت رتبہ کے لحاظ سے چھوٹی تھی لیکن ایک ایسا مستحکم قلعہ کر دیا گیا جس کی ہر ہر اینٹ فولاد کی بنی ہوئی تھی اس کی بنیاد ایمان ویقین کی ٹھوس چٹانوں پر رکھی گئی کہ تیز سے تیز آندھی نہ اس پر اثر انداز ہوسکتی تھی اور نہ زلزلوں کا جھٹکا اس کو متزلزل کرسکتا تھا، رسول اللہ نے دو تین سالوں کی قلیل مدت میں اتنا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، کہ دنیا کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی، اس کے بعد مصنف نے لکھا:

> ’’مدینہ سے اسلام کی دینی حکومت عرب کے طول وعرض میں پھیل گئی اور رفتہ رفتہ اس نے مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ کے ایک بڑے حصہ کو مسخر کرلیا، مدینہ کی اسلامی جماعت گویا مستقبل کی ملت اسلامیہ کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی مختصر سی دنیوی زندگی میں ایک غیر امید افزا ہیولیٰ سے عرب جیسے گمنام اور دنیا سے الگ تھلگ ملک میں ایسی قوم پیدا کی جس کی شیرازہ بندی آپ سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، آپ نے ایک ایسا دین پیش کیا جس نے دنیا کے وسیع وعریض علاقوں میں یہودیت اور نصرانیت کو ان کے اونچے مقام سے ہٹا کر خود ان کی جگہ لے لی اور آج بھی اولاد آدم کی بہت بڑی تعداد اسی دین کی پیروی کرتی ہے، آپ نے ایک ایسی مملکت کا سنگ بنیاد رکھا جو اس وقت کی متمدن دنیا کے بہترین علاقوں کو بہت جلد اپنے وسیع وعریض دامنوں میں سمیٹ لینے والی تھی، آپ امی تھے لیکن آپ کے ذریعہ ایک ایسی کتاب منظر شہود پر آئی جس کے متعلق دنیا کی آبادی کے آٹھویں حصہ کا یقین اور ایمان ہے کہ یہ کتاب تمام حکمت فلسفہ اور شریعت کا سرچشمہ ہے۔

فلپ اپنی اس کتاب میں نرا مؤرخ ہی نظر نہیں آتا بلکہ اس نے کسی قوم کے عروج وکمال ترقی میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں اس کا بھی بڑی دقیقہ رسی سے جائزہ

لیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا میں ایک نئی قوم تشکیل پا رہی ہے اس کے استحکام میں کن باتوں نے مؤثر ترین رول ادا کیا ہے اس سلسلہ میں اس نے اسلام کے ارکان خمسہ کی اس انداز سے تفصیل دی ہے جیسے مسلمانوں کی ترقی میں ان کا اہم ترین رول رہا ہے ان ارکان کی خارجی تاثیر کی طرف اس نے واضح اشارے کئے ہیں اور بتایا ہے کہ اسلام کی ساری عبادتوں میں ایک ایسی روح کارفرما نظر آتی ہے جو دنیا والوں کی عبادتوں میں اس کا شائبہ بھی نہیں ملتا، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ظاہری فوائد کی نشان دہی کی ہے مثال کے طور پر اس نے حج کے متعلق اپنے جو تاثرات قلم بند کئے ہیں یہاں پیش کئے جاتے ہیں وہ لکھتا ہے:

"فریضۂ حج صدیوں سے اسلام میں متحد کرنے والی ایک زبردست قوت، مختلف عقیدے کے لوگوں کے درمیان ایک موثر ترین رابطہ عام کا کام دیتا چلا آرہا ہے اس نے تقریباً ہر مستطیع مسلمان کو اس کی زندگی میں کم سے کم ایک بار سفر کرنے کا موقعہ بہم پہنچایا ہے، تمام عالم کی مسلم برداری کے اس عظیم الشان اجتماع کی اشتراکیت ساز قوت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اس نے حبشیوں، بربریوں، چینیوں، ایرانیوں، عربوں امیر ہوں کہ غریب اعلیٰ ہوں کہ ادنیٰ کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے اور مذہب کی مشترک سطح پر ایک دوسرے سے برابری کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع عطا کئے، دنیا کے تمام مذہبوں کے مقابلہ میں صرف اسلام ہی کو کم سے کم اپنی جماعت کی حدوں کے اندر رنگ نسل اور قومیت کے امتیازات مٹا دینے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، خط فاصل صرف مسلمانوں اور باقی انسانیت کے درمیان کھینچا جاتا ہے، یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس اجتماع نے اس مقصد کے حصول میں نہایت اہم حصہ لیا ہے، ان اجتماعوں نے ایسے ایسے علاقوں میں بھی دین اسلام کو پھیلانے کے بہترین مواقع فراہم کئے ہیں جو نہ صرف ابھی تک جدید ذرائع حمل و نقل کے ذریعہ متمدن دنیا سے مربوط نہیں ہوئے ہیں

بلکہ وہاں صحافت کی زندہ آواز بھی معدوم ہے“۔

رسول اللہ کے انقلابی تعلیمات کے اہم ترین اجزا کی تفصیلات اور مادی ودنیاوی فوائد کی اہمت وتاثیر پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے بتایا کہ ان انقلابی تبدیلیوں نے ان وحشی بدویوں کو انتہائی جوش وجذبہ سے بھر دیا اور ان کو ماہر سیاستداں، اولوالعزم فاتح اور جنگی حکمت عملیوں میں اپنی مثال آپ بنادیا فلپ بہت فراخدلانہ طور پر اعتراف کرتا ہے:

”ایک طرف عربوں نے ایرانی شہنشاہیت کے پرخچے اڑادیئے دوسری طرف انہوں نے بازنطینی سلطنت کی بنیاد ہلادی اگرکوئی ساتویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سالوں میں یہ پیشینگوئی کرنے کی جرأت کرتا کہ اس بیس سال کے اندر باہر ایک نامعلوم طاقت عرب جیسی غیرمتمدن اور غیرمعروف سرزمین سے اٹھے گی اور اپنے زمانے کی دونہایت طاقتور اور بڑی سلطنتوں پر دھاوے کر کے ایک پر قابض اور متصرف ہوجائے گی اور دوسری سے اس کے بہترین علاقے چھین لے گی تو یقیناً اسے پاگل سمجھا جاتا لیکن اوپر جو کچھ کیا گیا ہے بالکل ایسا ہی واقعہ ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی وفات کے بعد عرب کی بنجر زمین کو جیسے کسی نے جادو کے زور سے مردم خیز خطۂ زمین میں تبدیل کردیا تھا پھر تو اس خاک سے ایسے ایسے عالی ظرف بلند حوصلہ لوگ اٹھے کہ شمار اور صفات کے اعتبار سے اور کہیں ان کی نظر نہیں ملتی، عراق، شام اور مصر میں خالد بن ولید، عمرو بن العاص نے جو معرکے سر کئے ہیں حربیات کی تاریخ میں ان کا شمار ایسی مہموں میں ہوتا ہے جو نہایت دلیرانہ سر کئے گئے ہیں، ان کا مقابلہ بجا طور پر نپولین، ہنی بال اور سکندر کی جنگی مہموں سے کیا جاسکتا ہے“۔

فلپ چونکہ عیسائی مؤرخ ہے اس لئے وہ مسلمانوں کی شاندار فتوحات میں مادی اسباب کی تلاش کرتا ہے، عربوں کے انداز جنگ، ان کے تیز رفتار حملوں، برق رفتاری سے ان کے دھاووں کا تذکرہ کرتا ہے اور مسلمان مؤرخوں کی طرح عربوں کی

کامیابی کا راز خلوص للّٰہیت، دین سے بے پناہ وابستگی اور رضاء الٰہی کی جستجو نہیں بتاتا ہے، کیوں کہ اس کا تعلق عقیدت سے ہے اور ایک مؤرخ ہونے کی حیثیت سے اس کو یہ کرنا بھی نہیں چاہئے تھا یہ کسی تعصب کے زیر اثر نہیں، پھر بھی اس کو ڈھکے چھپے لفظوں میں عربوں کے ایمان ویقین کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے، عربوں کی جنگ میں برتری کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

''جہاں تک عربوں کا تعلق ہے ان کی مثال ایک چست وچالاک اور طاقتور خاندان کی سی تھی جس کے افراد میں ایک نیا جوش اور ولولہ بھرا تھا جس میں عزم وایقان تھا اور انکے نئے دین نے ان کو موت کے ڈر سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا''۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں ان میں ہر موقعہ پر بے مثال بہادری کا مظاہرہ کیا گیا اور ایسے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی جن پر فتح حاصل کرنا بظاہر ممکن نہ تھا قلت وکثرت کے پیمانے پر ایسا سوچنا بھی مشکل تھا مگر مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کو ان سے کئی گنا زیادہ دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی اور بتدریج اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا، حجاز کا ایک بڑا حصہ اسلام قبول کر چکا تھا اگرچہ عرب کا ایک بڑا حصہ ابھی دائرۂ اسلام سے باہر تھا البتہ مدینہ میں اسلام کی مرکزی حکومت مستحکم ہو چکی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ پیش آ گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں نے نہایت تدبر وفراست سے کام لیا چاروں خلفا نے یکے بعد دیگرے نظام حکومت کو سنبھالا البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جو حالات پیش آئے ابوبکر صدیقؓ اور پھر عمر فاروق نے اپنے اخلاص، کمال فراست سے اس طرح ان پر قابو پایا کہ اسلام کی طاقت آناً فاناً اتنی بڑھ گئی کہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں ان کے نام سن کر لرزنے لگیں، قیصر وکسریٰ کے محلوں میں زلزلہ آ گیا اور مسلمانوں کا دائرۂ حکومت اتنا وسیع ہو گیا کہ بیس برس پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا پروفیسر فلپ نے ان تمام واقعات اور انقلابی پیش قدمیوں کو پوری

دیانتداری کے ساتھ شاندار لفظوں میں بیان کیا ہے دمشق، ایران اور مصر کی فتوحات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے فتح اسکندریہ کے موقعہ پر وہاں کے ذخیرۂ کتب کو جلانے کا الزام مسلمانوں پر لگاتے ہوئے یورپین مصنّفین نہیں تھکتے ہیں فلپ نے حقیقت واقعہ کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کر دیا وہ اپنی کتاب میں بہت واضح لفظوں میں لکھتا ہے:

''قصہ مشہور ہے کہ عمرو بن العاص چودہ مہینے کی طویل مدت تک اسکندریہ کے کتب خانے کی کتابوں کو شہر کے مختلف حماموں میں ایندھن کے طور پر جلواتے رہے، یہ قصہ بالکل من گھڑت ہے اور بے بنیاد ہے، اس سے دلچسپ افسانہ طرازی تو ہوتی ہے لیکن تاریخی نقطہ نظر سے یہ خرافات کے سوا اور کچھ نہیں بطلموسی کتب خانے کو جولیس سیزر نے ۴۸ء (ق،م) ہی میں نذر آتش کر دیا تھا اس کے بعد ایک اور کتب خانہ کو جس کا نام چھوٹا کتب خانہ تھا ایک دوسرے بادشاہ تھیوڈوس کے فرمان کی بنا پر ۳۸۹ء میں برباد کرایا گیا، جس زمانہ میں مسلمانوں نے اسکندریہ کو فتح کیا اس وقت وہاں کوئی مشہور کتب خانہ موجود نہ تھا اور نہ اس وقت کے کسی مؤرخ ہی نے یہ الزام عمرو بن العاص پر لگایا''۔

فلپ نے بنوامیہ کے دور خلافت میں عربوں کو دور دراز علاقوں تک اپنے حدود حکومت بڑھانے میں جو شاندار اور حیرتناک کامیابیاں ملیں ان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ۱۳۲ھ تک اسلامی مملکت کے حدود جہاں تک بڑھ گئے تھے ان کی نشاندہی کی ہے اور اسی سال بنوامیہ کا دور خلافت ختم ہوا اور بنوعباس اس پر قابض ہوگئے اور دارالخلافت اب دمشق سے بغداد منتقل ہوگیا دمشق اجڑ گیا اور بغداد آباد ہوگیا یہاں آکر عربوں نے جو شاندار تہذیب وتمدن اور ثقافت کی بنیاد ڈالی اس کو فلپ نے بڑے ادبیانہ اور انشاء پردازانہ اسلوب میں بیان کیا ہے، پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک کی تاریخ لکھنے کے بعد اس نے آخر میں لکھا:

۷۳۲ء کے اختتام کے ساتھ ساتھ حضرت محمد کی وفات کے بعد پہلی صدی ختم ہوئی ہے اس وقت آپ کے پیرو مسلمان ایک ایسی سلطنت فتح کر چکے تھے جس کا

دامن ایک طرف خلیج بسکے اور دریائے سندھ اور حدود چین تک اور دوسری طرف بحیرۂ خوارزم سے بالائی ٹیل تک پھیلا ہوا تھا، شہر دمشق اس عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام بن گیا تھا، ناف شہر میں اموی خلفاء کا جگمگاتا ہوا پر شکوہ قصر شاہی کھڑا ہوا تھا، یہ قصر ان سرسبز شاداب میدانوں کے نظاروں پر چھایا ہوا تھا جو جنوب میں دائمی برف پوش جبل الشیخ تک پھیلے ہوئے چلے گئے تھے، یہ محل خاندان بنو امیہ کے بانی خلیفہ معاویہؓ نے تعمیر کرایا تھا اس کے قریب ہی جامع اموی واقع تھی جس کو ولید نے جدید طریقے سے آراستہ کر کے اس طرز تعمیر کا ایسا نگار خانہ بنا دیا کہ آج حسن کے شیدائی اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، ایسے ہی دربار میں خلیفہ ولید نے فاتحان اسپین موسیٰ اور طارق کا خیر مقدم کیا گیا ہوگا جو اپنے بیشمار قیدیوں اور بیش بہا جواہرات کے ساتھ اس کے حضور میں پیش ہوئے ہوں گے، اس وقت اسلام کا عروج اپنی انتہاء کو اور اسلام کا پہلا شاہی خاندان اپنے جاہ وجلال کے سب سے اونچے درجے پر پہنچ چکا تھا‘‘۔

فلپ نے لکھا کہ جب فتوحات کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہوا اور دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ شہروں میں عربوں کا گذر ہوا اور وہاں کی تہذیب وثقافت اور تمدنی ترقیات کو دیکھا تو بے حد متاثر ہوئے اور صرف حیرت زدہ ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ انہیں جنگ جو قبائل نے اثر پذیری کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ قوم ہمیشہ سے علوم وفنون کی رسیا رہی، مختلف علوم وفنون ایجاد کئے، قدیم علوم وفنون میں اضافہ اور جدید تحقیقات کو داخل کر کے ان کے معیار کو بلند کیا، نحو وصرف، فقہ، حدیث، تفسیر، آرٹ، موسیقی اور فن تعمیر میں کمال پیدا کیا، فن تعمیر کو ایسے بلند مقام پر لے گئے کہ آج بھی اسلامی ملکوں میں جو ان کی نشانیاں باقی رہ گئی ہیں ان کو دیکھ کر آج کی ترقی یافتہ دنیا حیرت زدہ ہو جاتی ہے اونٹوں اور بھیڑیوں کے چرانے والے کمبل کے خیموں میں زندگی بسر کرنے والے یہی عرب عیش وتنعم، راحت وآسائش کی طرح طرح کی چیزیں ایجاد کر رہے ہیں، آرام دہ محلات تعمیر کر رہے ہیں، شہروں میں آب رسانی کے ایسے مستحکم نظام قائم کئے جو صدیوں تک اپنی مثال آپ رہے، دنیا کے دوسرے متمدن

ممالک ان کی ترقیوں کو دیکھ کر مرعوب ہوتے رہے، قوانین عدالت، انصاف میں سہولت اور نظام حکمرانی میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ مفتوحہ شہر کے عوام کو اپنے سابقہ حکمرانوں اور بادشاہوں سے از خود نفرت ہوگئی، مسلمان فاتحوں نے اپنے حسن اخلاق سے ان کے دلوں کو جیت لیا لوگ ان کو عزت ومحبت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور بہت تیزی سے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے، ایران جب فتح ہوا تو وہاں کون مسلمان تھا؟ عراق پر جب عربوں کی تلواریں چمکیں تو اپنے قدیم عقائد کی تیرگیوں میں گم تھے لیکن مسلمانوں کے طرز زندگی اور ان کے عدل وانصاف، دیانت وصداقت کو دیکھ کر ان کے ملکوں سے کفر وشرک کی تاریکیاں اس طرح مٹ گئیں جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا ان ملکوں میں آفتاب اسلام کی روشنی اس طرح عام ہوئی ان ملکوں کا کوئی گوشہ اس روشنی سے محروم نہیں رہا، فلپ نے بنوامیہ کے شاندار کارناموں کے بیان کے بعد اس کے دردناک انجام کو بتاتے ہوئے خلافت عباسیہ کی تہذیبی وتمدنی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے'':

> ''عباسی خلفاء شمالی افریقہ یا اندلس کو اپنے زیر اقتدار کبھی نہ لا سکے لیکن وہ دنیائے اسلام کے مشرقی حصہ پر مسلسل پانچ سو سال تک فرماں روائی کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۲۵۸ھ اس خاندان کے ۳۷ ویں خلیفہ کو مغلوں کے ہاتھوں نے برباد کر دیا۔

فلپ لکھتا ہے کہ خلفاء عباسیہ کے دور حکومت ہی میں دنیا نے اسلامی تمدن کے عہد زریں کا نظارہ کیا تھا، اس نے دار الحکومت بغداد کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے اس کی حسین وجمیل تعمیرات اور خوبصورت عمارتوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ چار سال تک دس لاکھ مزدور ومعمار کام کرتے رہے اور آن کی آن میں تہذیب وتمدن کا ایک حسین گلدستہ تیار ہو گیا پھر اس نے پورے شہر بغداد کا خاکہ لکھا:

> ''اس شہر کے اطراف میں تین فصیلیں اور ایک گہری خندق تھی اندر کی آخری فصیل نوے فٹ اونچی اور شہر کے وسطی حصہ کو گھیرے ہوئے تھی ان فصیلوں

میں چار دروازے تھے، ہر دروازے سے ایک شاہراہ اسلامی سلطنت کے چاروں گوشوں کی طرف جاتی تھی اور ہر شاہراہ دائرہ شہر کے مرکز سے شروع ہوتی تھی، ایوان خلافت جو ''باب الذہب'' یا ''قبۃ الخضراء'' کہلاتا تھا ان تمام دائروں کا مشترک مرکز تھا، ایوان خلافت کے پہلو میں جامع مسجد کھڑی تھی، بارگاہ خلافت کا مینار سطح زمین سے ۱۳۰ فٹ بلند تھا''۔

فلپ بتاتا ہے کہ یہی بغداد ہے جہاں اسلامی تہذیب وتمدن پر ایرانی اثرات پڑنا شروع ہوئے یہیں عربی خلافت ''مشیخیت'' سے زیادہ ایرانی استیدادیت کے احیاء کا مظہر بنی، تخیلات وتصورات کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا پر رفتہ رفتہ ایرانی انقلاب وآداب ایرانی ازدواج، ایرانی شراب، ایرانی دوشیزہ اور ایرانی شاعری کا غلبہ ہوتا چلا گیا محلات شاہی ایرانی بیگمات سے بھر گئے انہیں ایرانی عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والے خاندان رسالت سے وابستگی کے سب سے بڑے دعویدار بنے اور بنتے چلے گئے، جب کہ ان کی رگوں میں عربیت سے کہیں زیادہ ایرانی خون دوڑ رہا تھا اسی دور میں سائنس کی ترقی اور عالمانہ علمی تحقیقات کے لحاظ سے بڑا کام ہوا، اسلام کو مملکت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل تھی اور سرکاری دفتروں کی زبان اب بھی عربی ہی تھی، فلپ نے مزید لکھا کہ:

''نویں صدی عیسوی دو ایسی شاہانہ ہستیوں کے ساتھ نمودار ہوئی جو عالمی معاملات میں بلندترین مقام پر متمکن تھیں، مغرب میں شارلیمن اور مشرق میں ہارون رشید ان دونوں میں بے شبہہ ہارون رشید زیادہ طاقتور اور برتر ثقافت کا نمائندہ تھا...... اگرچہ بغداد کو تعمیر ہوئے پچاس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ عدم سے نکلتے ہی اس تھوڑی سی مدت میں وہ بے شمار دولت کا عالمی مرکز اور بین الاقوامی اہمیت کا حامل اور بازنطینیہ کا اکیلا حریف بن بیٹھا، اس کا شکوہ اس سلطنت کی اقبال مندی کے شانہ بہ شانہ چل رہا تھا جس کا یہ دارالسلطنت تھا اور یہ شہر اس درجہ کمال کو پہنچ گیا کہ پوری دنیا میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا''۔

فلپ نے بتایا کہ مسلمانوں نے جس شان وشوکت کی حکومت کی اس وقت تک دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، دولت کی فراوانی، تہذیب وثقافت کا اعلیٰ سے اعلیٰ معیار، شان وشوکت اور تمدنی زندگی کا شاہکار مرقع عربوں کا دربار تھا، اس نے بغداد میں دارالخلافت کے جاہ وجلال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''اس مدوّر شہر کا ایک تہائی حصہ ایوان خلافت، اس کے حرم، خواجہ سراؤں کے ایوانوں اور عمائدین خاص کی حویلیوں پر مشتمل تھا خاص طور پر بارگاہ خلافت بڑا پرشکوہ تھا اس بارگاہ میں جو مسندیں اور قالین، سراپردا تھے مشرق نے اپنی پوری صناعی اور مہارت اس کے بنانے میں صرف کردی تھی خلیفہ کی شریک زندگی جن کا نام زبیدہ تھا یہ رشتہ میں اس کی چچازاد بہن بھی ہوتی تھی بلکہ بعد کی نسلوں نے اس ملکہ کو عظمت واقبال مندی میں اس کے نامور شوہر ہارون رشید کے ساتھ شریک کردیا ہے، کہتے ہیں کہ یہ ملکہ دسترخوان پر جواہرات جڑے ہوئے چاندی سونے کے برتنوں کے سوا کوئی دوسرا برتن استعمال نہ کرتی تھی، یہ پہلی ملکہ ہے جس نے اپنی جوتیوں پر جواہرات لگائے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک حج پر اس نے بتیس لاکھ دینار صرف کیئے تھے، ان میں اس پچیس میل لمبی نہر کے اخراجات بھی شامل تھے جو مکہ میں پانی لانے کی غرض سے اس کے حکم سے کھودی گئی تھی''۔

آج یورپ کی شاندار عمارتوں بلند بالا کارخانوں، عیش وعشرت کے ایوانوں، عالی شان شراب خانوں اور بلند بالا ہوٹلوں کو یورپ کی برتری وعظمت اور بے مثال تمدنی ترقی کے ثبوت میں پیش کیا جارہا ہے جب کہ عربوں نے اپنے دور حکومت میں جب دنیا تہذیب وثقافت اور تمدنی ترقیوں کے نام سے بھی آشنا نہیں تھی کیوں کہ عرب موجد تھے نقالی نہیں، ایجاد اور نقل میں بہت بڑا فرق ہے، ہر حکومت جب عروج پر ہوتی ہے اپنی طاقت وقوت اپنی دولت وشرافت کے مظاہرہ پر مجبور ہوتی ہے، تاکہ وہ اپنے حریفوں کو مرعوب کرسکے، پھر عربوں نے جس تہذیب وثقافت اور تمدن کا بے

مثال مظاہرہ کیا، وہ نہ تو کسی کی تقلید میں تھا اور نہ مصنوعی نمود ونمائش تھی بلکہ ایک عظیم اور طاقتور حکومت کی اندرونی طاقت وقوت کا عکس تھا، اور لطف یہ کہ دنیا میں اس کی نظیر بھی موجود نہیں تھی یہ خود ان کے دماغ کی اختراع تھی، آج دنیا اس کو عیاشی اور فضول خرچی سے تعبیر کرے گی لیکن آج بھی دنیا میں اس طرح کی فضول خرچیاں اپنی عظمت اور اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں، عربوں نے اپنے عروج میں حکومت کے جاہ وجلال کو ثریا تک اس وقت پہنچایا جب یورپ ابھی پیال میں گھس کر گول لکڑی کا تکیہ لگا کر سویا کرتا تھا اس کی او بڑ کھابڑ گلیوں میں مٹی کا دیا بھی نہیں جلتا تھا، یورپ کا سارا جاہ وجلال دوڈھائی سو سالوں کا رہین منت ہے، زندگی کا سلیقہ یورپ نے انہیں عربوں سے سیکھا، فلپ نے ان تمام حقائق کو بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کے دور عروج کا ایک جزئی واقعہ لکھا ہے اور ایک دلکش منظر ہمارے سامنے پیش کیا ہے:

> ''خلیفہ کی مسند نشینی، شادی، حج اور ممالک غیر کے سفیروں کی باریابی پر خاص طور پر دربار کی دولت شان وشوکت اور جاہ وجلال کا پورا مظاہرہ ہوا کرتا تھا، خلیفہ مامون نے اپنے وزیر کی اٹھارہ سالہ لڑکی بوران سے شادی کی تھی اور اس شادی کا جشن ۸۲۵ء میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا تھا، اس جشن کی تفصیل عربی ادب میں اس زمانہ کی ایک ناقابل فراموش یادگار بن گئی ہے، کہتے ہیں کہ اس شادی کے موقعہ پر دولہا ودلہن کو ایک فرش پر جو موتیوں اور یاقوت سے مزین تھا بیٹھایا گیا اور ایک طلائی کشتی میں ایک ہزار بے مثال بڑے بڑے موتی رکھ کر ان پر نچھاور کئے گئے، دوسو بتیوں کے ایک عنبریں فانوس نے اپنی ضیاپاشیوں سے شب تار کو روز روشن میں بدل دیا تھا، شہزادوں اور عمائدین سلطنت پر مشک خام کی گولیاں نچھاور کی گئی تھیں اور ہر گولی میں ایک شاہی پروانہ تھا جس میں کوئی جاگیر، غلام، یا اسی طرح کے کسی انعام کا وثیقہ تھا''۔

فلپ نے اس طرح کے مناظر کی کثرت سے عکاسی کی ہے لیکن اس کے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ بغداد یا مسلمانوں کی حکومت میں عیاشی اور فضول خرچی کا دور دورہ تھا

بلکہ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دولت کی فراوانی، ملک کی خوشحالی، عوام کی فارغ البالی کا یہ لازمی اور فطری نتیجہ ہوتا ہے اور دنیا کی پوری تاریخ اس فطری تقاضے اور انسانی جذبات کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت کو محفوظ و مستحکم بنا چکے ہیں، کسی حریف کی طاقت کا اس کو خوف باقی نہیں رہا، اس کو اپنے قوت بازو اور اپنی تلوار کی کاٹ پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ کسی دشمن کو خاطر میں نہیں لاتے، خلافت عباسیہ کے حکمراں بھی اس فطری جذبے سے مستثنیٰ نہیں تھے، آج یورپ کو اپنی ترقی پر ناز ہے وہ دولت کی بہتات کے سوا اور کیا ہے، پھر بھی عربوں کی حکومت اور یورپ کے موجودہ نظام حکمرانی میں ایک اور بہت بڑا فرق ہے آج یورپ اس دولت کا استعمال مہلک اسلحہ کے بنانے پر صرف کرتا ہے اور انسانیت کو آن کی آن میں کس طرح قتل کر دیا جائے کس طرح پورے پورے شہر کے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے یورپ کی ساری کوشش اسی پہلو پر سوچنے میں مصروف ہے اور ساری دولت کا استعمال شیطانی طاقت کو اور طاقتور بنانے میں صرف کرتا ہے، خلافت عباسیہ اس طرح کی شیطانی طاقتوں کے لئے راستہ نہیں کھولتی تھی، وہ دولت کو انسانوں کے لئے حیات بخش اور زندگی دینے میں صرف کر رہی تھی وہ اپنے ملک اور سلطنت میں دولت کی فراوانی مال وزر کی کثرت زیادہ سے زیادہ خوشحالی کی تدبیروں میں صرف کرتی تھی فلپ نے اپنی اس کتاب میں اس پہلو پر بھی بہت تفصیل سے کہا ہے وہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی بین الاقوامی تجارت عروج پر تھی، ساری دنیا سے تجارتی روابط خلافت عباسیہ نے قائم کر رکھے تھے، وہ لکھتا ہے:

> ''بازاروں میں چین سے چینی مٹی کا سامان، ریشم اور مشک، ہندوستان اور جزائر شرق الہند سے گرم مسالہ، معدنی اشیاء اور رنگ، ترکوں کے ملک وسط ایشاء سے لعل، یاقوت، نیلم، کپڑے اور غلام، اسکنڈی نیویا اور روس سے شہد، موم، قاقم، سنجاب اور سفید فام غلام اور مشرقی افریقہ سے ہاتھی دانت، سونے کی خاک اور حبشی غلام آیا کرتے تھے، چینی مٹی کے ظروف کی خرید وفروخت کا ایک

خاص بازار بالکل الگ ہی تھا مملکت کے صوبوں سے مقامی پیداوار میں مثلاً مصر سے چاول، غلہ اور کتان، شام سے شیشہ، دھات کا سامان اور میوہ، عرب سے کمخواب، موتی اور ہتھیار، ایران سے عطریات اور ترکاریوں سے لدے ہوئے کارواں اور جہازی قافلے دارالخلافۃ بغداد پہنچتے تھے۔

بغداد اور دوسرے برآمد کے مرکزوں سے عرب تاجر شرق بعید، یورپ اور افریقہ کے کپڑے جواہرات، فلزئی آئینے، شیشے کا سامان اور گرم مسالہ جہازوں کے ذریعہ بھیجا کرتے تھے، حال ہی میں عربی سکوں کے دفینے شمالی روس، فن لینڈ اور سوئیڈن اور جرمنی جیسے دور دراز علاقوں میں برآمد ہوئے ہیں، یہ دفینے اس بات کے شاہد ہیں کہ اس زمانہ میں اور اس کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی تجارت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، سندباد جہازی کی داستان جو الف لیلہ کی بہترین داستانوں میں شمار کی جاتی ہے محض من گھڑت افسانہ نہیں بلکہ اس کے متعلق یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اصل میں یہ قصہ مسلمان تاجروں کے بحری سفروں کی رودادوں پر مبنی ہے۔

خلافت عباسیہ کے دورعروج کی تہذیب وشائستگی، قابل رشک معاشرہ، بین الاقوامی تجارت کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کی سرپرستی، تصنیف وتالیف دوسری زبانوں کی علمی وسائنسی کتابوں کے تراجم ایجادات واختراعات غرض متمدن حکومت کا کون سا پہلو ہے جس کو مسلمانوں کی حکومت نے نظر انداز کیا ہو، فلپ نے زندگی کے ہر پہلو پر پوری امانتداری سے روشنی ڈالی ہے وہ آگے بتاتا ہے کہ:

''بغداد کے اس پرتکلف اور اعلیٰ معیار زندگی نے تاریخوں اور افسانوں میں اس زمانے کو ہر دلعزیز بنا رہا ہے خاص کر وقائع عالم میں یہ حقیقت نہایت تابناک ہے کہ اسی دور نے تاریخ اسلام کی یادگارترین اور عقل وخرد اور تہذیب وتمدن کی پوری تاریخ کے ایک نمایاں ترین مذہبی بیداری کے مظاہرے کا مشاہدہ کیا اس کی نمایاں خصوصیت ہے کہ اس کے زیر اثر پہلوی، سنسکرت اور

سریانی زبانوں سے عربی زبان میں ترجمے ہوئے مسلمان عربوں کے پاس سائنس، فلسفہ اور ادب کا جو کچھ ذاتی سرمایہ تھا وہ بہت ہی حقیر تھا لیکن ریگزار عرب سے وہ اپنے ساتھ علمی تحقیق و تجسس ایک صحیح شعور و احساس اور ذہن و دماغ کی بہت سی مخفی قوتیں اور صلاحیتیں لے کر آئے تھے، یہ لوگ بہت جلد ان تمام قدیم اور نسبتاً اعلیٰ تہذیب کی حامل قوموں کے ثقافتی خزانوں کے مالک اور وارث بن بیٹھے جن کو انہوں نے یا تو بالکل مغلوب کر لیا تھا یا جن سے نبرد آزما ہوئے تھے، ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ اس سرچشمہ کے بہاؤ کو اندلس اور صقلیہ کے عربوں نے کس طرح یورپ کی طرف پھیر دیا اور اس نے یورپ کی نشأۃ ثانیہ کو کس طرح پروان چڑھایا۔

فلپ نے درجنوں علوم و فنون کو شمار کرایا ہے کہ مسلمانوں نے پرانے ملبوں پر نئی تعمیر کر کے ان کو فلک بوس بنا دیا، نام بنام ان علوم و فنون کو پیش کر کے ہر ایک میں جو قابل ذکر اضافہ کیا ان کی نشاندہی کر دی ہے خلافت عباسیہ نے پانچ سو سال میں جو تہذیبی، تمدنی، ثقافتی علمی و تحقیقی خدمات کی ہیں اور بہت سے علوم و فنون کو پیش کر کے ہر ایک میں جو قابل ذکر اضافہ کیا ان کی نشان دہی کر دی ہے خلافت عباسیہ نے پانچ سو سال میں جو تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، علمی و تحقیقی خدمات کی ہیں اور بہت سے علوم و فنون کو اپنی جدید تحقیقات و تخلیقات سے مالا مال کیا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ ترقی اس دور میں ہوئی جب پوری دنیا علم و تحقیق کے اعتبار سے بچپن کے دور سے گذر رہی تھی مسلمانوں کے سامنے کسی قوم کی ترقیوں کی کوئی نظیر و مثال موجود نہیں تھی، لندن، فرانس، جرمنی اور دوسرے یورپین ممالک ظلمت کے دور سے گذر رہے تھے، امریکہ کا تو ذکر ہی فضول ہے کہ ابھی دنیا اس کے وجود ہی سے بے خبر تھی اور وہاں کے باشندے گمنامی کی دبیز چادروں میں لپٹے ہوئے مہذب دنیا کی نگاہوں سے مستور تھے، وہ دنیا کا ایک گمنام جزیرہ تھا۔

فلپ نے خلافت عباسیہ کے کارناموں سے روشناس کرانے کے بعد اندلس کی

تاریخ بیان کی ہے جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک انتہائی شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی اور یورپ میں واقع ہونے کی وجہ سے پورے یورپ کو اس نے متاثر کیا بہت سے علوم وفنون مسلمانوں کی اسی حکومت کے ذریعہ یورپ میں پہنچے، پروفیسر فلپ نے صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی اس مغربی حکومت نے یورپ میں بیداری کی لہر پیدا کی اور اس کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں آنے کے لئے مہمیز کیا یورپ پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے اس نے لکھا:

''جس زمانہ میں اسلامی مملکت کی مشرقی شاخ اپنے عہد زریں میں داخل ہورہی تھیں ادھر اسی زمانہ میں اس مملکت کی مغربی شاخ اسپین میں ایسے ہی پرشکوہ عہد سے گذر رہی تھی، یہ زمانہ ہمارے لئے اور بھی اہم ہے کہ عربی ثقافت بڑی حد تک اسلامی اسپین ہی سے مغرب میں داخل ہوئی اور قرون وسطی ابتدائی نصرانی ثقافت میں نفوذ کر کے وہ تمدن پیدا کیا جو ورثے میں ہم کو پہنچا ہے، مغرب کا یہ اسلامی تمدن نویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان اپنے بام عروج پر پہنچ گیا تھا''۔

تاریخی تسلسل کے لئے ذہن میں اسلام کی یہ تاریخ تازہ کر لیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ بڑا اہم اور نازک تھا لیکن صحابہ کرام کے اخلاص نے اس کو خوش اسلوبی سے حل کر دیا لیکن خاندانی اور موروثی بنانے کا دلوں میں جو مخفی ارادہ تھا وہ پنپتا رہا اتفاق سے خلافت راشدہ کے بعد زمام حکومت بنوامیہ کے ہاتھوں میں چلی گئی اور ۱۳۲ھ تک وہ اس پر قابض رہے اس لئے جن لوگوں کو خاندان رسالت سے قریبی تعلق تھا انہوں نے بنوامیہ کی حکومت کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور اندر اندر سازشیں چلتی رہیں یہاں تک کہ بنوعباس بنوامیہ کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئے اور خود حکمراں بن گئے، بنوعباس نے حکومت چھین لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے حق میں جلاد صفت بن گئے اور وحشت ودرندگی کی انتہاء کر دی، کوشش کی کہ

بنوامیہ کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچ پائے جو مستقبل میں حکومت کا دعویدار ہوسکے، بنوعباس نے تلاش کر کے بنوامیہ کے نابالغ بچوں تک کو قتل کر ڈالا، دو بھائی بچ گئے ان میں سے ایک بھائی نے آگے چل کر اسپین (اندلس) میں ایک شاندار حکومت کی بنیاد ڈالی، فلپ کی زبانی اس داستان کو سنئے:

''بنی عباس کے دست انتقام سے جو چند اموی اشراف بچ گئے تھے ان میں عبدالرحمٰن نامی ایک بیس سالہ وجیہ، دبلا پتلا، بلند بالا، عقاب جیسا، سرخ بالوں والا نوجوان بھی تھا قدرت نے اس نوجوان کو غیر معمولی مردانگی اور ذہانت عطا کی تھی، یہی عبدالرحمٰن اسپین پہنچا لڑ بھڑ کر اسپین کا مالک بنا اور یہاں اسی بنوامیہ کے اقتدار کو بحال رکھا جو مشرق میں نیست و نابود کر دیا گیا تھا، اپنے وطن سے عبدالرحمٰن کا فرار بڑا ڈرامائی رہا، ایک دن وہ دجلہ کے بائیں ساحل پر ایک بدوی پڑاؤ پر ٹھہرا ہوا تھا یکا یک چند سوار عباسیوں کا سیاہ پھریرا اڑاتے ہوئے نمودار ہوئے، انہیں دیکھتے ہی عبدالرحمٰن اپنے تیرہ سالہ چھوٹے بھائی کو لے کر دریا میں کود پڑا چھوٹے بھائی کو تیرنا اچھی طرح نہ آتا تھا اس پر ہیبت طاری ہوگئی وہ ساحل کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جہاں دشمن کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا تھا اگر تم واپس آجاؤ تو تمہیں امان ہے، نادان لڑکا دشمن کے جھانسے میں آگیا اور ساحل کی طرف پلٹا اور کم بخت دشمن نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا لیکن بڑے بھائی نے دشمن کی اپیل آفرینوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور تیرتا تیرتا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔

پیدل، بے یارومددگار، مفلس ونادار اس حالت میں عبدالرحمٰن نے جنوب مغرب کی راہ لی، بہت سی مصیبتیں جھیلتا فلسطین پہنچا یہاں اسے ایک دوست مل گیا، فلسطین سے اس نے مغرب کا رخ کیا شمالی افریقہ میں وہ اس ولایت کے عامل کے ہاتھوں قتل ہونے سے بال بال بچا، پھر قبیلہ قبیلہ پھرتا وہ پانچ سال کے بعد سبتہ پہنچ گیا وہ جہاں جہاں گیا نئے حکمراں خاندان کے جاسوس

برابر اس کا پیچھا کرتے رہے، عبدالرحمٰن دمشق کے دسویں اموی خلیفہ کا پوتا تھا، اس کی ماں شمالی افریقہ کے کسی ضلع کے ایک بربر قبیلہ کی عورت تھی، وہ اپنے نانیہال پہنچا تو اس کے ماموؤں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔

عبدالرحمٰن آگے آگے تھا اور موت اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی لیکن زندگی جیت گئی اور موت ہار گئی، سوال یہ تھا کہ جان تو بچ گئی وہ بھی اس حال میں کہ وہ مفلس وقلاش تھا، نہ اس کا کوئی دوست اور ہمدرد تھا، نہ کوئی اس کا ہمنوا وہم خیال اور مددگار تھا لیکن عزم جوانی اور بلند ہمتی انسان کے ناممکن کام کو ممکن بنادیتی ہے، حکومت قائم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں، یہ نوعمر نوجوان فولادی عزم وارادہ کا مالک تھا اس کے لئے موجودہ حالت پر قناعت کرلینا ممکن نہ تھا اپنے نانیہال میں پہنچ کر اس نے حالات کا جائزہ لیا، اس وقت بنوامیہ کی جو فوج دمشق سے بھاگ گئی تھی وہ اسپین کے جنوبی حصہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے پڑی تھی اور کوئی اقدام نہیں کرسکی تھی اگرچہ خلافت عباسیہ کا ایک عامل اسپین میں مقیم تھا، عبدالرحمٰن نے دمشق کی فوج میں اپنا اثر ورسوخ بڑھایا، ان میں نیا جوش وجذبہ پیدا کیا پھر اپنے نانیہال قبیلہ سے بربروں کی زبردست فوج فراہم کرلی اور پھر اس نے اندلس پر دھاوا بول دیا، اسپین کے حکمراں شارلمین نے جو عباسیوں کا حلیف اور دوست تھا عبدالرحمٰن کی فوج پر حملہ کے لئے ایک فوج بھیجی لیکن عبدالرحمٰن کی فوج کے علاوہ خود شہریوں نے اپنے حکمراں کی فوج کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیا مجبوراً اس کو واپس ہونا پڑا جب لوٹتی ہوئی فوج ایک تنگ گھاٹی سے گذر رہی تھی عبدالرحمٰن کی فوج نے اتنا زبردست حملہ کیا کہ فوج اپنے تمام سرداروں کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر گئی اس کے بعد عبدالرحمٰن کی فوج نے جنوبی اسپین کے تمام شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرکے اپنی حکومت قائم کرلی خلافت عباسیہ کا عامل جو یہاں مقیم تھا اس کو قتل کرکے اس کا سر عباسیوں کے سیاہ پرچم میں لپیٹ کر بغداد بھیج دیا تاکہ آئندہ عباسی حکومت کا کوئی فرد اسپین میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرسکے، پھر عبدالرحمٰن نے کئی سال کی جدوجہد کے بعد پورے اسپین پر قبضہ کرلیا اور کئی سو سالوں کے لئے بنوامیہ کی

تحویل میں دے دیا اور اتنی شاندار حکومت کی کہ آج بھی اسپین (اندلس) کے دورِ عروج کی کہانیاں دلچسپ افسانوں کی طرح دلچسپی سے بیان کی جاتی ہیں اور سنی جاتی ہیں۔

اسلام نے اپنے ظہور کے بعد دنیا کی جدید تاریخ بنائی، تہذیب وثقافت کی نئ دنیا بسائی، عدل وانصاف، سچائی وراست بازی، انسانیت کی فوز وفلاح کے لئے وہ مثالی کارنامے انجام دیئے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو یہ سبق ملا کہ انسانیت کے ساتھ شرافت وافضلیت کا جو بلند معیار مسلمانوں نے پیش کیا ہے وہی عام انسانوں کے لئے نجات دہندہ ہے اسلامی تہذیب وثقافت کی روشنی ابھی ایشیاء تک محدود تھی عبدالرحمٰن نے اس کو یورپ تک پہنچا دیا اور اندلس میں اپنی حکومت قائم کرکے پورے یورپ کو متاثر کیا اور ان کو تہذیب وشائستگی کا سبق پڑھایا۔

مسلمانوں کے ذوق وتعمیر نے اپنے پہلے دارالحکومت دمشق میں اپنا پہلا مظاہرہ کیا تھا، بغداد میں اپنے عروج پر پہنچ گیا اندلس (اسپین) میں جا کر اسلامی تہذیب وتمدن، آرٹ، فن تعمیر اور تعمیرات میں جدت طرازی اور شان وشکوہ کا اضافہ کرکے اس فن کو بام ثریا تک پہنچا دیا، مسلمانوں کے دارالحکومت قرطبہ کی جانب ساری دنیا کیا یورپ، کیا ایشاء حیرت واستعجاب کی نگاہوں سے اس طرح دیکھتی تھی جیسے نصف النہار پر آئے ہوئے سورج کو دیکھتے سب ہیں مگر اس کی ہمسری کا دعویٰ کرنے کی جرأت وہمت کسی میں نہیں ہوتی، پروفیسر فلپ نے پوری صداقت کے ساتھ قاری کو قرطبہ کے حسن وجمال، دلکشی وجاذبیت سے آشنا کیا ہے وہ لکھتا:

> ”پورے یورپ میں خلیفہ عبدالرحمٰن کا دربار ہی سب سے زیادہ شاندار دربار تھا، اس دربار میں جرمنی، اطالیہ اور فرانس کے حکمرانوں کے سوا بازنطینی شہنشاہ نے اپنے سفیر بھیجے تھے، اس کا پایۂ تخت قرطبہ تھا، قرطبہ کی آبادی پانچ لاکھ تھی، یہاں سات سو مسجدیں اور تین سو پبلک حمام تھے، شان وشوکت کے لحاظ سے بغداد اور قسطنطنیہ ہی قرطبہ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں، شاہی قصر شہر کی شمالی مشرقی دریائے وادی الکبیر کے کنارے جبل البشارات کی ایک چوٹی پر واقع

تھا، اس میں چار سو حجرے اور کمرے تھے، یہاں ہزاروں لونڈی غلام اور محافظ تھے، کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ثالث کی ایک کنیز بہت ہی دولت چھوڑ کر مری تھی، اس کی وصیت تھی کہ اس دولت کو مسلمانوں کے فدیہ میں صرف کیا جائے جو نصرانیوں کے قبضہ میں ہیں، جب اس بات کا پوری طرح اطمینان کرلیا گیا کہ نصرانیوں کی قید میں کوئی مسلمان قیدی نہیں ہے تو خلیفہ نے ۹۳۹ء میں اپنی ایک اور کنیز زہرہ کی تجویز پر یہ عالیشان قصر تعمیر کرایا اور اس کو ''الزہراء'' ہی کے نام سے موسوم کیا، اس قصر کا سنگ رخام نومیدیا اور قرطاجنہ سے منگایا گیا تھا، اس کے ستون اور حوض، اس کے طلائی مجسمے قسطنطنیہ سے لائے گئے تھے، دس ہزار معمار اور مزدور اور ڈیڑھ ہزار بار برداری کے جانور مسلسل بیس سال تک اس قصر کی تعمیر پر کام کرتے رہے، عبدالرحمٰن ثالث کے بعد کے خلفاء بھی قصر الزہراء کی توسیع اور تزئین وآرائش میں حصہ لیتے رہے، بعد میں اس کے اطراف میں اتنے مکانات بنے کہ یہ قصر ایک نواحی شہر کا مرکز بن گیا اس شہر کے آثار ۱۹۱۰ء میں زمین سے کھود کر نکالے گئے اور اسے اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اندلس کے شاندار **قلعة الحمراء قصر الزهراء** اور دوسرے محلات، حویلیاں اور اس کے باغات عجیب وغریب صنعتوں کے مظہر تھے، ایسے ایسے محل بنائے گئے کہ اس وقت تک دنیا نے نہ دیکھا نہ سنا تھا، تمام مؤرخین حیرت واستعجاب کے قلم سے ان تمام صداقتوں کو لکھتے رہے، خود فلپ بھی اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

''بنوامیہ کا دارالخلافہ قرطبہ یورپ کا سب سے زیادہ متمدن اور مہذب شہر بن گیا تھا، قسطنطنیہ اور بغداد کے بعد تہذیب وتمدن کا یہی تیسرا مرکز تھا، اس شہر کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی، اس شہر میں ایک لاکھ تیرہ ہزار مکانات، اکیس نواحی محلے، ستر کتب خانے، کتابوں کی بہت سی دکانیں، اور کئی سو مسجدیں تھیں اس شہر کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی تھی، اس کا نام سن کر سیاحوں کے دلوں میں شان وشوکت اور دلکشی وزیبائی کا ایک عجیب نقشہ بھر جاتا تھا، یہاں پکی

سڑکیں اور پختہ شاہراہیں تھیں، ان شاہراہوں پر جو مکان بنے ہوئے تھے ان پر روشنی کر کے راتوں میں ان شاہراہوں کو میلوں تک منور رکھا جاتا تھا، حالانکہ اس زمانے سے سات سو سال بعد بھی شہر لندن کی کسی شاہراہ کو کوئی پبلک لیمپ نصیب نہیں ہوا تھا اور شہر پیرس کی سڑکوں کی بھی صدیوں تک یہ حالت رہی کہ بارش کے موسم میں جو کوئی اپنے گھر کی دہلیز سے نیچے اترتا تو اس کے پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتے تھے"۔

اس دور میں مسلمان تہذیب وتمدن کے اس بلند معیار پر تھے کہ یورپ کے باشندوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، فلپ نے اس کو بھی نہیں چھپایا ہے بلکہ غیر مبہم لفظوں میں بیان کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تہذیب وتمدن کے معیار برتری کو پرکھنے کے لئے کسوٹی مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی وہ دوسری اقوام وممالک کے باشندوں کی شکل وصورت، طرز رہائش، معاشرتی زندگی کی پسماندگی کو دیکھ کر اس پر تبصرے کرتے تھے اور یہ حق اس دور میں بلاشبہہ ان کو حاصل تھا یہ تو مشاہدہ کی بات ہے کہ جتنی بلندی سے نیچے دیکھا جائے گا ہر چیز چھوٹی نظر آتی ہے جیسے ہوائی جہاز سے سطح زمین پر بنی عالیشان عمارتیں ماچس کی ڈبیہ معلوم ہوتی ہیں، فلپ نے ایک مسلمان فلسفی کی یہ بات نقل کی ہے:

شمالی یورپ کو عرب جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ طلیطلہ کے ایک عالم قاضی صاعد بن احمد المتوفی ۱۰۷۰ء کے اس بیان سے بخوبی ہوسکتا ہے قاضی صاحب کا بیان ہے کہ شمالی یورپ کے لوگوں کے سروں پر آفتاب کی شعاعیں بالکل سیدھی نہیں پڑتیں اس لئے اس کی آب وہوا سرد اور ماحول ابر آلود رہتا ہے اسی سے ان لوگوں کے مزاج ٹھنڈے اور ان کی طبیعتیں اجڈ ہیں، ان کے جسم کافی پھیل گئے ہیں چہرے پتلے اور بال لمبے ہوگئے ہیں ان میں جودت طبع اور بصیرت تام کو نہیں بلکہ اس کے بجائے ان پر بیوقوفی اور کند ذہنی مسلط ہے۔

لیون اور تاتارا، بارشلونا کے حکمرانوں کو جب بھی کسی جراح، راج معمار یا استاد

گانے والے یا لباس بنانے والے کی ضرورت ہوتی تو وہ قرطبہ سے رجوع کرتے تھے، اس اسلامی دارالسلطنت کی شہرت اتنی دور تک پہنچ گئی تھی کہ جرمنی کی ایک ساکزن راہبہ نے اس شہر کے قصے سن سن کر اس کو ''نگینۂ عالم'' کا لقب دیا تھا۔

قرطبہ کی شہرت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ جب دنیا تہذیب وتمدن اور ترقی کے ابتدائی زینوں پر تھی مسلمان تہذیب وترقی کے بام عروج پر متمکن تھے، انسانی استعمال کی چیزیں اور ضروریات زندگی بہت سادہ اور بھدی تھیں، ایجاد واختراع کا جذبہ مفقود تھا اس کے برعکس مسلمان پچھلی حالت پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے اور مسلسل تجربات کر کے بہتر سے بہتر چیزیں ایجاد کرتے تھے اور استعمال کرتے تھے اس لئے باہر کی دنیا ان کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتی تھی کپڑوں کی صنعت صرف ستر پوشی کی ضرورت پوری کرتی تھی لیکن ایک صنعت کی حیثیت سے اس کی ترقی مفقود تھی کپڑوں میں حسن خوبصورتی دلکشی وجاذبیت نزاکت لطافت پیدا کرنے کا کام مسلمانوں نے کیا، فلپ نے ہم کو قرطبہ کی صنعتی ترقی سے روشناس کرایا اس نے بتایا کہ خلفاء کے دور حکومت میں اسپین یورپ کے امیر ترین اور آباد ترین ملکوں میں شمار ہوتا تھا اس کے دارالسلطنت قرطبہ میں ۱۳ ہزار پارچہ بافی کے کارخانے تھے وہاں چمڑے کی صنعت بڑے پیمانے پر جاری تھی مراکش میں چمڑے کی دباغت اور ان کی گل کاری کا فن اسپین ہی سے منتقل ہوا تھا ان دونوں ملکوں سے یہ فن فرانس اور انگلستان والوں نے سیکھا آج بھی چمڑے کے لئے جو نام استعمال ہوتے ہیں انہیں عربی ناموں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، اُون اور ریشم کے کپڑے قرطبہ کے سوا مالقہ، المرتیہ اور دوسرے مرکزوں میں بنے جاتے تھے، ریشم کے کیڑوں کی پیدائش ابتداءً چین میں ہوتی تھی اسے اسپین کی سرزمین میں سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی رواج دیا تھا یہاں اس صنعت کو خوب ترقی ہوئی المرتیہ میں شیشے اور کانسے کا سامان تیار ہوتا تھا، جیان اور الغرب سونے چاندی کی کانوں، قرطبہ لوہے اور سیسہ کی کانوں اور مالقہ لعل ویاقوت کی کانوں کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہو گیا تھا،

طلیطلہ کی تلوار مشہور تھی، فولاد اور دوسری دھاتوں پر سونے چاندی کا مرصع کاری کا فن دنیا نے اسپین ہی سے سیکھا اسپین ہی سے یہ فن یورپ میں گیا، زراعت کے طریقے اسپینی عربوں نے یورپ کو سکھائے، عربوں نے اسپین میں نہریں کھدوائیں، انگور کے باغ لگائے دوسرے پودوں اور پھلوں کے سوا چاول، خوبانی، شفتالو، انار، نارنگی نیشکر، روئی اور زعفران کی کاشت پہلے پہل عربوں نے شروع کی، ہر ایک نے کہا کہ زرعی ترقی اسلامی اسپین کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور یورپ کے لئے لافانی عطیہ ہے، اس نے بتایا کہ شبیلیہ مسلمانوں کا ایک زبردست دریائی بندرگاہ ہے، یہاں سے روئی، زیتون اور تیل برآمد کیا جاتا ہے مصر سے کپڑا اور غلام اور یورپ سے گانے والیاں درآمد کی جاتی تھیں، مالقہ اور جیان کی بندرگاہوں سے زعفران، انجیر، سنگ مرمر، شکر برآمد کی جاتی تھی اسکندریہ اور قسطنطنیہ کے ذریعہ اسپین کی پیداوار کو ہندوستان اور وسطی ایشیاء جیسے دور دراز علاقوں تک میں منڈی مل گئی تھی، فلپ نے بتایا کہ عصر حاضر کے بین الاقوامی جہاز رانی میں بہت سے عربی الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں آج بھی موجود ہیں، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جہاز رانی کے میدان میں بھی یورپ نے اسپینی عربوں ہی سے استفادہ کیا ہے ڈاک کا نظام تھا اور سکوں کی ڈھلائی کے لئے ٹکسال گھر تھے نصرانی سلطنتوں میں بھی عربی ہی سکے رائج تھے اور تقریباً چار سو سال سے زائد عرصہ تک صرف عربوں ہی کا یہ سکہ یورپین ممالک میں چلتا تھا۔

عربوں نے تعلیم کا نظام بڑے پیمانے پر قائم کیا، اہل علم کو وظائف دیتے رہے، تعلیمی ادارے قائم کئے اور مفت تعلیم کو رائج کیا جامعہ قرطبہ کا دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں میں شمار تھا بلکہ جامع ازہر اور بغداد کے جامعہ نظامیہ سے بھی اس کی عظمت واہمیت زیادہ تھی جامع قرطبہ میں مسلمانوں کے سوا نصرانی طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے بلکہ یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے تشنگان علوم اپنی پیاس یہاں آکر بجھاتے تھے، جامعہ قرطبہ کے علاوہ یہاں ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں تقریباً چار لاکھ کتابیں تھیں ظاہر ہے کہ یہ سب قلمی کتابیں تھیں کیوں کہ ابھی پریس ایجاد نہیں ہوا تھا ایک

ایک مخطوطہ کے حاصل کرنے میں بڑی سے بڑی رقم خرچ کی جاتی تھی الفرج اصبہانی کی کتاب الاغانی کے لئے ایک ہزار دینار دیا گیا، ان تفصیلات کو پیش کر کے آخر میں فلپ نے لکھا کہ اسپین کے مسلمانوں کی یہ علمی ترقی اس زمانہ میں تھی جب یورپ کے باشندے اپنے نام کی ہجے سیکھ رہے تھے، یہ علم کی مبادیات بھی بڑی حد تک گنتی کے اراکین کلیسا جانتے تھے۔

پروفیسر فلپ کے ہٹی نے اپنی اس کتاب میں حتی الامکان بحیثیت مؤرخ کے پوری تاریخی دیانتداری سے واقعات کو اپنے اصل تناظر میں پیش کیا ہے، نہ کہیں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور نہ کہیں عربوں کی برتری اور اس دور کے یورپ کی پسماندگی کے بیان سے بخل سے کام لیا ہے اس نے تاریخی حقائق کو جس طرح اور جیسا پایا ہوبہو ہی کتاب کے حوالے کر دیا ہے، عام مستشرقین سے اس کا رویہ قدرے مختلف ہے اور یہ اندیشہ کم ہے کہ ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''۔

پروفیسر فلپ کے ہٹی شامی النسل عرب، مذہبا عیسائی اور قومیت کے لحاظ سے امریکی ہے، پہلے فلسطین کی یہودی یونیورسٹی میں اسلامیات کا استاذ تھا اور علمی دنیا میں اپنی بلند پایہ کتابوں اور عالمانہ مقالوں کی وجہ سے بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، پھر وہ امریکہ کی جامعہ پرنسٹن میں ادبیات کا پروفیسر رہا، یہ کتاب History Of the Arabs تاریخ عرب دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء سے کچھ پہلے لکھی تھی جب جنگ شروع ہوگئی تو امریکی حکومت کے ایماء پر اس نے اصل کتاب کی تلخیص کی اس تلخیص کو امریکی حکومت نے شائع کر کے اپنے فوجیوں میں تقسیم کیا اسی تلخیص کے اردو ترجمہ سے ساری معلومات آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ پروفیسر فلپ اور حکومت امریکہ مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی سے اچھی طرح واقف ہیں تو پھر مسلمانوں کے دور عروج کی یہ داستان اپنے فوجیوں کو سنانے کا کیا مقصد ہے؟ سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ امریکی حکومت سمجھتی ہے کہ مسلمانوں نے انتہائی پستی سے اٹھ کر دنیا میں بلند مقام حاصل کیا

اس کے پس منظر میں ان کا جوش عمل، عظمت کردار، بے پناہ جدو جہد اور موت کے خوف کو دل سے نکال دینا کارفرما تھا تب ان کو یہ بلند مقام ملا تھا فتح وظفر نے ان کے قدم چومے، وہ دنیا کے امام اور مقتدا بن گئے جب تک کوئی قوم عرب مسلمانوں کی طرح جہاد زندگی میں شامل نہیں ہوگی اس وقت تک اس کو کامیابی نہیں مل سکتی، فوجیوں کے ذہن میں یہی حقیقت جاگزیں کرنی تھی اس لئے مسلمانوں کے دور عروج کی کہانی اس کو سنائی گئی، اسی لئے یہ کتاب ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، اگر آج کی دنیا میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن جب مسلمانوں کے دور عروج سے سبق لے سکتا ہے اور اپنی قوم کو اس راستہ پر چلانا چاہتا ہے تو کیا خود مسلمانوں کو اپنے آباء واجداد کے نقش قدم پر چلنے کے لئے یہ حقائق مہمیز نہیں کر سکتے؟ بس اسی نیک جذبے سے یہ طویل داستان میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

بلگرام اور غلام علی آزاد بلگرامی

قیام لکھنؤ کے دوران ایک بار بلگرام ایک دوست کی بارات کے سلسلہ میں جانے کا اتفاق ہوا، بلگرام کا نام عرصہ دراز سے کانوں میں پڑا ہوا تھا، دل میں اس کی عظمت جاگزیں تھی، دماغ نے اس کی ایک ایسی خیالی تصویر بنا رکھی تھی جیسے محسوس ہوتا تھا کہ اس سرزمین میں سے آسمان تک نور ہی نور پھیلا ہوا ہے وہاں کے مشاہیر علماء کے علمی کارناموں نے اس کو خطۂ یونان بنادیا ہے، اس لئے میرے دل میں بلگرام دیکھنے کا جذبہ بے تکلف باراتیوں کی دلچسپ سرگرمیوں سے کہیں زیادہ تھا۔

جہاں ہم بس اور کاروں سے اترے وہ ایک کھلا ہوا میدان تھا، اسی طویل وعریض صحن کی ایک سمت ایک ٹیلہ پر قدیم طرز کے تھوڑے سے مکانات نظر آئے جو حویلی نما تھے جو خستہ بھی تھے اور اپنی کہن سالگی کی وجہ سے اداس اور آزردہ سے محسوس ہورہے تھے، کچھ گھروں کی دیواریں شکستہ ہیں تو بعض مکانوں کی چھت کا کچھ حصہ زمیں بوس ہوچکا ہے، طویل وعریض مکانات میں کہیں زندگی کی چہل پہل محسوس ہوتی تھی کہیں اداسی اور ویرانی ڈیرہ جمائے ہوئے تھی، جس حویلی میں بارات اتری وہ اپنے ماضی کی عظمت کی تاریخ کا ایک بوسیدہ اور خستہ ورق تھی، لیکن اس کی جدید کاری نے دیدہ زیب بنادیا تھا اس حویلی کے چاروں طرف ایک اداسی اس طرح برستی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جیسے رات کے پچھلے پہر شبنم دبے پاؤں آسمان سے اترتی ہے اور درختوں، پودوں، پھولوں اور کلیوں کے رخساروں پر آنسو بن کر غمناک فضا بنا دیتی ہے، بلگرام ایک قدیم اور چھوٹا سا قصبہ ہے جو مسطح زمین پر دور تک پھیلا ہوا ہے مگر عام آبادی سے بلند اس ٹیلہ کی مختصر آبادی ہی درحقیقت تاریخ کا مشہور مقام بلگرام ہے باقی آبادی نشیب میں ہے ٹیلہ کی یہ آبادی اپنی قدامت اور کہن سالگی کی بدولت ویران سی ہے اس کے مکانات جذبات سے عاری انسان کی طرح مایوس اور اداس

کھڑے ہیں اور گلاب کے اجڑے ہوئے بے برگ و بار پودوں کی طرح تھے جن میں کبھی شوخ رنگ کے پھول اپنی بہار دکھاتے رہے ہوں گے یا راہب کے کلیسا کے وہ چراغ تھے جن کا تیل ختم ہو چکا تھے اور ان کی جھلملاہٹ کہہ رہی تھی کہ اب اس کی زندگی کے لمحات بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔

یہی وہ بلگرام ہے جہاں کبھی ہن برستا تھا ٹیلہ کی یہی آبادی دارالامراء تھی، ہر امیر کی شاندار حویلی تھی یہاں حاکم بلگرام کا چھوٹا سا قلعہ تھا جہاں شاندار عربی گھوڑوں کی ہنہناہٹ جاہ وجلال برسا رہی تھی، راجہ سری کی پوری حکومت یہیں کے باشندوں کے زیر نگیں تھی، سلطان شمس الدین التمش کی نظر عنایت شاہان شرقیہ اور مغلیہ بادشاہوں کی دی ہوئی جاگیریں، زمینداریاں اور معافیاں ان کو حاصل تھیں فکر معاش سے آزاد رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے، ہر حویلی کے سامنے ہاتھی جھومتا تھا، یہاں کے لوگ شاہی درباروں سے وابستہ تھے، خوشحالی وفارغ البالی نے ان کو بھکنے نہ دیا بلکہ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کے فروغ اور ان کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا، اسی لئے کھیپ کی کھیپ علماء، صوفیاء، مشائخ، مصنّفین تیار ہو کر علمی دنیا میں سرفراز رہے جو آج بھی تذکرہ کی کتابوں اور تاریخوں میں زندہ ہیں، دل ودماغ آباد تھے تو ان کی حویلیوں میں عیش وآرام خوشحالی وفارغ البالی خیمہ زن تھی، مادی زندگی کی تمام رعنائیاں ان کے سامنے کنیزوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی تھیں لیکن آج کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے، خستہ وشکستہ حویلی میں بارات کی شاندار پذیرائی ہوئی، دسترخوان پر بیش قیمت برتنوں کی جگمگاہٹ، کھانوں کا تنوع، سفید پوش، صاف شفاف لباسوں میں میزبانوں کی دسترخوان پر موجودگی، انداز گفتگو، طرز تخاطب میں پرانی وضعداری کی چاشنی، دودھ کی طرح سفید چاندنی پر بچھے ہوئے لمبے دسترخوان پر دورویہ لکھنوی باراتی اپنی تمام روایتی تہذیب اور وضعداری کے ساتھ اس

طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے نورانی فرشتوں کی قطار آسمان سے اتر پڑی ہو۔

عروج وزوال کی یہ کہانی نئی نہیں بہت پرانی ہے، آنے والی نسلوں کے لئے یہ داستان عبرت ہر طرف بکھری ہوئی ہے، آج کے بلگرام کے شکستہ اور ٹوٹے ہوئے آئینہ میں اس کے شاندار ماضی کا جاہ وجلال بھرا چہرہ دیکھ رہا ہوں، اس کی عظمت ورفعت کا ستارہ مجھے اتنی بلندی پر نظر آتا ہے کہ آنکھوں کا تارِ نظر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے، یہی وہ بلگرام ہے جہاں سید مرتضٰی زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) پیدا ہوئے جنہوں نے قاموس کی شرح تاج العروس لکھ کر علمی دنیا کو حیرت زدہ کردیا، ان کی پچاس ساٹھ کتابیں ان کے علم وفضل ان کے مقام ومرتبہ کی شاہد عادل ہیں، اسی بلگرام کے میر سید عبدالجلیل جو شاہان مغلیہ کی آنکھوں کے تارا تھے ان کا مقام ومرتبہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، اسی بلگرام کے خواجہ عماد الدین ہیں جو سطح گنگا پر چل کر تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے، اسی سرزمین میں میر غلام علی آزاد پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی معرکہ آراء کتابوں کے ذریعہ بلگرام کا پرچم آسمان کی بلندیوں تک لہرادیا، بلگرام کی سرزمین کتنی زرخیز، سونا اگلنے والی تھی کہ اپنے فرزندوں میں علمی طلب کا اتنا جوش وجذبہ پیدا کردیتی تھی کہ وہ دنیا کے گوشے گوشے میں جا کر اسلامی علوم وفنون حاصل کرتے تھے اور اپنے وطن تک کو اپنے نصب العین کے سامنے بھول جاتے تھے، یہی سید مرتضٰی زبیدی بلگرام سے چل کر یمن تک پہنچے حجاز ومصر کا چکر لگا کر زبید (یمن) میں مقیم ہوگئے کہ وہ بلگرامی کے بجائے زبیدی کہلانے لگے آج مدینہ منورہ میں دفن ہیں۔

ٹیلہ کی یہ چھوٹی سی آبادی کتنی زرخیز تھی اپنے دامن میں کتنے یاقوت وزمرد اور لعل وجواہر کو چھپائے ہوئے تھی کہ جب اس نے اپنا دامن جھٹک دیا تو سینکڑوں ہیرے جواہرات دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگئے جن کی آب وتاب چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں، میر غلام علی آزاد بلگرامی کی صرف ایک کتاب مآثر الکرام کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام، مشائخ طریقت، اولیاء کبار، علماء ومصنّفین کی اتنی بڑی تعداد اس سرزمین سے اٹھی کہ آج اس ٹیلہ کی پوری مردم شماری بھی اس کی

ہمسری نہیں کرسکتی۔

بلگرام سرزمین ہند کی ان قدیم اور ابتدائی دور کی مسلم آبادیوں میں شامل ہے جب نیک دل اور بہادر مسلم سلاطین نے ہندوستان کی طرف اپنے گھوڑوں کی باگ موڑدی تھی اور یہاں ایک مضبوط مسلم حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی، بلگرام ایک چھوٹے سے راجہ کی حکومت کا پائے تخت تھا اور ہموار زمین پر آباد دار الحکومت تھا، راجہ کو اپنی فوجی طاقت پر ناز تھا اس لئے اس کا نام بلگرام (طاقت کا سرچشمہ) رکھا تھا، ظاہر ہے کہ طاقت کا سرچشمہ طاقت ہی کے ذریعہ فتح ہوسکتا تھا۔

سادات بلگرام کے مورث اعلیٰ سید محمد صغریٰ بلگرامی سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۶۳۳ھ) کی فوج میں ایک بلند منصب پر فائز تھے، سلطان نے ان کو بلگرام کے راجہ سری پر حملہ کے لئے بھیجا، انہوں نے بڑی مردانگی سے اس کا مقابلہ کیا اور اس کے طاقت کے غرور کو توڑ کر شکست فاش دے دی، خاندان کے تمام افراد اور سرداران فوج جنگ میں کام آئے اور بلگرام پر سید محمد صغریٰ کا قبضہ ہوگیا اس فتح کی تاریخ لفظ ''خداداد'' سے نکلتی ہے جو ۶۱۴ھ ہوتی ہے سید محمد صغریٰ نے فرمان شاہی کے مطابق اپنے تمام فوجی سرداروں اور ان کی فوج کے ساتھ بلگرام میں قیام کیا اور پورا علاقہ آپ کی جاگیر قرار دیا گیا، سلطان التمش کی طرف سے ۶۲۷ھ میں بلگرام ہی آپ کو گڑھی (چھوٹا قلعہ) بنانے کا حکم دیا گیا یہ قلعہ اسی ٹیلہ پر بنایا گیا جو آج سادات بلگرام کی ٹوٹی پھوٹی آبادی ہے، سید محمد صغریٰ بلگرام کی فتح کے بعد ۳۱ سال زندہ رہے اور شعبان ۶۴۵ھ میں انتقال کیا ان کا مزار آبادی کی شمالی جانب ایک باغ میں بنایا گیا۔

بلگرام میں اس قافلہ علم وعمل کے قیام کے بعد اسلامی علوم وفنون کی نشرواشاعت کا ایک سیل رواں چل پڑا، فکر معاش سے آزاد ہوکر صرف علمی ودینی خدمت کو اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا، مسلم سلاطین جن جن علاقوں کو فتح کرتے وہاں اپنے فوجی سرداروں کو قیام کرنے کا حکم دیتے ان کو معافیاں دے دی جاتیں، علماء اور قاضیوں کا تقرر کردیا جاتا، امام وخطیب اور بزرگان دین کو تمام سہولتیں

فراہم کردی جاتیں وہ ذہنی یکسوئی کے ساتھ دین اور دینی علوم کی خدمت میں لگ جاتے، اندرون ملک بلگرام جیسی چھوٹی چھوٹی بہت سی آبادیاں تھیں، مسلم سلاطین ان آبادیوں کے خاندانوں کو بڑی بڑی جاگیریں اور معافیاں دے رکھی تھیں، یہیں تھوڑے سے فوجی خاندان کچھ فوجی سردار، امام خطیب قاضی مقرر تھے گویا وہ ایک طرح کی فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے ملکی نظام میں استحکام اور بغاوتوں کوفرو کرنے میں مدد لی جاتی تھی، یہ آبادیاں فکر معاش سے دور تھیں ہر طرح کی عزت، وقار، خوشحالی اور فارغ البالی انکو حاصل تھی ان آبادیوں کے اہل علم نے اپنی اپنی آبادیوں میں درس وتدریس کا مشغلہ جاری کررکھا تھا، ملک کے مختلف حصوں میں یہ علمی مراکز کام کررہے تھے، علم وفن حاصل کرنے والے کارواں درکارواں ہمہ وقت ادھر سے اُدھر رواں دواں تھے، انہیں علمی مرکزوں میں ایک بلگرام بھی تھا، ملک کے مختلف حصوں میں یہ علمی مراکز کام کررہے تھے، علم وفن حاصل کرنے والے کارواں درکارواں ہمہ وقت ادھر سے ادھر رواں دواں تھے، انہیں علمی مرکزوں میں ایک بلگرام بھی تھا، خود اس کے باشندے ملک اور بیرون ملک طلب علم کے لئے آیا جایا کرتے تھے، پانچ چھ صدیوں تک یہ اعزاز وافتخار بلگرام کو حاصل رہا یہاں کے امراء اکثر شاہی درباروں سے وابستہ تھے، ان کی جاگیروں اور معافیوں میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا، لیکن جب سلطان دہلی کی طرف سے اودھ کی حکومت میر سید محمد امین اور پھر نواب سعادت علی خاں نیشاپوری کے دست تصرف میں آئی تو شیعہ گردی نے سارا نظام زندگی درہم برہم کردیا، نواب سعادت علی خاں کے دور میں تمام نئے اور پرانے خاندانوں کے وظیفے بند کردیئے گئے اور معافیاں اور جاگیریں یک قلم ضبط کرلی گئیں اور شریفوں کا کام بگڑ گیا ان کی معاشی حالت تباہ وبرباد ہوگئی، تحصیل علم کا مشغلہ چھوڑ کر مجبوراً سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا، علم وفن کی تدریس وتحصیل کا نظام داستان پارینہ بنتا چلا گیا خوشحالی اور فارغ البالی نے بلگرام سے رختِ سفر باندھ لیا دینی علوم کے چرچوں، تدریس وتعلیم کی محفلوں پر سناٹا چھا گیا لکھنؤ کی شیعی حکومت نے پورے صوبہ اودھ کو چھوٹا سا ایران بنادیا، بلگرام

بھی اسی تباہی کی زد میں آ گیا اور اس پر ادبار ونکبت کے بادل چھاتے چلے گئے، قدیم زندگی کا شیرازہ ٹوٹ کر بکھر گیا اور نواب سعادت علی خان نواب لکھنؤ کا جب انتقال ہوا تو ایک دل جلے نے اس کی تاریخ نکالی

سعادت نمک حرام بمرد

میر غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکرام سے معلوم ہوتا ہے کہ بلگرام میں اولیاء وصوفیاء عظام کی تعداد ۶۱ ہے جو خاص بلگرام ہی سے ہے مزید حیرتناک بات یہ ہے کہ ان صوفیاء ومشائخ میں ۲۳ بزرگ صرف ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں علماء وماہرین علم وفن کی فہرست اس کے علاوہ ہے جن کا الگ مستقل تذکرہ ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی ۲۵/صفر ۱۱۱۶ھ مطابق ۹/جون ۱۷۰۴ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے اور ۲۴/ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ ۱۵/ستمبر ۱۷۸۶ء کو وفات پائی، انہوں نے اپنے وطن بلگرام کو اپنی کتابوں کے ذریعہ زندۂ جاوید بنا دیا اور اس کی عظمت وشہرت بڑھانے میں کلیدی رول ادا کیا وہ بلگرام کے علماء کرام اور مشائخ عظام کی فہرست میں آتے ہیں اور اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، صاحب سجادہ، عشق رسول میں سرشار اوراد وظائف کے پابند، شب زندہ دار بزرگوں میں شامل تھے مگر خالص علمی کتابوں کے بجائے انہوں نے تاریخ وتذکرہ کو اپنا موضوع تصنیف بنایا اور اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں جو آج علمی دنیا میں متداول اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں ہر کتاب میں بلگرام کا ذکر کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور آتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ دنیا نے بلگرام کی دینی خدمات اور اس کے عظیم ترین رجال کو آزاد بلگرامی کی کتابوں ہی کے ذریعہ جانا اور ان کے مقام ومرتبہ کو پہچانا ہے۔

میر غلام علی آزاد کی پوری تعلیم از اول تا آخر شیخ محمد طفیل اُترولوی سے ہوئی، لغت اور حدیث وسیر نبوی وفن ادب اپنے نانا میر سید عبدالجلیل بلگرامی سے حاصل کیا، صحیح بخاری بلکہ صحاح ستہ کی سند واجازت شیخ محمد حیات سندھی مدنی مقیم مدینہ منورہ سے حاصل ہوئی حدیث کی دوسری کتابوں کی اجازت شیخ عبدالوہاب طنطاوی سے مکہ

معظّمہ میں حاصل ہوئی، علامہ طنطاوی نے آپ کے عربی قصائد کی بیحد تحسین کی، آپ ایک عرصہ تک مکہ ومدینہ میں مقیم رہے اور تحصیل علم کرتے رہے حجاز سے واپسی کے بعد نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ابن نواب نظام الملک آصف جاہ والیٔ حیدرآباد کی مصاحبت میں رہے اور اورنگ آباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں آپ نے وفات بھی پائی اور وہیں آج آسودۂ خواب بھی ہیں۔

آپ عربی کے بہترین اور قادر الکلام شاعر تھے فارسی میں بھی مشق سخن کرتے رہے عربی کے سات دیوان یادگار چھوڑے ہیں ان میں دو دیوان تو صرف نعت سرور کائنات پر مشتمل ہیں، شان رسالت میں لمبے لمبے قصیدے لکھے ہیں قصائد میں روح کی تڑپ عشق رسول کی سوزش اور جذبات کا تموج محسوس ہوتا ہے یہ قصائد ان کے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں قدرت کلام زور بیان پورے پورے قصیدوں پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے، نعتوں کے اتنے بڑے ذخیرے کو دیکھ ہندوستان کے علماء ادب نے غلام علی آزاد کو "**حسان الهند**" کا خطاب دیا تھا ان کے ان دونوں نعتیہ دیوانوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ صحیح معنی میں اس خطاب کے مستحق تھے۔

ان کی فارسی شاعری کے بھی کئی دیوان ہیں جو چھپ چکے ہیں البتہ اردو میں ان کا کوئی مجموعہ کلام نہیں اور نہ ان کی تصانیف میں کہیں اردو شعر نظر آتا ہے البتہ ہندی شاعری سے متاثر تھے اور شوق سے سنتے تھے دیگر علوم وفنون میں بھی ان کی تصانیف ہیں لیکن اہل علم نے ان کی طرف کوئی خاص اعتناء نہیں کیا، البتہ تاریخ وتذکرہ میں ان کی چھ سات کتابیں زیادہ مشہور ہوئیں اور انہیں کتابوں کی وجہ سے آج ہندوستان کے علمی حلقہ میں ان کا نام روشن ہے اور یہ کتابیں تذکرہ نویسوں کا ماخذ بنی ہوئی ہیں، تذکرہ وتاریخ کی ان کتابوں میں صرف ایک عربی زبان میں ہے اور باقی ساری کتابیں فارسی میں ہیں۔

ان کی عربی تصنیف "**سبحة المرجان فی آثار هندوستان**" کتاب کے آغاز میں ہندوستان کے فضائل بیان کرتے ہوئے ذخیرۂ روایات سے ان تمام

روایتوں کو جمع کر دیا ہے جن کا سر چشمہ اسرائیلی روایات ہیں، مثلاً حضرت آدم کا لنکا کے ایک پہاڑ پر اترنا، کسی چٹان پر ان کا نشان قدم ہونا، جنت سے پھولوں کے پودے لانا اور انہیں فردوسی پودوں کی وجہ سے ہندوستان کے پھولوں میں خوشبو کا پایا جانا اور یہ کہنا کہ اسی وجہ سے دنیا کے پھولوں میں ایسی خوشبوؤں کا نہ پایا جانا سب انہیں اسرائیلی روایتوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ ان روایتوں کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ سب جھوٹ کی پوٹ ہے اور اسرائیلی روایات ہونے کی وجہ سے نا قابل اعتبار ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں فرمایا کہ اگر وہ روایتیں قرآنی تصریحات کی تائید کرتی ہیں تو وہ صحیح ہیں اور ان کو بیان کیا جاسکتا ہے اور ان کی تصدیق کی جائے گی اور جن روایتوں میں عقیدۂ توحید کے منافی باتیں ہیں یا اس کی وجہ سے عصمت انبیاء پر حرف آتا ہے یا ان کی تنقیص ہوتی ہے وہ قطعاً جھوٹی روایتیں ہیں ان کی تکذیب کی جائے گی اور ان کا بیان کرنا بھی جائز نہیں ہوگا، اور وہ اسرائیلی روایات جن کا واقعات عالم سے تعلق ہے ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ سچ بھی ہوسکتی ہیں اور جھوٹی بھی اس لئے اس طرح کی روایتوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **لا تصدقوہ و لاتکذبوہ** نہ ان کی تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب، خاموشی اختیار کی جائے گی، غلام علی آزاد کی فضائل ہند کے سلسلہ میں یہ تمام روایتیں اسی قبیل کی ہیں کہ ان کی تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب، بہرحال یہ روایتیں ہندوستان کے فضائل کے سلسلہ میں ایک گونہ روشنی ڈالتی ہیں، آزاد کا ان روایتوں کا ذکر کرنا کچھ بے محل نہیں ہے، آزاد کا علم حدیث تسلیم شدہ ہے کیونکہ وہ **ضوء الدراری فی شرح البخاری** عنوان سے بخاری شریف کی کتاب الزکوٰۃ کی شرح لکھ چکے ہیں پھر ان کے شیوخ حدیث میں مشہور اہل علم ہیں اور مستند ہیں۔

"**سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان**" کی ابتداء میں ان روایتوں کو ذکر کر کے ہندوستان کی عظمت وافتخار کو چار چاند لگا دیتے ہیں اس ملک کی کلاہ افتخار کو تاج

زرنگار بنادیا ہے، پہلے باب کے تمام ہونے کے بعد دوسرے باب میں ہندوستان کے علماء وفضلا کا تذکرہ وتعارف ہے جو آزاد کا اپنا خاص موضوع ہے۔

تیسرے باب میں عربی زبان کے صنائع بدائع اور محاسن کلام کی بحث چھیڑی ہے اوران پر بہت مفصل کلام کیا ہے، بطور مثال انہوں نے اس سلسلہ میں کئی سو اشعار پیش کئے ہیں، چوتھے باب میں عاشق ومعشوق کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اسی سلسلہ میں انہوں نے ہندوستانی موسیقی ومعشوق کی خصوصیات، اس کے موضوع، اظہار عشق کے انداز بیان اور اسلوب کو بیان کرتے ہوئے عربی اشعار میں خود ہندی شاعری کے تخیل کو پیش کر کے سمجھانے کی کوشش کر کے ایک بالکل نیا تجربہ کیا ہے اپنے عربی اشعار میں اس دلکشی کو باقی رکھا ہے جو ہندی شاعری کی اپنی خصوصیت ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندی اشعار کو سامنے رکھ کر ان کو عربی کا لباس پہنا دیا ہے، عربی شاعری میں یہ بالکل نئی چیز تھی اور عربی شاعری کے مزاج اور اس کے آہنگ سے قطعاً مختلف اور جداگانہ ہے، ان اشعار کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان اشعار میں کوئی ہندوستانی شاعر بول رہا ہے یہ خاصا دلچسپ تجربہ ہے ان اشعار کو پڑھ کر غلام علی آزاد کی قادرالکلامی پر ایمان لانا پڑتا ہے، یہ باب خاصا دلچسپ ہے۔

میر غلام علی آزاد کی دوسری کتاب جس کو شہرت حاصل ہوئی اور آج بھی لائبریریوں میں پائی جاتی ہے وہ ''مآثر الکرام'' ہے جس میں خاص طور پر بلگرام کے علماء اور صوفیاء سے متعارف کرایا گیا ہے اصل کتاب تو فارسی میں ہے لیکن اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اسی (۸۰) صوفیاء کا تذکرہ ہے ان کے نام ونسب، ان کے شیوخ و بیعت اور ان کے فضل وکمال کو کہیں اختصار کے ساتھ کہیں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ان صوفیاء میں ۶۱ مشائخ خاص بلگرام کے ہیں، دوسرے حصہ میں ۷۳ علماء فضلاء کے تراجم ہیں انہیں تراجم کے ضمن میں بلگرام کی خود تاریخ بھی آجاتی ہے، بلگرام میں مسلمان کب آئے؟ کس نے اس کو فتح کیا؟ اسی کے ساتھ اس کے دور عروج کی بھی ایک جھلک نگاہوں

کے سامنے آجاتی ہے، آزاد کے زمانہ تک بلگرام پر چھ سو سال گذر چکے تھے اس کے زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جب کہ بلگرام کی تاریخ تسلسل کے ساتھ انہوں نے کتاب میں نہیں بیان کی ہے لیکن صوفیاء اور علماء کے تذکرہ کے ضمن میں یہ ساری حقیقتیں از خود ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

غلام آزاد کی تاریخ وتذکرہ کے سلسلہ میں ایک کتاب ''روضۃ الاولیاء'' ہے یہ کتاب خلد آباد (حیدرآباد دکن) کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے آزاد خود خلد آباد میں ایک عرصہ مقیم تھے، ۱۱۶۱ھ میں یہ کتاب انہوں نے فارسی زبان میں لکھی۔

ان کی ایک اور کتاب ''ید بیضا'' کے نام سے ہے جو فارسی زبان کے شاعروں کے تذکرہ پر مشتمل ہے یہ کتاب اس دور کی یادگار ہے جب آزاد سندھ میں قیام پذیر تھے یہ کتاب ۱۱۴۸ھ میں مکمل ہوئی۔

تذکرہ کی ایک اور کتاب ''سروآزاد'' ہے، اس کتاب میں ۱۴۳ فارسی زبان کے شاعروں کا ذکر ہے اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے مزید بھاکا زبان کے آٹھ شاعروں کا بھی اس میں تذکرہ شامل ہے، فارسی کے شاعروں میں ۲۹ شعرا خود ان کے وطن بلگرام کے ہیں، آزاد کی ایک کتاب ''خزانہ عامرہ'' کے نام سے ہے اس کتاب میں ان شاعروں کا تذکرہ ہے جو بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں سے وابستہ رہے اور شاہی انعام واکرام سے نوازے گئے، ۱۱۷۱ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی، ''مآثرالامراء'' کے نام سے جو کتاب آزاد کے نام سے شائع ہوئی اس کے اول مرتب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں حیدرآبادی ہیں جب وہ یہ کتاب مرتب کر رہے تھے ان کا قتل ہو گیا ان کے کتب خانے میں آگ لگادی گئی، آزاد کو اس کتاب کی تلاش تھی کہ شاید اس کا کچھ حصہ جلنے سے محفوظ رہ گیا ہو، اتفاق سے ایک جگہ اس کے کچھ منتشر اوراق مل گئے ان کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا تھا آزاد نے اس کو از سر نو مرتب کیا، اپنی معلومات اور اپنی کتابوں سے حالات لے کر کتاب کو مکمل کر دیا اور شائع کر دیا، اسی لئے اس کتاب کو بھی ان کی تصنیفات میں جگہ دی گئی۔

تاریخ وتذکرہ کی ان کتابوں کے علاوہ دوسری تصانیف میں بخاری شریف کی ایک مکمل شرح بھی ہے جو ''ضوء الدراری'' کے نام سے لکھ رہے تھے مگر اس کو مکمل نہ کر سکے اور طبع بھی نہیں ہوئی۔

عربی شاعری ان کا دلچسپ مشغلہ تھا، اس لئے ان کے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا اور اس کو ردیف وار مرتب کر کے شائع کیا گیا، ان کے دو دیوان تو صرف نعتیہ کلام پر مشتمل ہیں اسی لئے ان کو ''حسان الہند'' کا خطاب حاصل ہوا، ان کا ایک اور مجموعہ کلام ''تسلیۃ الفواد'' کے نام سے ہے جو آزاد کے قصائد کا مجموعہ ہے ان میں ان کی وفات سے چار پانچ سال پہلے تک کا کلام موجود ہے ان میں سے بعض دیوان شائع ہوئے، بیشتر غیر مطبوعہ ہیں ان کی ایک کتاب ''مظہر البرکات'' بھی ہے، یہ آزاد کی ایک صوفیانہ مثنوی ہے جو سات دفتروں پر مشتمل ہے، ان کے فارسی کلام کو بھی مرتب کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔

میر غلام علی آزاد نے اپنی تصانیف کے ذریعہ بلگرام کی چھ سو سال کی اجمالی تاریخ ہمارے سامنے پیش کر کے اس کی عظمت ہمارے دلوں میں بٹھا دی ہے، یہ کام بلگرام کے کسی فرد نے نہیں کیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جن صوفیاء اور مشائخ کا ذکر آزاد نے اپنی کتابوں میں کیا ہے ان میں سوائے چند افراد کے کسی کو ہندوستان میں شہرت حاصل نہیں، اور نہ لوگ ان کے ناموں اور کاموں سے واقف ہیں، سید مرتضٰی زبیدی بلگرامی جن کی قبر مدینہ منورہ میں ہے، اپنی مشہور عالم کتاب تاج العروس شرح قاموس کی وجہ سے عالمگیر شہرت کے مالک ہوئے، خود غلام علی آزاد نے اپنی تصانیف کی وجہ سے ہندوستان گیر شہرت پائی دو چار نام اور بھی لئے جا سکتے ہیں مگر اور کسی کو جاننے والے بہت کم لوگ ہیں، غلام علی آزاد کے سحر کار قلم نے اپنے وطن کو جو بلند مقام دے دیا ہے اسی کا ثمرہ ہے کہ آج بھی مشائخ وعلماء بلگرام کے نام زندہ ہیں، اور ان کا ذکر احترام سے کیا جاتا ہے آزاد اپنے وطن کی کہانی سناتے سناتے ۱۲۰۰ھ میں خود اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

ہمیں　سو گئے　داستاں　کہتے　کہتے

بلگرام جاتے ہوئے یہ تفصیلات تو میرے ذہن میں نہیں تھیں لیکن بلگرام کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی تھی، اس سفر میں کوئی ہم مذاق ساتھی نہیں تھا کہ میں اس کو ہمراہ لے کر بلگرام کے کھنڈرات اور اس کے شہر خموشاں کی سیر کرتا اور اس کی عظمت دیرینہ کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کی کوشش کرتا، فاتح بلگرام کی قبر کہاں ہے؟ سلطان شمس الدین التمش کا کتبہ کہاں لگا ہوا تھا، بلگرام کی گڑھی (خام قلعہ) کہاں تھا؟ امراء بلگرام کی حویلیاں کہاں تھیں؟ مشائخ بلگرام کے مزارات کس حالت میں ہیں؟ چند گھنٹوں کے قیام میں اس کا موقعہ بھی نہیں تھا کہ بارات کے ہنگاموں سے دامن چھڑا کر کھنڈرات کی سیر کرتے، البتہ ان تین گھنٹوں میں بلگرام کی چھ سو سال کی کہانی کی فلم ذہن کے پردے پر چلتی رہی اور دس بجے شب لکھنؤ واپس آیا تو یہ فلم چلنی بند ہو گئی، دل ودماغ پر سناٹا چھا گیا، یہ اداسی اور سناٹا ایسا ہی تھا جیسے کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی کے آ کر چلے جانے کے بعد ہوتا ہے، یا جس طرح شادی کے خیمے صبح کو الٹے ہوئے۔

اسلامیات کا ایک بے مثال محقق عالم

جو مستشرقین کے لئے ہمیشہ چیلنج بنا رہا

حیدر آباد کے ایک علمی خاندان کے فرد فرید، دنیائے اسلام کے نامور محقق عالم ڈاکٹر حمید اللہ ایم اے، پی، ایچ، ڈی، ڈی فل، ڈی لٹ (فرانس) اپنی ذہانت وفطانت، وسعت مطالعہ، اور علم وتحقیق کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کی وجہ سے اسلام کی تہذیبی، تمدنی اور علمی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرنے والے مستشرقین کے لئے پیرس (فرانس) میں نصف صدی سے زائد عرصہ تک ہمیشہ چیلنج بن کر رہے، مستشرقین نے اسلام کے جس پہلو پر اعتراض کیا اسلام کی تہذیبی تمدنی اور علمی تاریخ میں جب جب شک وارتیاب کے کانٹے بونے کی کوشش کی تو ڈاکٹر حمید اللہ نے آگے بڑھ کر ان تمام بنیادوں کو ڈھادیا جن میں ان نام نہاد علم وتحقیق کا ہوائی قلعہ تعمیر ہورہا تھا، پورے یورپ میں وہ اسلامیات کے فقید المثال محقق عالم کی حیثیت سے مشہور ہی نہیں تھے بلکہ یورپین یونیورسٹیوں کے اہل علم وتحقیق کی جس مجلس مذاکرہ ومباحثہ جس سیمنار یا جس کانفرنس میں شریک ہوتے تو انگلیوں سے ان کی جانب احساس مرعوبیت کے ساتھ اشارے کئے جاتے اور بے چینی کے ساتھ ان کے گفتگو کرنے کا انتظار کرتے تھے، وہ قدیم علمی آثار ومخطوطات کے دنیا کے چند گنے چنے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے، ان کے علم وفضل ان کے دین ودیانت ان کی صداقت واخلاص کا نور ان کے چہرے سے ہویدا تھا، ان کی شخصیت کا ایک دلنواز پہلو یہ بھی تھا کہ فرانس میں ہزاروں افراد نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا، یہ ڈاکٹر حمید اللہ کے صرف اخلاص کا جادو تھا جس کی کاٹ یورپ کے نام نہاد محققین کے پاس نہیں تھی، ابھی چند مہینوں پہلے جنوری ۱۹۹۸ء میں پیرس میں نوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی ولادت حیدر آباد میں ۱۹۰۸ء میں ہوئی، یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۳۱ء میں وہ پیرس (فرانس) گئے اور کئی سالوں تک وہاں قیام کر کے انہوں نے ایک خالص اسلامی موضوع ''رسول اکرم اور خلفاء راشدین کے عہد کی سیاسی سرگرمیاں'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اپنے مقالہ کی ترتیب کے سلسلہ میں ان کو بار بار ترکی جانا پڑا جہاں اسلامیات کے قدیم مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، انہوں نے ایم اے، پی ایچ، ڈی، ڈی فل، ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کر کے اپنے وطن حیدر آباد میں رہنے کا فیصلہ کیا، اس زمانہ میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اپنی نوعیت کی ممتاز یونیورسٹی تھی اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ اسلامی دنیا کی وہ واحد یونیورسٹی تھی جس کا ذریعہ تعلیم ابتدا سے انتہا تک اردو تھا اور سارے علوم وفنون اردو ہی میں پڑھائے جاتے تھے اور ملک کے ذہین ترین علماء ومحققین یونیورسٹی کے دار التراجم سے وابستہ تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے ڈگری کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کا تعلق سیرت محمدیہ سے تھا اور سیرت کے بہت سے پہلوؤں پر دانشوران یورپ کو اعتراضات ہیں اور وہ ان پر نکتہ چینیاں کرتے رہتے ہیں، اس کا تجربہ ان کو اس وقت بھی ہوا جب مقالہ کی منظوری کے آخری مرحلہ ''دائے دا'' کا مرحلہ آیا، ماہرین نے جو سوالات کئے وہ وہی تھے جن کے بارے میں یورپ کے مستشرقین اپنا پورا زور قلم صرف کرتے رہتے ہیں، اس سے ڈاکٹر حمید اللہ کو اندازہ ہوگیا کہ یورپ کی ساری یونیورسیٹیوں میں جن لوگوں کا تعلق اسلامک اسٹڈیز سے ہے ان میں سے کسی کا ذہن صاف نہیں ہے اور انصاف سے کام نہیں لیتے اسی لئے وہ اپنے مضامین، مقالوں اور کتابوں میں ایسے مباحث اٹھاتے رہتے ہیں، جن سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر حرف آتا ہے اور آپ کے لائے ہوئے دین کی طرف سے پورے یورپ کو بدگمانی میں مبتلا کرتے رہتے ہیں، انہیں تجربات ومشاہدات کی بنا پر آپ نے فیصلہ کرلیا کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں رہ کر اپنی پوری زندگی مستشرقین کی مدافعت میں صرف کردیں گے یہی سوچ کر وہ

عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے، بحیثیت استاذ ابھی کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ ہندوستان آزاد ہوگیا اور بدقسمتی سے ملک دو حصوں میں منقسم ہوگیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تباہیوں اور بربادیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہوگیا، ملک کی تقسیم نے منافرت کا ایسا زہر پھیلایا کہ مسلمانوں کے سارے علمی تہذیبی وتمدنی آثار مٹادینے کی باتیں ہونے لگیں، اسی زد میں ریاست حیدرآباد بھی آگئی، ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پولیس ایکشن ہوا، ہزاروں آدمی مارے گئے، ریاست کا نام ونشان مٹ گیا اسی آگ اور خون کی موسلا دھار بارش میں جامعہ عثمانیہ کی فلک بوس عمارت زمین بوس ہوگئی، اس کا امتیازی کردار دفن کردیا گیا، انہیں حالات میں ڈاکٹر حمیداللہ نے ہمیشہ کے لئے حیدرآباد چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا اور ۱۹۴۸ء میں وہ پھر پیرس (فرانس) چلے گئے، پھر وہ نصف صدی تک یعنی پورے پچاس سال تک مسلسل علم وتحقیق اور اسلام کے تعارف اس کی عظمت وبرتری، اور اس کے پیش کردہ دستورِ حیات کی پاکیزگی، اس کے نظام حکمرانی، اس کے اصول صلح وجنگ سماجی وخاندانی زندگی کے لئے اس کے قوانین کو پوری دنیائے انسانیت کے لئے خیر وبرکت کا ذریعہ اور ساری دنیا کے تہذیب وتمدن پر اس کی عظمت وبرتری کو ثابت کرتے رہے اور اس سلسلہ میں اس دور کے تمام مستشرقین سے علمی جنگ کرتے رہے اور کبھی شکست نہیں کھائی، بحث ومذاکرہ اور سیمناروں میں شرکت، علمی مباحثوں اور محاضرات میں اسلامی تہذیب وتاریخ کی وکالت کرتے رہے، پورے فرانس میں اسلام کا تعارف جس بلند معیار سے انہوں نے کرایا اس کے نتیجے میں ہزاروں فرانسیسیوں نے اسلام قبول کیا، ان تمام خالص دینی ومذہبی سرگرمیوں کے باوجود پورے فرانس کی یونیورسٹیوں اور ممتاز ترین کالجوں میں برابر لکچر دینے کے لئے بحیثیت مہمان پروفیسر کے بلائے جاتے رہے، ان کے اخلاص کا عالم یہ تھا کہ یورپ کے ممتاز ترین اسکالروں اور اہل علم وتحقیق کی مجلسوں، مذاکروں اور سیمناروں میں ایک معزز ومحترم رکن کی حیثیت سے شامل ہوتے تھے اور دوسرے اوقات میں وہ مسجدوں میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم بھی دیتے تھے ان کو اس کام

میں کوئی حجاب نہیں ہوتا تھا۔

آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و تحقیق، مطالعہ اور افادہ و استفادہ میں گذرتا تھا، عظمت وشہرت کے انتہائی بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گذارتے تھے، تواضع اور انکسار آپ کی فطرت اور آپ کا مزاج تھا، تعلّی وخودنمائی ان کو چھو کر نہیں گئی تھی، لیکن اسلام کی طرف سے جب مدافعت کا مرحلہ آتا تھا تو آپ کا سر سب سے بلند نظر آتا تھا فرانس میں اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنا، علم وتحقیق کے نام پر اسلام کے دامن پر دھبہ ڈالنے کی کوششوں کو برداشت کرنا آپ کے مزاج کے خلاف تھا وہ فوراً سامنے آتے اور اپنی قوت استدلال سے بھرپور کام لیتے اور اس دھبہ کو مٹا کر مطمئن نہیں ہو جاتے تھے بلکہ اسلام کے حقیقی چہرے کو اور روشن وتابناک بنا کر پیش کر دیتے تھے، اسلام پر اعتراض کرنے والے سینکڑوں تھے جن میں عام طور پر شرقیات کے پروفیسر السنہ شرقیہ کے شعبے کے صدر، بڑے قومی اخباروں اور مشہور رسالوں کے مدیر علم وتحقیق کے ممتاز ونمایاں افراد تھے ان کی ہمالیاتی شخصیتوں کی پورے فرانس میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، ان میں سے ہر ایک کے وار کو روکنا اور پلٹ کر وار کرنا صرف ڈاکٹر حمید اللہ جیسا محقق عالم ہی کر سکتا تھا اور انہوں نے کر کے دکھا دیا۔

انکی تصنیفات اور تحقیق وتعلیق سے آراستہ کتابوں کی مجموعی تعداد ۱۶۵ ہے، بلا استثناء انکی ہر کتاب علم وتحقیق کا شاہکار، ذہن وفکر کے سامنے نیا افق روشن کرتی ہے۔

آپ نے فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، وہ ترجمہ فرانس میں اتنا مقبول ہوا کہ ان کی زندگی میں اس کے بیس سے زائد ایڈیشن طبع ہو چکے تھے پورے فرانس میں اسلامیات کا مطالعہ کرنے والے مستشرقین اسی ترجمہ قرآن کو سامنے رکھتے تھے۔

حکومت سعودیہ مدینہ منورہ میں جو قرآن کمپلیکس قائم کر کے دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں قرآن پاک کے تراجم شائع کر رہی ہے، فرانسیسی زبان میں جب ترجمہ قرآن کی تلاش ہوئی تو یہی ڈاکٹر حمید اللہ کا ترجمہ ہو چکا ہے اور شائع ہو چکا ہے۔

آپ کی چوتھی کتاب شائع ہوئی ہے وہ درحقیقت آپ کے اہم ترین تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے، یہ سارے مقالے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی سے متعلق ہیں، یہ کتاب بھی فرانسیسی زبان میں ہے، پیرس میں پہلی بار ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

پانچویں کتاب ''ہم روزہ کیوں رکھتے ہیں؟'' کے نام سے فرانسیسی زبان میں ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شائع کیا گیا ہے، انہوں نے اپنی ایک کتاب میں یہ جائزہ لیا ہے کہ اب تک دنیا کی کتنی زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ ہو چکا ہے اور کب شائع ہوا ہے اور اس کے کتنے ایڈیشن نکلے ہیں یہ کتاب انہوں نے عربی میں لکھی ہے اور استانبول (ترکی) سے شائع ہوئی ہے۔

ایک مستشرق بوسکائی نے صحیح بخاری کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے اس نے ترجمہ میں بہت سی غلطیاں کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ کی ہیں، اس کی غلطیوں کی تصحیح کے سلسلہ میں انہوں نے مستقل ایک کتاب لکھ دی ہے جو فرانسیسی زبان میں ہے اور پیرس (فرانس) سے شائع ہوئی ہے۔

ایک معرکۃ الآرا کتاب ''الوثائق السیاسیۃ'' کے نام سے عربی زبان میں لکھی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور میں جو عہد نامے ہوئے ہیں ان کی تفصیلات ہیں اور ان کی دفعات کی تحقیق وتشریح ہے، چونکہ یہ ڈاکٹر حمید اللہ کا خاص موضوع ہے اور اسی پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے اس لئے یہ کتاب ان کی علمی تحقیق کا شاہکار ہے یہ کتاب بیروت سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کو قدیم مخطوطات سے خصوصی دلچسپی ہے ان کی پرکھ اور جانچ میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، اسی ذہن ومزاج کی وجہ سے آپ نے قدیم علماء اسلام کی کتابوں کے جو مخطوطے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے ان کو تلاش کر کے ان کی تصحیح کی اور تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کر کے شائع کیا ہے ان کتابوں میں ابن تیمیہ کی کتاب الانواء ہے جو حیدر آباد سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

علامہ بلاذری کی مشہور کتاب **انساب الاشراف** جو ناپید تھی اس کا مخطوطہ حاصل کر کے تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے بعد مصر سے ۱۹۵۹ء کو شائع کرایا، قاضی رشید ابن الزبیر کی مشہور کتاب "**الذخائر والتحف**" کو ایڈٹ کیا ہے، یہ کتاب کویت سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی، ابن القیم کی کتاب حقوق الدول فی الاسلام فی احکام اہل الذمۃ کی تحقیق کی اور تعلیق وتحشیہ کے بعد یہ کتاب دمشق سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی، ابوحنیفہ الدینوری کی کتاب النبات کی تحقیق کی اور ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی، قدیم ترین اسلامی مورخ ابن اسحاق کی کتاب **المبدأ والمبعث والمغازی** پر تعلیقات وحواشی لکھے اور اس کی تصحیح کی، یہ کتاب رباط سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی، واقدی کی فتوح الشام اور کتاب الردۃ کو ایڈٹ کیا یہ کتاب پیرس اور بیروت دونوں مقامات سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب **السیر الکبیر** کو بھی اپنی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کر کے حیدرآباد سے ۱۹۸۹ء میں شائع کرایا۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ یعنی اردو میں شائع ہونے والی الاسلامی انسائیکلو پیڈیا میں ۲۲ مادوں (عنوانوں) سے آپ کے علمی وتحقیقاتی مقالے شامل ہوئے شاید پوری انسائکلو پیڈیا میں تنہا کسی ایک محقق عالم کے اتنے مقالے شامل نہیں ہوئے ہوں گے ان کی ۱۶۵ کتابوں میں یہ چند کتابیں ان کے علمی مقام اور تحقیقی ذہن ومزاج کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں، ان کی تصانیف نے ڈاکٹر حمید اللہ کو عالمی شہرت کا مالک بنادیا اور دنیا کے چند ناموراور ممتاز اہل علم وتحقیق میں آپ کا شمار کرادیا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا مستقل قیام تو پیرس (فرانس) میں تھا ایک بڑے ادارہ سے وابستہ تھے لیکن سال میں تین مہینے آپ ترکی میں گذارتے تھے اور جس طرح فرانس کے بڑے اداروں، یونیورسٹیوں، ثقافتی مرکزوں اور ممتاز کالجوں میں لکچر کے لئے بلائے جاتے اسی طرح ہر سال تین مہینے وہ ترکی کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور ثقافتی مرکزوں میں بھی آپ کے لکچر ہوتے تھے۔

چونکہ آپ کو علماء سلف کے قدیم مخطوطات سے خصوصی دلچسپی تھی اور مطالعہ بہت

وسیع تھا اور ترکی میں یہ خزانہ افراط کے ساتھ موجود ہے اس لئے آپ کا زیادہ وقت انہیں لائبریریوں میں گذرتا تھا، بہت سے مخطوطات کے بارے میں لائبریری کے ذمہ داروں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ کون سی کتاب کا مخطوطہ ہے، لائبریرین نے قیاس سے کسی کتاب کا نام لکھ دیا تھا، ڈاکٹر حمید اللہ نے بڑی باریک بینی سے ان مخطوطات کا مطالعہ کر کے ایک قطعی رائے دی کہ یہ فلاں کتاب کا مخطوطہ ہے ''کتاب السنن'' سعید بن منصور کے مخطوطہ کی بھی یہی سرگذشت ہے اس مخطوطہ پر غلط نام پڑا ہوا تھا، کوپریلی (ترکی) کے کتب خانے میں یہ مخطوطہ تھا جب آپ نے قطعی طور پر معلوم کرلیا کہ یہ سعید بن منصور کی کتاب السنن ہے تو اس کی نقل آپ نے مجلس علمی ڈابھیل کو بھجوائی جس کو استاد محترم محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ نے تحقیق اور تحشیہ کے بعد شائع کیا، اس کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر حمید اللہ کا ۱۸ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں آپ نے اس کتاب کی بازیافت کی پوری داستان بھی لکھ دی ہے۔

مخطوطہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ اور محدث اعظمیؒ کے درمیان نونک جھونک ہوگئی تھی، دونوں اہل علم تھے وسیع المطالعہ تھے دونوں اپنے اپنے موقف پر اڑے رہے دونوں طرف سے رسالوں میں مضامین لکھے گئے تھے، یہ قصہ امام عبدالرزاق کی مشہور کتاب المصنف کے سلسلہ میں ہوا، جسے محدث اعظمیؒ نے اپنی تحقیق و تعلیق کے بعد گیارہ جلدوں میں شائع کیا تھا، اس کتاب کے آخر میں ایک عنوان کتاب الجامع ہے جس کو المصنف کا جزء نہیں بلکہ ان کے استاد حضرت معمر کی کتاب الجامع ہے المصنف سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس کو المصنف کا جزء بنانا صحیح نہیں ہے محدث اعظمی نے اپنے موقف کے سلسلہ میں دلائل دیئے ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے استانبول کی لائبریری میں معمر کی کتاب الجامع جزء بنانا صحیح نہیں ہے محدث اعظمی نے اپنے موقف کے سلسلہ میں دلائل دیئے ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے استانبول کی لائبریری میں معمر کی کتاب الجامع کا مخطوطہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور پڑھا ہے یہ وہی کتاب ہے جو تھوڑی کمی بیشی کے ساتھ المصنف میں

شائع کر دی گئی ہے، دونوں طرف سے دو دو مضامین رسالوں میں لکھے گئے، بعد میں ڈاکٹر صاحب نے کسی مصلحت سے خاموشی اختیار کر لی اس کی تفصیل میں نے ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر "کتاب الجامع کا قضیہ" کے عنوان میں دے دی ہے، یہ بحث وہیں دیکھی جاسکتی ہے، ڈاکٹر حمید اللہ قدیم مخطوطات کی تلاش میں پوری دنیا کی سیاحت کرتے رہتے تھے، ترکی کے علاوہ مصر، بغداد، دمشق اور دوسرے اسلامی ملکوں کے علاوہ یورپ کی بڑی لائبریوں میں ان کی تلاش وجستجو برابر جاری رہتی تھی۔

ان تمام عظمت وشہرت، عزت واحترام اور بلند علمی مقام کے باوجود آپ میں نمود ونمائش کا شائبہ تک نہیں تھا، اخلاص ان کی زندگی کا ایک بے بہا جوہر تھا جس کی آب تاب کبھی ماند نہیں پڑتی تھی، ان کی ساری علمی وتحقیقی جدوجہد کا مقصد وحید دین کی خدمت اسلام کی سرخ روئی وسر بلندی تھا وہ اپنی تمام توانائیوں اور علمی صلاحیتوں کو دین کی راہ میں انتہائی اخلاص کے ساتھ صرف کرتے تھے، ان کا اخلاص کھرا سونا تھا جس میں کھوٹ کا کہیں امکان بھی نہیں تھا، جب کوئی ایسا موقعہ آیا جہاں ان کی شخصیت پر نمود ونمائش اور شہرت کا سایہ پڑنے کا احتمال ہوا وہ اس موقعہ سے کتراجاتے تھے، ۱۹۹۴ء میں سعودی حکومت کی جانب سے ملک فیصل عالمی ایوارڈ کے لئے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب پیش نظر ہوا جو عالمی پیمانے پر اسلام کی خدمت میں مصروف ہو تو مجلس انتخاب کی نگاہ ڈاکٹر حمید اللہ پر پڑی اور ان کو اس ایوارڈ کے قبول کرنے کی پیشکش کی گئی، یہ ایوارڈ عالمی شہرت واعزاز کے علاوہ ایک بہت بڑی رقم پر مشتمل تھا، جب ڈاکٹر حمید اللہ سے اس کو قبول کرنے کی درخواست کی گئی تو آپ نے قبول کرنے سے معذرت کر دی اور کہا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ توشہ آخرت سمجھ کر کر رہا ہوں اس کے مقابلہ میں عزت وشہرت کی میری نگاہ میں نہ کوئی وقعت ہے اور نہ بڑی سے بڑی رقم کی کوئی قدر وقیمت اس لئے میں اس ایوارڈ کو قبول کرنے سے معذور ہوں یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ کی عمر ۸۶ برس کی ہو چکی تھی، جو معذوریوں کا دور ہوتا ہے، لیکن آپ کی قوت کارکردگی میں کوئی اضمحلال نہیں آیا تھا ان کا علمی وتحقیقی سلسلہ برابر

جاری رہا۔

جب ان کے بارے میں یہ سنا جاتا ہے کہ اس عمر میں بھی وہ اپنا کھانا خود تیار کرتے ہیں، اپنے کپڑے خود صاف کرتے ہیں، بازار سے سودا سلف خود خرید کر لاتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے، یہ آپ کی کوئی مجبوری نہیں تھی، نوکر گھر میں موجود تھا آپ کا پورا خاندان آپ کے ساتھ رہتا تھا وہ لوگ ان کاموں کو انجام دینے کی خواہش بھی رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنا بار کبھی دوسروں پر نہیں ڈالا یہ آپ کی سادگی اور بے لوثی، اور اپنی قوت کارکردگی کو بحال رکھنے کا ذریعہ تھا، آپ نے اپنا یہ اصول زندگی کبھی نہیں بدلا، یہی معمول نوے سال کی عمر تک رہا یہاں تک کہ آپ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، اس قوت کارکردگی کا راز ان کے باطن میں پوشیدہ تھا وہ راز یہ تھا کہ ان کو اپنے نصب العین کی صداقت پر ایمان کامل اور اس کو حاصل کرنے کے لئے عزم راسخ اور اسی کے تقاضوں کے مطابق صلاح وتقویٰ اور پاکیزہ زندگی میں ان کی ساری توانائیوں کا راز پوشیدہ تھا یہی ان کی قوت کارکردگی کا سرچشمہ تھا۔

ظاہری اسباب میں ان کا یہ طرز زندگی ایک سن رسیدہ عالم کی صحت کے بارے میں ان کے مشاہدہ کے نتیجہ میں تھا، وہ اپنے عہد شباب میں قاہرہ گئے اور جامعہ ازہر کے ایک ممتاز اور بڑے عالم سے ان کی ملاقات ہوئی جن کی عمر ایک سو سال کے حدود میں تھی اس کے باوجود وہ بلا تکلف چلتے پھرتے اور دوڑ دھوپ کرتے کہیں سے ان کی ذات پر درازیٔ عمر کے اثرات نظر نہیں آتے تھے ڈاکٹر حمید اللہ نے ان سے ان کی صحت کا راز پوچھا تو انہوں نے ایک خوبصورت جملہ میں مختصر بات بتائی۔

لنا اعضاء حفظناها فی الصغر فحفظها اللّٰه لنا فی الکبر

ہم نے نوجوانی میں اپنے اعضاء کی حفاظت کی اور ہر طرح کی آلودگیوں سے بچا کر رکھا جس کے صلہ میں خداوند قدوس نے بڑھاپے میں ہمارے اعضاء کو قوت کارکردگی سے محروم نہیں کیا۔

بس وہی تقویٰ وطہارت اور پاکیزہ زندگی ڈاکٹر حمید اللہ نے اختیار کر لی کہ پیرس

جیسے فیشن ایبل اور عریانیت، حسن و جمال کی نمود و نمائش کے طوفانی شہر میں بھی انہوں نے اپنے دامن تقدس وطہارت پر دھبہ نہیں پڑنے دیا اور صلاح وتقویٰ کی زندگی پر ان کا ایمان اور راسخ اور کامل ہوگیا، ان کی صحت، ان کی قوت کارکردگی کی بحالی کا بہ ظاہر یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنی غذا بہت سادہ رکھی، کھانے کے تنوع میں ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، تیس سال سے گوشت کھانا ترک کر دیا تھا دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیاء، انڈے اور پھل ان کی عام غذا تھی اور اس کی تیاری میں بھی ان کے لئے کوئی زحمت نہیں تھی، اسی قوت کارکردگی کا نتیجہ تھا کہ پورے نوے سال کی عمر تک علم و تحقیق کے سلسلہ میں پوری سرگرمی سے کام کیا اور کبھی تکان کا احساس نہیں پیدا ہوا، ڈاکٹر حمید اللہ ۱۹۳۰ء میں بغرض تعلیم پیرس گئے اور ہر طرح کی دلچسپیوں سے یکسو اور محترز رہ کر صرف تعلیم حاصل کرتے رہے اور پوری مدت تعلیم میں انتہائی پاکیزہ زندگی گذاری وہیں سے انہوں نے ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی فل، ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں، اپنا موضوع بھی خالص اسلامی رکھا اور ہمیشہ دینی جذبات سے سرشار رہے معلوم نہیں نوے سال کی عمر تک قوت کارگردگی میں عامل یہی عناصر تھے یا کچھ اور یا یہ صرف خدا داد بات تھی، اس کا فیصلہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا سیرت رسول کا مطالعہ اتنا وسیع اتنا گہرا اور باریک بینی و دقیقہ رسی کے ساتھ تھا کہ ادھر کئی صدیوں میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی سیرت کے موضوع پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور برابر لکھی جارہی ہیں، اور بہت ہی تحقیق اور وسیع مطالعہ کے بعد لکھی جارہی ہیں لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کی وسعت نظر ان سے بھی کچھ اور آگے تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس دور کے تمام مشاہیر اہل علم و تحقیق اور مستشرقین کا تنہا جواب دیا جن کا یورپ ہی نہیں پوری علمی دنیا میں طوطی بول رہا تھا، میں اس سلسلہ میں صرف ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ ڈاکٹر حمید اللہ کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔

تاریخ اسلام کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں عرب کے اندر اور عرب کے باہر کے بادشاہوں، گورنروں حکومت کے نمائندوں قبائل کے سرداروں، عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں کو دعوتی خطوط لکھے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی تھی ڈاکٹر حمید اللہ نے ان خطوط کے سلسلہ میں یہ انکشاف کیا ہے کہ تاریخوں میں سوا دو سو خطوط کا ذکر ہے۔

ان حالات میں اگر کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے کہ آپ نے عرب کے باہر دعوت اسلام نہیں دی دعوتی خطوط مسلمان مؤرخوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، تو آپ کے پاس کیا دلیل ہوگی کہ آپ ثابت کرسکیں کہ حضور نے یہ خطوط لکھے تھے، آپ بخاری و مسلم یا صحاح ستہ کا حوالہ دے کر اس کو خاموش نہیں کرسکتے کیوں کہ وہ ان کو مانتا ہی نہیں، مستشرقین کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ محمد رسول اللہ صرف عرب کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ عرب کے باہر کی اصلاح کیسے ہو، اور ان کو اسلام کی دعوت کیسے دی جائے وہ کہتے ہیں کہ جب کچھ عیسائی مسلمان ہوگئے تو انہوں نے بتایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دوسرے ملکوں میں دین کی دعوت کے لئے بھیجا تھا، یہ سن کر محمد عربی کو بھی یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ میں بھی باہر کے ملکوں کو دعوت اسلام دوں لیکن یہ ان کی زندگی کا آخری دور تھا اس لئے عرب کے باہر کہیں بھی ان کی آواز سنائی نہیں دی اس لئے دعوتی خطوط کا افسانہ بعد کے مسلمان مورخوں کا گھڑا ہوا افسانہ ہے تا کہ اپنے نبی کا درجہ وہ اونچا کرسکیں۔

اگر ایک بھی اصل خط دریافت ہو جائے اور قطعی دلائل سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ وہی خط ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے باہر کسی سربراہ کو بھیجا تھا تو مستشرقین کا بنایا ہوا یہ ہوائی قلعہ ہواؤں میں اڑ جائے گا، اتفاق سے ایک ایسا موقعہ آگیا اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اس معرکہ کو سر کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط ایک فرانسیسی مستشرق موسیو بارتل می نے دریافت کیا وہ ۱۸۵۱ء میں مصر میں قبطی زبان کی تحقیق کے سلسلہ میں کام کررہا تھا وہ قدیم قبطی مخطوطات کی تلاش میں مصر کے ایک علاقہ اخمیم کے قدیم گرجا گھر میں پہنچا

اس کو بہت محفوظ حالت میں لپٹی ہوئی ایک دستاویز پیش کی گئی اس نے اس کو قبطی زبان کا کوئی مخطوطہ سمجھا مگر اس کو پڑھ نہ سکا تو اس نے ایک دوست موسیو بے لین سے پڑھنے کی درخواست کی اس نے بڑی مشکلوں سے اس کو پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ قبطی زبان کا نہیں عربی زبان کا مخطوطہ مکتوب نبوی ہے جو اس گرجا کے بڑے پادری مقوقس کے نام بھیجا گیا تھا، یہ خط ایک جھلی پر تھا، موسیو بارتیل می نے اس خط کو ترکی خلیفہ سلطان عبدالمجید خان کے ہاتھ تین سو اشرفیوں میں فروخت کردیا پھر وہ خط تبرکات نبوی کے طور پر خزانہ شاہی میں محفوظ کر دیا گیا، اس کا چربہ لے کر اس زمانہ میں اخباروں میں شائع کر دیا گیا تھا، پچاس پچپن برس بعد جرجی زیدان نے ۱۹۰۴ء میں اس کا چربہ لے کر اپنے رسالہ الہلال میں شائع کیا تھا، یہ خط اخمیم گرجا گھر کے بڑے پادری مقوقس کے نام تھا جس کا اسلامی تاریخوں میں ذکر آتا ہے، اس دور کے مستشرقین نے اس خط کو جعلی ثابت کرنے پر پورا زور قلم صرف کیا تھا۔

پھر اتفاق سے ۱۹۳۸ء میں وہ خط بھی دریافت کر لیا گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو بھیجا تھا، ڈاکٹر حمید اللہ کو اس خط کے ملنے کی اطلاع آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگلیوث نے دی ڈاکٹر حمید اللہ نے اس خط کو دیکھا اور ماہرین سے اس کے بارے میں رائیں معلوم کیں، حسب روایت اس دور کے مستشرقین نے اس خط کو جعلی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی، اور ہر ایک نے اپنے اپنے دلائل دیئے، فرانس، کے رسالوں اور اخباروں میں بہت دنوں تک یہ بحث چلتی رہی، ڈاکٹر حمید اللہ ان مضامین کو پڑھتے رہے، اور ان نامور مستشرقین کے مبلغ علم کا اندازہ کرتے رہے۔

۱۸۵۱ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک مقوقس، منذر بن ساریٰ گورنر بحرین، اور نجاشی شاہ حبشہ کے نام بھیجے گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں دعوتی خطوط کی اصل دریافت ہوگئی، یہ بڑا دھما کہ خیز انکشاف تھا، تمام مستشرقین، یورپین یونیورسٹیوں کے السنہ شرقیہ شعبے کے صدور، برٹش میوزیم کے ماہرین نے مکتوب نبوی کے جعلی ہونے

کے سلسلہ میں دلائل کا انبار لگا دیا، ان تینوں دریافت شدہ خطوط کے سلسلہ میں جن مستشرقین نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی رائیں دیں ہر ایک نے بلا استثناء ان خطوط کو جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس کو مسلم حکومتوں سے رقم حاصل کرنے کا ڈھکوسلہ قرار دیا اس طرح یہ بحث ۱۸۵۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۴ء تک چلتی رہی، جن مستشرقین نے اس بحث میں حصہ لیا ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) یہودی النسل مستشرقہ درجینیا واکا (اٹلی)

(۲) جرمن مستشرق پروفیسر ڈاکٹر بیکر متوفی ۱۹۳۳ء۔

(۳) یہودی النسل مستشرق موسیو وائٹ پروفیسر السنہ شرقیہ پیرس یونیورسٹی (فرانس)

(۴) یہودی النسل جرمن مستشرق پروفیسر نویلدیکی۔

(۵) مشہور مصنف مستشرق کائتانی متوفی ۱۹۳۵ء

(۶) موسیو بارٹیل می فرانسیسی مستشرق مقیم مصر۔

(۷) فرانسیسی مستشرق موسیو رینے نو (پیرس) ایک فرنچ رسالہ کا ایڈیٹر موسیو بےلین (فرانس)

(۹) فروفیسر ماگولیوث آکسفورڈ یونیورسٹی۔

(۱۰) ڈاکٹر پادل کا صدر شعبہ مشرقیات۔ (جرمنی)

(۱۱) مسٹر فلائشر ایک فرنچ رسالہ کا ایڈیٹر۔

(۱۲) پروفیسر بروک ماؤسن۔

(۱۳) مسٹر پول مصنف ''سیرۃ محمدیہ'' (سویڈن)

(۱۴) مسٹر ڈفلاپ (اسکاٹ لینڈ)

مذکورہ بالا مستشرقین نے اخباروں اور رسالوں میں مضامین شائع کیے اور خط کو جعلی ہونے کے بارے میں اپنی قطعی رائے کا اظہار کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے جو دلائل دیئے ان کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے۔

۱-پیغمبر اسلام نے عرب کے باہر دعوتی خطوط بھیجے ہی نہیں آپ خود کو عالمگیری نبی نہیں سمجھتے تھے جب کچھ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے کا ذکر کیا تو مسلمانوں نے اپنے نبی کے بارے میں یہ قصہ گھڑ لیا کہ آپ نے شاہان عالم کو دعوتی خطوط ارسال فرمائے تھے۔

۲- برٹش میوزیم کے ماہرین نے اس جھلی کو جس پر خط لکھا ہوا تھا تیرہ سو سال پرانی ہونے سے انکار کر دیا ہے، یہ بعد کے کسی زمانے میں جعلی خط بنایا گیا ہے۔

۳-سیرۃ ابن ہشام میں جہاں مکتوبات نبوی بھیجے جانے کا ذکر ہے وہاں ابتداء میں ابن اسحاق کا نام نہیں ہے جب کہ سیرۃ ابن ہشام ابن اسحاق کی کتاب کی تہذیب ہے ابن اسحاق کی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ہے اس لئے معلوم ہوا کہ یہ روایت ابن ہشام کے زمانے کی گھڑی ہوئی ہے۔

۴-قرآن کے جو قدیم نسخے اب تک دریافت ہوئے ہیں ان سے اس مکتوب کا خط کافی مختلف ہے۔

۵-آج کل جعلی چیزیں پرانی کہہ کر بیچی جارہی ہیں مگر وہ حقیقتاً جعلی ہوتی ہیں یہی حال اس خط کا بھی ہے جعلساز نے مالی منفعت کے لئے یہ ہوا اڑا دی ہے۔

۶-اس خط کا متن جو عربی تاریخوں میں ہے اس میں اور اس جھلی والے خط کی عبارت میں خاصا فرق ہے۔

یہ اعتراضات نجاشی کے نام ۱۹۳۸ء میں پائے جانے والے مکتوب نبوی کے سلسلہ میں ہیں، احادیث میں ہرقل کے نام دعوتی مکتوب ارسال فرمانے کا ذکر مفصل ہے مسلمان مورخین نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے مستشرقین اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ بالکل بے بنیاد دعویٰ ہے مختصر طور پر مستشرقین کے دلائل اور خاص طور پر مسٹر کائتانی کے درج ذیل اعتراضات ہیں۔

۱- مسلمان مورخین کا بیان ہے کہ پیغمبر اسلام نے دعوتی خطوط ۶ ھ کے بالکل آخر میں بھیجے ہیں، پھر وہی مورخین لکھتے ہیں کہ خط لے جانے والے دحیہ کلبیؓ پر

واپسی میں جوڑا کہ پڑا تھا وہ وسط ۶ ھ کا واقعہ ہے، سال کے آخر میں روانگی اور وسط سال میں واپسی ایک مضحکہ خیز مغالطہ ہے، سچی بات یہ ہے کہ دحیہ کلبی خط لے کر گئے ہی نہیں تھے، یہ سب افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

۲- مسلم مورخین دحیہ کلبی کے شام ہرقل کے پاس خط لے جانے کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ان کو خیبر کی مہم میں شریک بھی بتاتے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے اس سفر میں کم سے کم دو ماہ کی ضرورت ہے، کیوں کہ ذی الحجہ میں ان کا سفر بتاتے ہیں اور محرم میں خیبر کی مہم پیش آئی ہے اتنی کم مدت میں ہرقل کے پاس بیت المقدس جانا اور واپس آنا ممکن ہی نہیں تھا۔

۳- مسلمان مؤرخین کہتے ہیں کہ دحیہ کلبی نے بیت المقدس میں قیصر سے ملاقات کی جب کہ ایرانیوں سے صلیب کی واپسی پر جوجشن منایا جارہا تھا اس میں شرکت کے لئے آیا تھا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس میں قیصر کی آمد ۶۲۹ء یعنی ۷ ھ کے آخر میں ہوئی اس لئے پورا واقعہ ہی غلط ہے۔

۴- سیرۃ ابن ہشام درحقیقت ابن اسحاق کی کتاب کی جدید ترتیب وتہذیب ہے ابن ہشام کی خود تصنیف نہیں اور ابن اسحاق کی اصل کتاب میں سفارتوں اور خطوط لیجانے والوں کا ذکر نہیں ہے، شاید اسی وجہ سے ابن ہشام نے روایت کی ابتداء میں ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے، سفارت کا واقعہ ابن ہشام نے گھڑ لیا ہے۔

۵- پانچواں اعتراض یہ ہے کہ سفیروں کی روانگی ایک اہم ترین واقعہ ہے، اتنے اہم واقعہ کا ذکر عربی تاریخوں اور حدیث کی کتابوں میں صرف ایک ابن عباس سے منقول ہے دیگر صحابہ کے بیانات بالکل مفقود ہیں۔

یہ وہ اشکالات ہیں جن کی بنیاد پر مستشرقین ان کے نام خط بھیجنے کا انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بعد کے دور میں مسلمان مورخین نے ان سفارتوں اور دعوتی خطوط کا افسانہ لکھ کر تاریخوں اور حدیث کی کتابوں میں شامل کر دیا ہے، واقعاتی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

یہ داستان شروع ہوتی ہے ۱۸۵۱ء سے جب دو خطوط مقوقس اور منذر بن ساریٰ کے نام کے دریافت ہوئے اس دور کے مستشرقین نے ان کو جعلی ثابت کرنے پر اپنی صلاحیتیں لگا دیں، تیسرا خط نجاشی کے نام تھا وہ بیسویں صدی یعنی ۱۹۳۸ء میں دریافت شدہ مکتوبات نبوی پر ایک ساتھ گفتگو اور بحث کا آغاز ہوا اور یورپ کی تمام بڑی یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو مشرقی علوم کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے بالخصوص جو یہودی النسل تھے انہوں نے اس بحث میں بڑے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا، انگریزی اور فرنچ زبانوں کے اخبارات ورسائل میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے، جہاں جہاں ڈاکٹر حمید اللہ اپنے موضوع پر لکچر دینے کے لئے گئے وہاں وہاں یہ مسئلہ چھیڑا گیا، دنیائے اسلام ان تمام مباحث سے ایک دم بے خبر رہی، تنہا ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے وسعت مطالعہ کی بنیاد پر مستشرقین کے سارے اعتراضات اور شکوک وشبہات کو اتنے مضبوط دلائل وشواہد سے رد کیا کہ بعد میں کئی ممتاز مستشرقین نے ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات سے اتفاق کیا، جوابات تو اصل کتاب ہی میں دیکھنے سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا یہاں تو صرف اس کی ایک معمولی سی جھلک ہی پیش کی جاسکتی ہے۔

مستشرقین کے اعتراضات علمی اور تاریخی اعتبار سے بظاہر وزن دار نظر آتے ہیں اس لئے ان کے شکوک وشبہات میں اتنا وزن تو ضرور تھا کہ جن لوگوں کا اسلامیات کا مطالعہ ناقص ہے وہ آسانی سے گمراہ ہوسکتے ہیں اور مستشرقین کی ہم نوائی کر سکتے ہیں مگر ڈاکٹر حمید اللہ نے ثابت کر دیا کہ یہ سب فریب نظر ہے، مغالطہ ہے، اور اسلامیات کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر حمید اللہ نے ان سارے اعتراضات کے تحقیقی جوابات دیئے اعتراضات کی ترتیب سے جوابات کے خلاصے میں آپ کے سامنے پیش کرر ہا ہوں تفصیل تو اصل کتاب ہی میں دی جاسکتی ہے۔

۱- یہ غلط ہے کہ پیغمبر اسلام اپنے کو صرف عرب کا نبی سمجھتے تھے، قرآن میں تو متعدد مقامات پر آپ کو سارے عالم کے لئے نبی بنا کر بھیجے جانے کا غیر مبہم لفظوں میں

ذکر ہے عیسائیوں کے قبول اسلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو دوسرے ملکوں میں بھیجے جانے کا ذکر بے محل اور فضول ہے عیسیٰ علیہ السلام نے تو خود کہا ہے کہ میں صرف بنی اسرائیل کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں کہیں فرمایا کہ میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے بھیجا گیا ہوں حواریوں کو دوسرے ملکوں میں تبلیغ کے لئے عیسیٰ علیہ السلام کا بھیجنا یہ عیسائیوں کے توہمات اور خرافات ہیں ان توہمات وخرافات سے پیغمبر اسلام پر اعتراضات لغو ہیں۔

دفترِ شکوۂ غم پھینک دو رستے میں کہیں
ان کی محفل میں کہاں لے کے خرافات چلے

۲- برٹش میوزیم کے ماہرین نے خط کی جھلی کو تیرہ سو سال پرانی ماننے سے انکار کیا ہے انہوں نے عہد رسالت میں جو جھلی استعمال ہوتی تھی اس کو کب اور کہاں دیکھا کہ اس جھلی کو دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ یہ عہد رسالت کی جھلی نہیں معلوم ہوتی، دوسرے آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو یہی جھلی دکھائی جائے تو وہ اس کے برعکس رائے دیں گے، یہ ماہرین صرف قیاس آرائی کرتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، ایک چیز کو ایک ماہر سو برس کی کہے گا تو دوسرا ماہر فن اس کو ایک ہزار برس کی بتا دے گا، ماہرین کے آپس کے اختلافات ہر شخص جانتا ہے جس کو علم آثارِ قدیمہ سے ادنیٰ سا بھی مس ہو، یہ ایک فضول سی دلیل ہے۔

۳- ابن ہشام نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اگر ابتدا میں ابن اسحاق کا نام نہیں لکھا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے درمیان میں کئی بار ابن اسحاق کا نام آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ ابن اسحاق ہی کا قول ہے اور جن خطوط کا ابن ہشام نے اپنے طور سے اضافہ کیا ہے انہوں نے خود اس کی صراحت کر دی ہے کہ فلاں فلاں مکتوبات میرا اضافہ ہے اس لئے یہ اعتراض تاریخ کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

۴- اگر مکتوب نبوی کا خط قرآن کے خط سے جداگانہ ہے تو اس پر حرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن کا خط اہتمام سے

آرائش کے ساتھ لکھا جاتا ہے خط کی حیثیت سرکاری مراسلات کی ہوتی ہے اس کا خط ہمیشہ جداگانہ ہوتا ہے، آپ نے عہد نبوی کا قرآن لکھا ہوا دیکھا کہاں؟ بعد کے دور کے لکھے ہوئے قرآن کے خط سے تقابل نادانی ہے، تقابل عہد رسالت کی تحریر سے کیا جانا چاہئے تھا۔

یہ دلیل بھی بچکانہ ہے اگر جعلسازی کا بازار گرم ہے تو بلا سوچے سمجھے ہر چیز کو جعلی قرار دینا کہاں کی عقلمندی ہے، ہوسکتا ہے کہ جعلی نہ ہو، خود اس شے کو دیکھ کر اور پرکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، دریافت شدہ خط کو سامنے رکھ کر غائر مطالعہ کے بعد دلائل کی روشنی میں فیصلہ کیا جاتا تو قابل توجہ ہوتا یہ تو احمقوں کی بات ہے کہ دودھ سے جل چکے ہوں تو چھاچھ بھی پھونک کر پینا شروع کردیں۔

٦- یہ اعتراض یقیناً قابل توجہ ہے کہ جھلی والے خط میں جو عبارت ہے وہ اسلامی تاریخوں سے بہت کچھ مختلف ہے نجاشی والے خط میں یہ عبارت ہے کہ میں تمہارے پاس اپنے چچا زاد بھائی اور چند مسلمانوں کو بھیج رہا ہوں وہ تمہارے پاس جائیں تو ان سے حسن سلوک کرنا، یہ عبارت بتاتی ہے کہ دعوتی خطوط سے ۱۴ برس پہلے ۵ نبوی میں لکھا گیا اور مدینہ کے بجائے مکہ سے لکھا گیا ہے جب کہ تمام مورخین متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ دعوتی خطوط صلح حدیبیہ کے بعد ٦ ھ کے آخر میں یعنی ۱۴ سال بعد لکھے گئے ہیں۔

یہ طبری کی روایت ہے جس میں نجاشی کے نام والے خط میں یہ عبارت ہے لیکن سیرۃ حلبیہ میں جو خط کا متن ہے اس میں یہ جملہ نہیں ہے، اسی طرح ابن الاثیر نے جو متن دیا ہے اس میں بھی یہ عبارت نہیں ہے، معلوم ہوا کہ طبری کی متن میں دو الگ الگ خطوں کی عبارت کو ایک خط کی شکل میں نقل کردیا گیا ہے، اصل یہ ہے کہ یہ دو خطوط ہیں، بعد والا خط یقیناً تبلیغی خط تھا جو ٦ ھ میں لکھا گیا اور ٹھیک وہی متن ہے جو اس دریافت شدہ جھلی والے خط کا متن ہے، یہ دریافت شدہ خط ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ اصل مکتوب نبوی ہے اس میں کوئی جعل اور فریب نہیں ہے کیونکہ اگر

جعلسازی ہوتی تو تاریخ سے وہی عبارت نقل کی جاتی جس میں مسلمانوں کے حبشہ جانے کا ذکر ہے اور جب یہ ذکر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ٦ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو جو خطوط بھیجے تھے انہیں میں یہ نجاشی کا اصلی خط ہے جو اس وقت دریافت ہوا ہے مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات دینے کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ نے اس خط کے مکتوب نبوی ہونے کے جو قرائن پائے جاتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے آپ نے تحریر کیا کہ اس خط کے اصل ہونے میں جن باتوں سے مدد ملتی ہے ہمارے دوستوں نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے جب کہ سب سے زیادہ توجہ کی یہی باتیں مستحق تھیں مثلاً ۱۹۳۸ء میں دریافت شدہ نجاشی کے نام والے خط میں ٹھیک وہی مہر ہے جو سو سال پہلے مقوقس اور منذر بن ساری کے نام دریافت شدہ خطوں میں تھی، دونوں میں ذرا بھی فرق نہیں، اگر جعلسازی ہوتی تو مہر کی یکسانیت ممکن نہ تھی اگر آپ کہیں کہ دونوں خطوط ایک ہی جعلساز کی کارستانی ہے تو ایک صدی کا فاصلہ آپ کے دعویٰ کو خود باطل کر دے گا اور پھر دونوں خطوں کی تحریر میں بھی اختلاف ہے، اور پھر دونوں خطوط کی دستیابی کے مقامات ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔

دوسری بات خود جھلی کی تحریر ہے، اس میں نقطے اور اعراب بالکل نہیں ہیں جب کہ پہلی صدی ہجری میں اس کا رواج ہو چکا تھا، عہد رسالت میں اس کا رواج نہیں تھا، اس لئے یہ تحریر خود شہادت دیتی ہے کہ وہ عہد رسالت کی ہے۔

عہد رسالت کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک لفظ کا آدھا حصہ اوپر کی سطر میں اور آدھا حصہ دوسری سطر میں جیسے رسول کا لفظ ہے اوپر کی سطر میں ”رسو“ لکھا اور ”ل“ دوسری سطر میں لکھا گیا، جھلی والے خط میں بالکل اسی کے مطابق تحریر ہے ۱۹۳۱ء میں مصر میں حضرت عثمانؓ کا قرآن دریافت ہوا ہے اس میں بھی تحریر کا یہی انداز ہے، بعد کے دور میں یہ انداز قطعاً ترک کر دیا گیا معلوم ہوا کہ یہ صرف عہد رسالت میں عام طور سے مروج تھا بالکل وہی طریقہ تحریر اس جھلی والے خط میں بھی استعمال کیا گیا، رسم الخط میں بھی عہد رسالت اور اس جھلی والے خط میں پوری مماثلت ہے، جمع کا

الف اس وقت نہیں لکھا جاتا تھا حرف ت کے دو شوشے ہوتے تھے، اس دور کے بعض الفاظ آج بھی قرآن میں اسی رسم الخط کے مطابق ہیں، ان باتوں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جھلی والا خط عہد رسالت کا لکھا ہوا ہے عہد رسالت اس کے قریبی زمانے میں میم سطر کے نیچے کے بجائے اوپر لکھا جاتا تھا اور ''لا'' کو ''ع'' کے مشابہ لکھا جاتا تھا، یہی رسم الخط مقوقس، منذر اور نجاشی کے خطوط میں بھی ہے، اس لئے ان تینوں خطوط کو عہد رسالت کا تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور آخری بات یہ ہے کہ خط جس جگہ سے اور جن حالات میں دستیاب ہوا ہے وہ ہر طرح کے شکوک وشبہات سے بالاتر ہے، کیوں کہ ان کو وہیں ہونا ہی چاہئے تھا۔

اب تک ۱۹۳۸ء میں دریافت شدہ نجاشی کے خط کے اصلی ہونے کے دلائل دیئے گئے، مقوقس اور منذر کے خطوں کا ذکر پہلے آچکا ہے اب صرف ایک خط جو شاہ روم ہرقل کے نام ہے جس کا تاریخ کے علاوہ بخاری وغیرہ میں مفصل ذکر ہے مستشرقین اس خط ہی سے انکار کرتے ہیں، اب اس سلسلہ کے دلائل انتہائی اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے چونکہ مکتوبات نبوی کے سلسلہ میں اتنا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے کہ شاید تاریخ میں کوئی شخص ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، انہوں نے تاریخ کی کتابوں سے سوا دوسو خطوط کا پتہ چلایا ہے جب کہ عام علماء اور مورخین چند خطوط کے ذکر سے آگے نہیں بڑھتے ہیں، اس لئے مستشرقین کا جواب خالص علمی وتحقیقی انداز میں دیتے ہیں اور مسکت جواب دیتے ہیں، مستشرقین کا عام رجحان یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص عرب کا ایک مصلح اور ریفارمر کی حیثیت سے ذکر کریں، ساری دنیا کے لئے ان کو رسول اور پیغمبر ہونے کے دعویٰ کو باطل قرار دیں اسی خیال اور جذبے کی وجہ سے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط بھیجنے کا وہ حتی الامکان انکار کرتے ہیں قیصر روم ہرقل کے نام کے خط کا ذکر اور اس کا متن اسلامی تاریخوں اور حدیثوں میں موجود ہے مگر مستشرقین کہتے ہیں کہ یہ صرف افسانہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں،

ہرقل کے نام نہ کوئی خط بھیجا گیا نہ اس کے پاس پیغمبر اسلام کا کوئی سفیر گیا، میں ان کے شکوک وشبہات اور دلائل کا ذکر اجمالاً کر چکا ہوں اب سلسلہ وار ان کے جوابات ڈاکٹر حمید اللہ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں سارے مستشرقین کے خیالات کی ترجمانی مشہور مصنف کائتانی نے اپنی کتاب میں کی ہے اس لئے اسی کے اعتراضات کے یہ جوابات ہیں۔

۱- کائتانی نے کہا تھا کہ دحیہ کلبی پیغمبر اسلام کا خط لے کر ٦ ھ کے آخر میں جاتے ہیں اور وہاں سے واپسی میں ان پر ڈاکہ پڑنے کو وسط ٦ ھ کا واقعہ بتاتے ہیں دونوں میں تضاد ہے ڈاکٹر حمید اللہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت دحیہ کلبی کے خط لیجانے اور ان پر ڈاکہ پڑنے کا واقعہ جن مورخین کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے ان میں کہیں بھی ڈاکہ کا وقت اور تاریخ نہیں بتائی گئی ہے صرف طبری نے واقدی کی روایت سے ٦ ھ کے وسط کا ذکر کیا ہے، ظاہر ہے کہ واقدی کی روایت حجت نہیں ہوسکتی اور نہ طبری نے اس کو حجت مانا ہے یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر طبری نے پھر دوبارہ اپنے موقعہ پر اس کا ذکر کیا ہے جو ٦ ھ کے بعد کا وقت ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں بعض مورخین کو غلط فہمی ہوئی ہے واقعہ کی تمام جزئیات کا علم ان کو نہیں ہوسکا، اصل واقعہ مستند تاریخوں میں یہ ہے کہ حضرت دحیہ کلبیؓ ٦ ھ کے آخر میں ذی قعدہ یا ذی الحجہ ٦ میں ہرقل کا خط لے کر چلے جاتے ہوئے تین دن کی مسافت پر قبیلہ خذام کے کچھ لوگوں نے ڈاکہ ڈالا کیوں کہ ان کے ساتھ کچھ مال تجارت بھی تھا، اس قبیلہ میں کچھ لوگ مسلمان ہو چکے تھے ان کو خبر ملی تو وہ دوڑ کر آئے اور حضرت دحیہؓ کا مال واپس کرایا حضرت دحیہ آگے جانے کے بجائے مدینہ لوٹ آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ساری تفصیلات بیان کیں آپ نے قبیلہ خذام کی سرکوبی کے لئے ایک مہم بھیجی، جس نے وہاں جا کر ان کو پوری سزا دی حضرت دحیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیبر کی مہم میں چلے گئے، کیونکہ حضور پابہ رکاب تھے، خیبر کی فتح کے بعد آپ ہرقل کے نام کا خط لے کر دوبارہ سفر پر گئے، اس تفصیل

سے مستشرقین کا وہ اعتراض بھی ختم ہو گیا کہ حضرت دحیہ شام گئے اور واپس بھی آ کر خیبر کی جنگ میں شریک ہوئے یہ ناممکن ہے، اس تفصیل نے یہ گرہ بھی کھول دی۔

۲- دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اسلامی سفیر نے بیت المقدس میں قیصر سے ملاقات کی جب وہ صلیب کی واپسی کے جشن میں شرکت کے لئے وہاں آیا ہوا تھا حالانکہ قیصر ۶۲۹ء یعنی ۷ھ کے آخر میں بیت المقدس آیا ہے اس لئے سفیر ۷ھ کی ابتداء میں قیصر سے کیسے مل سکا، ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں کہا کہ قیصر کی بیت المقدس آمد ۶۲۹ء یونانی مورخ تیوقان نے بیان کی ہے مگر دوسرا مورخ نقیفور نے کہا ہے کہ قیصر ۶۲۸ء میں بیت المقدس آیا تھا، اسی کی تائید وہاں کے گرجا گھر کی ایک یادداشت سے بھی ہوتی ہے اور یہ ۷ھ کی ابتداء کا زمانہ ہے، جب حضرت دحیہ شام پہنچے ہیں اس لئے یہ اعتراض لغو ہے۔

۳- یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ ابن ہشام نے ان سفارتوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے جب کہ ابن اسحاق نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، یعنی ابن ہشام کا اپنی طرف سے اضافہ ہے جس کا اصل کتاب میں وجود ہی نہیں، کیونکہ تنہا ابن ہشام ہی نے نہیں طبری، بیہقی، اور قلقشندی سب نے ان خطوط کے متن کو ابن اسحاق ہی کی تاریخ سے لیا ہے سب نے اسی کا حوالہ دیا ہے معلوم ہوا کہ ابن اسحاق کے یہاں یہ متن موجود ہے۔

۴- ایک اہم اور بڑا اعتراض کائتانی کا یہ بھی تھا کہ ہرقل کے پاس سفارت بھیجنے کا واقعہ عہد رسالت کا اہم ترین واقعہ تھا لیکن اتنے اہم واقعہ کو صرف ابن عباس بیان کرتے ہیں اور دوسرا کوئی صحابی اس کو نہیں بیان کرتا، معلوم ہوا کہ سفارت کا واقعہ ہی غلط ہے ورنہ بہت سے صحابہ اس کو بیان کرتے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے کہا کہ یہ اسلام کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے، علامہ بلاذری اور احمد بن حنبل نے قیصر کی سفارت کا واقعہ حضرت انسؓ بن مالک کی روایت سے بیان کیا ہے، کنز العمال میں یہ حضرت خالد بن سعید بن العاص سے بھی مروی ہے طبرانی میں تو

خود دحیہ کلبی ہی کی روایت موجود ہے یہ کیسے کہہ دیا گیا کہ تنہا ابن عباس نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔

میں نے انتہائی اختصار کے ساتھ ڈاکٹر حمید اللہ کے جوابات سے آپ کو روشناس کرایا اصل بحث اور تفصیل ان کی کتاب ہی میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اعتراضات کے جواب کے بعد خود اپنی طرف سے دعوتی خطوط بھیجے جانے کے اور بھی دلائل وشواہد پیش کئے ہیں جو مستشرقین کو لاجواب کرنے کے لئے کافی ہیں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ قیصر کی حکومت میں وقائع نگاری ہوتی تھی مگر وقائع نگاروں نے مکتوب نبوی کے پہنچنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض اسباب کی بنا پر وقائع نگاری میں ایک صدی کا فصل ہو گیا اس دوران وقائع نگاری موقوف رہی اور یہ وہی زمانہ ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتی خطوط بھیجے ہیں اسی وجہ سے بیزنطینی حکومت کے ریکارڈ میں اس کا ذکر نہیں ہے، صرف جنگ موتہ کا ذکر پایا جاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی۔

مسلمانوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد امام بخاری ہیں، انہوں نے صحیح بخاری میں ہرقل کے نام دعوتی خط بھیجنے کا مفصل ذکر کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ حضرت دحیہ کلبیؓ کو ہرقل کے پاس نہیں، بلکہ اس کے نمائندہ بُصریٰ کے گورنر کے پاس بھیجا گیا تھا، ان کو ہرقل سے ملنے کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا تھا، گورنر بصریٰ نے یہ خط ہرقل کو پہنچایا ہے، یہ صداقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ بعد کے دور میں بھی ہرقل کے نام جو خط بھیجا گیا تھا اس کا مسلسل پتہ چلتا ہے یہ خط ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہا ہے اس سلسلہ میں کچھ تاریخی شواہد پیش ہیں پیغمبر اسلام کا دعوتی خط ہرقل کے نام کا عرصہ دراز تک موجود رہا اس کی سب سے پہلی شہادت چھٹی صدی ہجری کے مراکشی مورخ سہیلی نے چشم دید گواہوں کی شہادت پر یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کے زمانے میں اسپین (قسطنطنیہ) کے حکمران انفانسو نے جس کے قبضہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بنام ہرقل تھا ایک

مسلمان سپہ سالار عبدالملک بن سعید کو دکھایا تھا، اسفانسو کی موت کے بعد یہ نامۂ مبارک اس کے نواسے کو وراثت میں ملا۔

اس واقعہ سے ایک صدی بعد علامہ عینی کہتے ہیں کہ سلطان قلاؤون حاکم مصر نے اسپین کے عیسائی بادشاہ کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی اس بادشاہ نے سلطان قلاؤون کے سفیر سیف الدین تیج کو نامہ مبارک دکھایا تھا یہ سفارت ۶۸۲ھ میں بھیجی گئی تھی۔

ایک اور شہادت ابن فضل اللہ العمری متوفی ۷۴۸ کی ہے انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ خود شاہ اسپین نے جو ہرقل کی اولاد میں سے ہے مجھ سے بتایا کہ نامۂ نبوی اس وقت بھی شاہی خزانے میں محفوظ ہے۔

مراکشی امیر اور عالم شیخ عبدالحیٔ کتانی کی کتاب میں کئی مقامات پر اس خط کا ذکر آیا ہے انہوں نے خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ھ) کی کتاب شرح شفا جلد سوم صفحہ ۱۷۴ کے حوالے سے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اب تک اسپین کے بادشاہوں کے پاس موجود ہے، وہ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں اور سنہری صندوق میں بحفاظت رکھتے ہیں اور نسلاً بعد نسل اس کی نگہداشت کی وصیت کرتے آتے ہیں۔

اسی طرح مراکش کے ایک اور مشہور مصنف شیخ ابو روس بن احمد بن ناصر الراشدی العسکری متوفی ۱۲۳۸ھ کی کتاب الخبر المعرب من الامر المغرب الحال بالاندلس وثغور المغرب میں بھی اس خط کے وجود کا ذکر موجود ہے، شیخ کتانی نے چند اور مسلمان مصنّفین کے حوالے دیئے ہیں، جنہوں نے اس خط کی موجودگی کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بحث کو تمام کرتے ہوئے لکھا ہے ان ثبوتوں اور شہادتوں کے بعد اب شاید کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیزنطینی شہنشاہ ہرقل کو تبلیغی خط لکھنا ناممکن نہیں ہے، بلکہ حالات اس کی تائید ہی میں ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے جوابات کی گہرائی اور گیرائی سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ان کی نظر کتنی وسیع اور ان کا مطالعہ کتنا ہمہ گیر تھا، نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں

ان کی ذہنی رفتار کتنی تیز تھی، اسی بھر پور اور ہمہ جہتی صلاحیتوں کی بنیاد پر عالم اسلام میں ان کو عظمت واحترام حاصل ہوا اور ان کے اخلاص نے فرانس والوں کے دلوں میں ان کیلئے ادب واحترام کا ایک نرم گوشہ پیدا کر لیا تھا اسلئے ان کی باتیں سنجیدگی اور توجہ سے سنی جاتی تھیں اور بسا اوقات ان کے دل اس کی صداقت پر ایمان لے آتے تھے۔

یورپ میں دین کی دعوت کچھ آسان نہیں، یہ راہ تھوڑی بہت اس وقت آسان ہوسکتی ہے جب علمی و تحقیقی مباحث میں وہاں کے دانشوروں کی زبان کو دلائل سے بند کر دیا جائے، ڈاکٹر حمید اللہ کی ساری علمی جدوجہد میں یہی دعوت دین کا مخلصانہ جذبہ کارفرما تھا انہوں نے اپنے علم وفضل کو نمائش کی چیز نہیں بنایا اور نہ اس کے ذریعہ عزت ومنصب حاصل کرنے کی کوشش کی، فرانس کے اعلیٰ طبقہ میں سرخ روئی اور سربلندی حاصل کرنا ان کے پیش نظر تھا ہی نہیں، دولت وثروت اور اعزاز ومنصب کی ہوس کو تو وہ نہایت حقارت کے ساتھ پاؤں سے روند چکے تھے، وہ صرف اپنے علم اور مطالعہ کی طاقت سے ان رُکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو فرانس میں دعوت دین کی راہ میں حائل تھیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ کی اہم ترین کتابیں اور مضامین فرانسیسی زبان میں ہیں جو پورے فرانس کے عوام وخواص سب کی زبان ہے، اپنے دل کا درد فرانس کے باشندوں کے دلوں میں پیدا کرنا ان کا مقصد وحید تھا وہ اسی کے لئے ساری جدوجہد کرتے رہے یہ صرف ان کی کتابوں کی تاثیر تھی کہ کئی ہزار فرانس کے باشندوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، جب کہ ڈاکٹر حمید اللہ اردو عربی کے بہترین انشاء پرداز تھے لیکن دعوت دین کے جذبے کے پیش نظر درد وتاثیر میں ڈوبی ہوئی کتابیں اور مضامین صرف فرانسیسی زبان میں لکھتے رہے، وہ علم وفضل کے اتنے بلند مقام سے بات کرتے تھے کہ دانشوران یورپ کے طائرِ فکر کی پرواز وہاں تک ذرا مشکل ہی سے تھی یہی وجہ ہے کہ وہ خالص دین کا کام کرتے رہے اور دانشوران یورپ کی نگاہوں میں بھی معزز رہے اور ادب واحترام کے ہاتھوں لئے جاتے رہے۔

خالق کائنات کی یہ حکمت ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں (جو مظلوم مسلمانوں

کی سرزمین ہے) ایک فرد پیدا کرتا ہے اور وہ فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں جا کر اپنے علم وفضل کی وجہ سے سر اور آنکھوں پر بٹھایا جا تا ہے کیونکہ وہ مخلص تھا، انسانیت کا خیر خواہ تھا، دین کا داعی تھا دنیا اس کے قدموں کے نیچے تھی وہ بے نیازی کے ساتھ اس کو روندتے ہوئے گذر گیا خدا اس کی بال بال مغفرت فرمائے اور اہل علم وکمال کو ان کی روش پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو یورپ جا کر دین بیچتے ہیں اور دنیا خریدتے ہیں اور گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

''غبارِ خاطر'' کے ایک مکتوب کی روشنی میں

''غبار خاطر'' ہاتھ میں لیتے ہی مولانا آزاد کی یاد آئی اور میں ان یادوں میں کھو گیا، یادوں کا یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ما سوا کو مناتی چلی گئی

ان یادوں کی سنہری زنجیروں نے نصف صدی سے زیادہ کی مدت کو جکڑ لیا ہمارا ملک آزادی کی منزل سے قریب ہوتا جا رہا تھا اور جتنی قربت بڑھتی جا رہی تھی راستہ کی ہولناکیاں اور مشکلات کی یورش بھی بڑھتی جا رہی تھی، مولانا آزاد اس پر خطر ماحول میں قطب نما کی حیثیت رکھتے تھے کاروان آزادی اس ستارے سے راہیں پاتے تھے اور اپنا سفر جاری رکھتے تھے، خطابت کے اسٹیج سے اور قلم کی جولانیوں سے جو کام لئے جا سکتے تھے ان کا سلسلہ مسلسل جاری تھا، خطابت کے اسٹیج پر آئے تو محسوس ہوا کہ کوئی تند اور تیز رو طوفان آرہا ہے جو سامعین کی عقل وخرد اور ہوش وحواس کو اپنی زد میں بہالے جائے گا اور جب قلم اٹھایا جادوں نگاری کا مرقع سامنے آ گیا، ان کے قلم کی ساحری کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ''غبار خاطر'' ہے جو قلعہ احمد نگر جیل کی یادگار ہے، قلعہ احمد نگر کی جیل مولانا آزاد کی سیاسی سربلندیوں کا نقطۂ عروج ہے اس منزل تک پہنچنے کے لئے آپ کو نگریس کی چھ سالہ صدارت کے ابتدائی تین سال کی شعلہ بداماں وادیوں سے گذرنا پڑا، یہ وہ دور تھا جب پورے عالم میں آگ اور بارود کی دماغ پاش بو پھیلی ہوئی تھی ۹ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے پولینڈ پر بم برسا کر دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز کر دیا اس کے دوش بدوش اٹلی اور جاپان کے حکمراں تھے، ان کا

نشانہ یورپ تھا، ان کے بمبار طیاروں نے برطانیہ کے دارالحکومت لندن پر بے تحاشا بمباری شروع کردی جس کے نتیجے میں شہر کی بیشتر آبادی زمین دوز پناہ گاہوں میں چلی گئی برطانیہ جس کی حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا اب اس کے دل ودماغ میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا، ہندوستان اس کی غلامی میں تھا، اس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ اس جنگ میں ہندوستان جانی ومالی تعاون کے لئے تیار ہوجائے، ہٹلر اور مسولینی بھوت بن کر یورپ کے سر پر سوار ہوگئے ان کے مقابلہ کے لئے فوجی جوانوں کی بھی ضرورت تھی اور مالی تعاون کی بھی، اس وقت تک ہندوستان میں آزادی کی تحریک میں ابال آچکا تھا پورے ملک میں تیز تر سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں، سیاسی جماعتوں کے تدبر وفراست کا امتحان تھا، یا تو اپنے آقاؤں کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، یا تعاون سے انکار کرکے قید وبند کی اذیتوں سے دوچار ہوں، کانگریس کے رہنماؤں کے سامنے بھی یہ مسئلہ عقدۂ لاینحل بنا ہوا تھا کہ وہ کمیونزم کی حمایت کریں یا نازی ازم کو اپنے سر پر مسلط کرلیں چونکہ جرمنی اور اٹلی نے لندن کے ساتھ روس پر بھی حملہ کردیا تھا اس لئے ہندوستان میں کمیونزم کے پرستاروں نے انگریزوں کی حمایت کا فیصلہ کردیا، لیکن کانگریس نہ کمیونزم کی حمایت وتعاون کرسکتی تھی نہ نازی ازم کی، اس لئے انگریزوں کو اس جنگ میں مدد دینے کے مسئلے میں متردد تھی، اسی تذبذب کے دور میں مولانا آزاد کو ۱۹۴۰ء میں کانگریس کا صدر منتخب کرلیا گیا، اب اس عقدۂ لاینحل کے لئے انہیں کے ناخن گرہ کشا کی ضرورت تھی، رام گڈھ کے کانگریس سیشن میں آپ نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی دستاویز تو تھا ہی وہ اردو ادب کا بھی شاہکار بن گیا، لوگوں نے عقیدت سے اسے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

اب عالمی جنگ تیسرے سال میں داخل ہوچکی تھی اس جنگ نے پوری دنیا کی معیشت پر اثر ڈالا تھا کوئی ملک اس مہیب اور ہمہ گیر جنگ کے اثرات سے مستثنیٰ نہیں تھا، اسی دور میں مولانا آزاد کو تحریک آزادی کے کارواں کی رہنمائی کرنی تھی، اور پورے قافلہ کو ساتھ لے کر چلنا تھا، کانگریس کے لیڈران، رہنماؤں اور دانشوروں کو

ایک نقطۂ فکر پر لانا تھا، تا کہ پوری قوت سے حکومت کے سامنے اپنا فیصلہ رکھا جا سکے سیاسی جماعتوں سے انگریزی حکومت کی گفت وشنید جاری تھی اب اگست ۱۹۴۲ء آچکا تھا صدر کانگریس مولانا آزاد نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ممبئی میں بلایا تا کہ متفقہ طور پر ایک پالیسی مرتب کر لی جائے اور غیر متزلزل فیصلہ کیا جائے، ۸؍اگست ۱۹۴۲ء کو ورکنگ کمیٹی نے اپنا وہ تاریخ ساز فیصلہ سنایا جو آزادی کے دیوانوں کی دلی تمنا تھی، اس فیصلہ کے نفاذ کے لئے ملک ابھی تیار تھا یا نہیں البتہ انگریزی حکومت میں اس فیصلہ کو برداشت کرنے کی قوت نہیں تھی، وہ فیصلہ اس طرح تھا۔

''ہم اہل ہند برطانوی حکومت کو کوئی جانی و مالی تعاون نہیں دے سکتے، انگریز ہندوستان چھوڑ دے''۔

اسی فیصلہ کو تاریخ میں مختصر لفظوں ''کوئٹ انڈیا'' کے لفظ سے ذکر کیا جاتا ہے، یہ فیصلہ درحقیقت انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا، اور کوئی حکومت بغاوت برداشت نہیں کر سکتی، اس کو کچل دینا اس کا سب سے پہلا فرض بن جاتا ہے، ۹؍اگست کو عملی بغاوت کا ہندوستانی قوم نے آغاز کر دیا کھلم کھلا ہندوستانیوں کی باغیانہ سرگرمیوں نے ثابت کر دیا کہ ہم آزادی حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی طریقۂ کار اختیار کر سکتے ہیں، پورے ملک میں ریلوے لائنیں اکھیڑی جانے لگیں بجلیوں کے تار کاٹے جانے لگے اسٹیشنوں کو پھونکا جانے لگا، ڈاک خانوں کو تاخت وتاراج کیا جانے لگا، نہتے ہندوستانیوں نے انگریزی پولیس کا سامنا کیا، پورے ملک میں ہر طرف زلزلہ آگیا نظام حکومت درہم برہم ہو گیا، انگریزی حکومت حواس باختہ ہو گئی، مولانا آزاد کی صدارت میں یہ فیصلہ ایک تاریخ ساز فیصلہ اور آزادی کا سنگ بنیاد بن گیا، گاندھی جی کا اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ منہ دیکھتا رہ گیا پورے ملک میں غلامی سے شدید نفرت کا لاوا اُبل پڑا، فیصلہ ۸؍اگست کو ۱۱؍ بجے رات میں ہوا اور ۹؍اگست کو فیصلہ کرنے والی ورکنگ کمیٹی ممبئی میں دن کا سورج نہ دیکھ سکی، مولانا آزاد اور پوری ورکنگ کمیٹی کو علی الصباح ممبئی وی ٹی ریلوے اسٹیشن سے انگریزی حکومت نے ایک

بند گاڑی میں ایک نامعلوم مقام پر روانہ کر دیا مولانا آزاد غبار خاطر کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام پر بھیج دیا جائے گا''۔

مولانا آزاد نے اس خبر کو افواہ کے لفظ سے ذکر کیا ہے چونکہ حکومت نے اتنی راز داری برتی تھی کہ صدر کانگریس کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی اور جب مولانا آزاد قلعہ احمد نگر کی جیل میں پہنچ گئے تو ان کو پتہ چلا کہ وہ افواہیں بے بنیاد نہیں تھیں، بلکہ حکومت کے ارادے کے آہنی حصار میں کوئی ایسا سوراخ ضرور رہ گیا تھا جس سے اصل خبر لیک کر گئی، اور لوگوں تک پہنچ گئی، مولانا آزاد نے غبار خاطر میں افواہ پر حاشیہ لکھا تھا جو درج ذیل ہے:

''گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہیں تھیں، سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات بھی کر لئے گئے تھے، لیکن پھر رائے بدل گئی، اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے تحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے''۔

شاہین جانتا ہے کہ صیاد گھات میں ہے، اس کا غیر مرئی جال ضرور بچھا ہوگا، گرفتاری یقینی ہے لیکن وہ شاہین کیا جو طوفانی ہواؤں اور تیز و تند جھگڑوں سے ڈر جائے، مولانا آزاد خوب سمجھتے تھے کہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ ہونے کے بعد حکومت کا کیا رویہ ہوگا، مگر اپنے گھر کلکتہ سے روانگی کے وقت اس کے تصور کو بھی ذہن سے نکال کر پھینک دیا تھا، یہی دور ہے جب مولانا آزاد کی زندگی کی تصویر کا دوسرا رخ ہمارے

سامنے آتا ہے، سچ پوچھئے تو اسی دوسرے رخ کو دکھانے ہی کے لئے میں نے اس خامہ فرسائی کی جرأت کی ہے، ایک طرف مولانا آزاد کانگریس کے صدر ہونے کے ناطے پورے ملک اور ملک کے تمام دانشوروں، سیاسی لیڈروں کی نگاہوں کا مرکز تھے ساری نگاہیں ان کی طرف لگی تھیں لیڈروں میں ان کا قد سب سے اونچا اور سب سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف وہ ایک محبت کرنے والی بیوی کے شوہر بھی تھے، مگر تصویر کا یہ دوسرا رخ کبھی دوسروں کے سامنے نہیں آیا، مولانا نے اپنی ذات کے گرد اتنا مضبوط حصار بنا رکھا تھا کہ انہوں نے خودنوشت بھی لکھی لیکن ان کی ذات کی پنہائیوں تک کسی کی رسائی نہ ہوسکی، اپنی ذات کو سمجھنے کے لئے پیش کیا اور کسی کو سمجھنے بھی نہیں دیا، ان حالات میں ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرنا کچھ آسان نہیں، کلکتہ میں مولانا آزاد کے ساتھ رہنے والے بعض اہل علم نے اپنے مضامین میں کچھ اشارے ضرور کئے ہیں یا ان کی تحریروں میں کہیں کہیں ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے، لیکن ''یوسف وزلیخا'' کا جو جذباتی ربط ہے وہ ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہا۔

انگریزی حکومت کے مظالم سہنے، جلاوطنی کا عذاب اور برطانوی جیلوں کی سختیاں جھیلنے کے لئے ان کا دل اگر ایک طرف فولاد کا تھا تو دوسری طرف ان کا دل پھول کی طرح نرم اور نازک بھی تھا مگر انہوں نے کبھی کسی کے سامنے دل کے اس نرم گوشے کا احساس نہیں ہونے دیا، قلعہ احمد نگر کی جیل ازدواجی زندگی کی آخری سرحد تھی اس منزل میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا، ۱۱/اپریل ۱۹۴۳ء کے مکتوب گراں میں کہتے ہیں:

''میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی ۱۹۴۱ء میں جب نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اس کی اطلاع نہیں دی گئی، لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم وبیش علالت کی حالت میں گذرا تھا، مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا رہائی کے بعد ڈاکٹر سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب وہوا کی ہوئی، اور وہ رانچی

چلی گئی رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا، جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آ رہی تھی‘‘۔

مولانا آزاد کے دل کی دنیا بہت وسیع تھی مگر اس میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے ہر طرف ہنگامے برپا تھے پھر بھی اسی دل کے ایک گوشے میں وہ جذبہ محبت بھی نیم خوابیدہ نیم بیدار موجود تھا جس کا رابطہ رفیقۂ حیات زلیخا سے تھا اسی پاکیزہ جذبے نے مسرت کا احساس کیا کہ صحت کی رونق چہرے پر واپس آ رہی ہے سکونِ دل کا یہ احساس بھی بہت تھا۔

زلیخا کے بارے میں ہماری معلومات صفر ہیں، ان کی کیا تعلیم تھی مگر ان کی ذہانت وفراست اور مطالعہ ومعلومات کے سلسلہ میں تھوڑی بہت واقفیت غبار خاطر کے اسی خط سے ہوتی ہے جو آج ہمارا موضوع سخن ہے ملکی حالات، آزادی کی تحریک، حکومت کی سرگرمیوں، اور وقت کے تیور کو وہ خوب سمجھتی تھیں، اور ان پر بصیرت مندانہ نظر رکھتی تھیں، اور پھر مولانا آزاد جیسے بے پناہ حساس اور ذہین شخصیت سے دو جملے کہنے میں بڑی صلاحیت اور ذہانت کی ضرورت تھی مولانا آزاد اپنے بلند مقام سے ایک زینہ بھی نیچے اترنے کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے رفیقۂ حیات کو خود اس مقام سے ہی گفتگو کرنی ضروری تھی جو مولانا آزاد کے شایان شان ہو، یہ حقیقت ان کی فطری صلاحیت وحاضر دماغی ان کی بہترین رسمی تعلیم کی غمازی کرتی ہے، مولانا آزاد ان کی بہترین صلاحیتوں کے خود معترف تھے وہ اپنے اسی مکتوب گرامی میں رقمطراز ہیں:

’’اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی، اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح انداز کر لیا تھا، ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دوسفروں کے درمیان بسر کئے ہیں، اس قدر کاموں میں مصروف رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا، وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے، اس لئے وہ بھی

خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی، ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے ۳ر اگست کو جب میں ممبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی، میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آ گیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے اس نے ''خدا حافظ'' کے سوا اور کچھ نہیں کہا، لیکن اگر کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا ''خاموش اضطراب'' کہہ رہا تھا، اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بہ حیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

مولانا آزاد کے لئے دوران جنگ صدارت کانگریس کا عہد درحقیقت کانٹوں کی سیج تھا، کسی کروٹ چین نہیں، ہمہ وقت دل میں جذبات کے شعلے لپکتے رہتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ آج انگریزی گورنمنٹ حالات کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے، یہ وقت آزادی کے مطالبہ میں شدت برتنے کا ہے کوئی بھی حکمراں بخوشی اپنے غلام ملک کو آزاد نہیں کرسکتا، آزادی قوت بازو سے چھینی جاسکتی ہے، لیکن راست اقدام کے بغیر کامیابی ممکن نہیں، لیکن گاندھی جی کا اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ بیچ میں حائل تھا، عالمی جنگ شدت اختیار کرتی جارہی تھی پورے یورپ میں آگ کے شعلے دہک رہے تھے آگ اور بارود کی تیز بو انگریزی حکومت کے دماغ میں چڑھی ہوئی تھی ایسی حالت میں وہ اپنے بچاؤ کے لئے بڑے سے بڑا اقدام کرسکتی ہے، اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا ایک مدبر سیاستداں کے لئے لازمی تھا، نینی جیل میں مولانا آزاد کا جسم ضرور قید تھا مگر دل ودماغ کی پرواز برابر جاری تھی، نینی جیل سے رہائی کے بعد سیدھے کلکتہ اپنے گھر آئے، اب کی باران کا گھر آنا گھر سے غائب رہنے سے کم نہ تھا دل کا وہ گوشہ جس میں اہل خانہ سے ربط وتعلق کا جذبہ جاگ رہا تھا ان کو گھر ضرور لایا لیکن حالات کی ستم ظریفی کا عالم یہ تھا کہ نہ دل ودماغ کو فرصت تھی نہ زبان میں

یارائے گفتگو البتہ آنکھیں بولتی تھیں اور اپنے سوال کا جواب بھی پا لیتی تھیں، لیکن حالات وخیالات کی تیز آندھی میں محبت کا یہ چراغ ہمیشہ جھلملاتا رہا، اس کا اظہار اس وقت ہوا جب چار دنوں کے بعد وہ گھر سے رخصت ہو رہے تھے، جذبات کے سمندر میں جو تموج تھا اس کا سنبھالنا دشوار تھا، خاموش محبت زبان دراز محبت سے ہمیشہ طاقتور ہوتی ہے اس میں اپنا وجود آتش فراق میں خاکستر کر دینے کا حوصلہ ہوتا ہے مگر لب بند ہوتے ہیں اور زبان پر مہر خموشی، مولانا آزاد کے معجزہ نگار قلم نے ان لمحات کی جو ترجمانی کی ہے اس کی مثالیں اہل قلم کے یہاں کم ملتی ہیں، آپ نے اپنے مکتوب میں کتنے معنی خیز الفاظ میں دونوں طرف کے جذبات کی ترجمانی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی، میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا، شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے، وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی ہے''۔

کبھی دوست اپنے سفر کرنے والے دوست کو خدا حافظ کہتا ہے اور کبھی خود سفر کرنے والا گھر والوں کو خدا حافظ کہتا ہے، مولانا آزاد تو کلکتہ سے ممبئی کا سفر کر رہے تھے اور ۸/ اگست کے شعلہ زار میں چھلانگ لگانے کے لئے جا رہے تھے لیکن رفیقۂ حیات اس سفر سے کہیں زیادہ لمبے سفر پر جانے کی تیاری کر رہی تھی، دروازہ پر جانے والے مسافر کو خدا حافظ کہہ کر خاکدان عالم سے اپنے سفر کے لئے رخت سفر درست کرنے میں لگ گئی، یہ کیسی کربناک صورت حال ہے جس کو مولانا آزاد نے ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے ''مجہول احساس''، مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے کسی واقعہ کی کبھی کبھی ایک جھلک قبل از وقت نظر کے سامنے آ جاتی ہے اور ظاہری وجود پر اس کا

ظہور ہونے لگتا ہے۔

رفیقۂ حیات کا اپنے سفرِ آخرت کے پیش نظر مولانا آزاد کو خدا حافظ کہنا انتہائی درد و کرب کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ تو ممبئی کے سفر پر جارہے ہیں جہاں سے واپسی ممکن ہے اور میں اس سفر پر جارہی ہوں جہاں سے واپسی ناممکن ہے، خدا آپ کی حفاظت فرمائے، یہ داستان کرب مولانا آزاد نے بالقصد دراز کرنے کی کوشش کی ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار ہوگا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی، ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا، اس واقعے نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار، پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی، غالبًا یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہوگئی تھیں''۔

مستقبل کی پرچھائیاں کیا ہیں؟ درحقیقت مولانا آزاد کی گرفتاری کے آٹھ ماہ بعد زلیخا پر ٹوٹنے والی قیامت اس پر آٹھ ماہ قبل ہی منکشف ہوگئی تھی وہ سمجھ چکی تھی کہ میں آج جن کو خدا حافظ کہہ رہی ہوں وہ احمد نگر کی جیل میں صوفے پر بیٹھے عالم تصور میں اپنے دوست کو حافظ شیرازی کے وجد آفریں اشعار سنارہے ہوں گے اور میں کلکتہ میں تڑپ تڑپ کر شکن آلود بستر پر دم توڑ رہی ہوں گی، یہ وقت سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔

عظیم شخصیتوں کی نجی زندگی حجاب درحجاب ہوتی ہے گھر کے افراد سے ربط و تعلق عام لوگوں ہی جیسا ہوتا ہے لیکن اس کا ظہور دوسروں کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا گھر کے افراد کو ایک غیر مرئی تار باندھے رکھتا ہے اور جب وہ تار ٹوٹ جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسرے فرد کی زندگی ادھوری اور نامکمل ہوگئی، مولانا آزاد کو زلیخا سے جو تعلق خاطر تھا زلیخا کو اس سے کہیں زیادہ مولانا آزاد سے تعلق خاطر تھا بلکہ اس کو عشق و محبت کی معراج کہا جاسکتا ہے، انہوں نے پوری زندگی ایثار وقربانی کی صلیب پر گذاری مگر زبان سے کبھی اف بھی نہیں کہا مولانا آزاد خود اس کے معترف تھے مگر ان کی وضعداری، رکھ رکھاؤ ایک خاص پر وقار طرز زندگی کے وہ قائل تھے جو ظاہر داریوں کے رسوم وقیود سے جکڑی ہوئی تھی اس لئے باہمی روابط کا ظہور کم ہی ہوتا تھا، لیکن ان کی دائمی جدائی کا تصور اس کوہ وقار کو جنبش دے دیتا تھا آپ اس مکتوب کے لفظوں اور جملوں پر غور کریں تو ہر ہر لفظ سے مولانا آزاد کا درد وکرب جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا آزاد ۸/اگست ۴۲ء کو ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد رات کے پچھلے پہر گرفتار کر لئے گئے تھے اور ایک نامعلوم مقام پر ایک بند گاڑی کے ذریعہ بھیج دیئے گئے تھے، سیاسی قیدیوں کو اپنے گھر والوں سے خط وکتابت کی محدود اجازت حاصل رہتی ہے لیکن مولانا آزاد اور ان کے جملہ ساتھیوں کو ابتداءً خط وکتابت کی اجازت نہیں دی گئی تقریباً ایک ماہ بعد پابندی اٹھالی گئی تو کلکتہ کے خطوط سے رفیقۂ حیات کی علالت کی اطلاع ملی اور یہ بیماری کا سلسلہ بغیر انقطاع مسلسل جاری رہا، پھر شدید علالت اور پھر خطرناک صورت حال کی اطلاع ملنے لگی، مولانا آزاد نے صحیح صورت حال جاننے کے لئے ٹیلیگرام کرنا چاہا مگر معلوم ہوا کہ قلعہ احمد نگر کے قیدیوں کی جملہ ڈاک ممبئ جاتی ہے اور پھر ممبئ کی گورنمنٹ ان کو سنسر کے لئے دہلی بھیج دیتی ہے وہاں سے کتر بیونت کے بعد پھر وہ خط یا ٹیلیگرام مکتوب الیہ تک جاسکتا ہے اس لئے ٹیلیگرام بھی کم سے کم ایک ہفتہ کے بعد ہی جاسکتا ہے اور جوابی تار ملنے میں پندرہ دن لگ جائیں گے اس لئے ٹیلیگرام کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا اور ٹیلیگرام نہیں دیا گیا۔

۲۳/ مارچ ۴۳ء کو ممبئ گورنمنٹ نے ایک ٹیلیگرام کے ذریعہ احمد نگر جیل کے سپرینڈنٹ کو اطلاع دی کہ کلکتہ سے مولانا آزاد کی اہلیہ کی خطرناک علالت کا ایک ٹیلیگرام ملا ہے، وہ فوجی کوڈ میں لکھا ہوا تھا اس لئے سپریٹنڈنٹ اس کو لے کر فوجی ہیڈ گوارٹر گیا اور رات میں وہ حل ہو کر مولانا آزاد کو ملا اور معلوم نہیں وہ تار کتنے دن پہلے دیا گیا تھا؟ سپریٹنڈنٹ نے ممبئ گورنمنٹ کی ایما سے مولانا آزاد سے کہا کہ اگر آپ اس سلسلہ میں کوئی بات کہنی چاہتے ہیں تو بتادیں میں آج ہی اسے ممبئ گورنمنٹ کو بھیج دوں گا وہ خود اس حادثہ سے متاثر تھا اور سپریٹنڈنٹ اپنی ہمدردی کا مولانا آزاد کو یقین دلانا چاہتا تھا مولانا آزاد نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا، سپریٹنڈنٹ مولانا آزاد سے دوٹوک جواب پاکر پنڈت جواہر لال کے پاس گیا اور کہا کہ آپ مولانا کو راضی کردیں، اور درخواست دینے پر آمادہ کردیں، جواہر لال نہرو مولانا کے پاس آئے اور دبے لفظوں میں اپنا مدعا کہا مگر مولانا آزاد بھاری چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے اور کوئی جنبش اس کو نہ ہلا سکی۔

یہ قلعہ احمد نگر جیل کے آٹھ مہینوں کی روداد تھی اور جب تشویشناک اطلاعات آنے لگیں اور دائمی جدائی کا تصور اپنے تمام درد وکرب کے ساتھ مولانا آزاد کے سامنے آیا تو آپ کے دل ودماغ پر کیا گذری؟ خود مولانا آزاد کے لفظوں میں سنئے:

> ''جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کیا، انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا، میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گذری کہ طبیعت کو ضبط وانقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔
>
> تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
> شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم
>
> آخری الفاظ ہیں:

''بالآخر ۹/اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہوگیا ''فان ما تحذرين قد وقع''
وہ کہانی جو ۳/اگست ۴۲ء کو مولانا آزاد کے کلکتہ سے روانگی کے وقت ان کی رفیقہ حیاتِ زلیخا نے خدا حافظ کہہ کر شروع کی تھی وہ ۹/اپریل ۴۳ء کو ختم ہوگئی مولانا آزاد اس وقت یہ فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ یہ خدا حافظ میرے سفر کے لئے کہا گیا یا وہ خود سفر کرنے والی تھی اور وہ اپنے سفر پر جاتے ہوئے خدا حافظ کہہ رہی ہے ۹/اپریل کو یہ جملہ اپنی پوری معنویت اور پوری وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوگیا، اس حادثہ کے بعد مولانا آزاد پر کیا گذری؟ اس کو انہوں نے صرف دو سطروں میں بیان کردیا حالانکہ اس کے لئے مولانا آزاد کی کتاب زندگی کے ۱۴/برس کی ضرورت تھی مولانا نے اسی خط میں تحریر فرمایا:

> ''مجھے ان چند دنوں میں برسوں کی راہ چلنی پڑی، میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے''۔

ایسا حادثہ جو براہ راست دل و دماغ پر چھا جائے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جیسے جسم کی ساری طاقت نکال دی گئی ہے، نہ کوئی حوصلہ نہ امنگ، نہ ہمت نہ طاقت، دل کا صدمہ جسم کو اپاہج بنا دیتا ہے نہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہ کسی کام میں دلچسپی بدن تکان سے چور چور ہوجاتا ہے جیسے بہت لمبی مسافت پیادہ پا چل کر آیا ہو، جسم میں گویا برقی رو تھی جو جسم سے غائب ہوگئی۔

ازدواجی زندگی میں طرفین کے درمیان تعلق وربط کی ایک برقی رو کارفرما ہوتی ہے جب دونوں میں سے کوئی ایک اس عالم فانی سے رخصت ہوجاتا ہے تو وہ برقی رو غائب ہوجاتی ہے جیسے پلگ میں دو تار کسے ہوئے ہوتے ہیں تو برقی رو دوڑتی رہتی ہے اگر کوئی تار کھل جائے یا الگ ہوجائے تو پھر برقی رو غائب ہوجاتی ہے اب نہ بلب اور ٹیوب لائٹ روشن ہوتا ہے نہ ہیٹر گرمی پیدا کرتا ہے وہ پلگ از کار رفتہ ہوجاتا ہے، ازدواجی زندگی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی، ان میں سے کوئی ایک جب ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو انسان ادھورا ہوکر رہ جاتا ہے اب نہ دماغ میں حوصلوں اور امنگوں کی

روشنی پیدا ہوتی ہے نہ عمل کی حرارت کا وجود رہ جاتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے مولانا آزاد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے انہوں نے خود کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے، اس مرحلہ پر ان کی وضعداری اور ظاہرداری شکست کھاجاتی ہے وہ اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی، یہ جدوجہد دماغ کو نہیں جسم کو تھکا دیتی ہے، وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے، اس زمانے میں میرے دل ودماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر وسکون کے ساتھ برداشت کرلوں، اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا، لیکن شاید باطن نہ ہوسکا میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے''۔

یہ فطرت کا اصول ہے، بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی سب اسی اصول میں جکڑے ہوئے ہیں بس لفظ وبیان کا فرق ہے، چھوٹا آدمی اپنی فطرت سے مجبور ہوکر اپنے درد وکرب کا اظہار کھلے لفظوں میں کرتا ہے اور وضعدار انسان اپنی ازدواجی زندگی کے احساسات وانفعالات کو ایک سربستہ راز سمجھتا ہے جس کا افشاء وہ کسی حال میں گوارا نہیں کرتا ہے اس لئے ایسے حوادث پر اس کے دل ودماغ کی کیفیت ایک عام انسان ہی کی طرح ہوتی ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے الفاظ اور جملوں کا اتنا دبیز پردہ استعمال کرتا ہے کہ اصل حقیقت پر آسانی سے نظر نہیں پڑسکتی اور عوامی سطح کا ذہن اس کا ادراک بھی نہیں کرسکتا۔

بالکل ایسے جیسے سرخ رنگ کا مشروب شیشے کے سفید گلاس میں جب ہوتا ہے تو پورا گلاس سرخ نظر آتا ہے، لیکن یہی سرخ رنگ کا مشروب سونے کے گلاس میں ڈال دیجئے تو پتہ نہیں چلے گا کہ گلاس کے اندر کس رنگ کا مشروب ہے کیوں کہ وہ خارج سے نظر نہیں آئے گا، ظاہری نگاہیں صرف مرعوبیت سے گلاس کو دیکھتی رہ جائیں گی،

دونوں طرح کے انسان کے دلوں میں جذبات واحساسات ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں لیکن ظاہری نگاہیں دونوں میں فرق محسوس کرتی ہیں۔

مولانا آزاد پر بھی رفیقۂ حیات کی دائمی جدائی کا حادثہ اسی طرح اثر انداز ہوا جیسے ہمارے جیسے معمولی لوگوں کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

مولانا آزاد کا مکتوب گرامی جو غبار خاطر کا ایک اہم ترین خط ہے اپنے انداز بیان خوبصورت تعبیرات اور خود ساختہ تراکیب عربی کے دقیق الفاظ استعمال کرکے جس خوبصورتی کے ساتھ اپنی دلی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، یہ خط جذبات انسانی کے اظہار کے لئے الفاظ ومعانی کے ایسے ایسے نمونے پیش کرتا ہے کہ عام ذہنوں کی وہاں تک رسائی بھی نہیں ہوسکتی، اہل قلم ان سے سبق حاصل کرسکتے ہیں اور مافی الضمیر کی ادائیگی کا سلیقہ سیکھ سکتے ہیں جو ان کے دامن خیال کو رکاکت وابتذال کے داغ دھبے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں، بس اسی جذبے سے میں نے غبار خاطر کے اس مکتوب کو موضوع سخن بنایا، مگر بات پھیلتی چلی گئی اور گفتگو دراز ہوگئی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ٹیپو سلطان کی تلوار ہمارا تاریخی ورثہ ہے

ٹی وی پر دیومالائی کہانیوں کے دو سلسلے چلے جو ایک عرصہ تک چلتے رہے، ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ جب ''مہا بھارت'' ''رامائن سیریل'' کا وقت ہوتا تو جن دکانوں میں ٹی وی سیٹ تھے ان کے سامنے عوام کے ٹھٹ لگ جاتے، جب یہ دونوں سیریل ختم ہوئے تو بھگوان ایس گڈوانی کے ناول پر مبنی سیریل ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' کا اعلان کیا گیا، بس پورے ملک کی فضا میں بھونچال آ گیا، جیسے کسی دشمن ملک نے ہمارے ملک کے خلاف اعلان جنگ کیا ہو، فرقہ پرست تنظیموں کے خیموں میں پینترے بازی شروع ہوگئی، تلواریں چمکائی جانے لگیں، جلسے ہونے لگے، بڑی بڑی احتجاجی ریلیاں نکالی گئیں، دھرنے دیئے گئے، اور دہلی میں ایک بڑا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں پُر زور لفظوں میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' سیریل ٹی، وی پر ہرگز نہ دکھائی جائے، اس سے ہمارے جذبات مجروح ہوں گے، ٹیپو ہندوؤں کا دشمن تھا، اس نے مندروں کو ڈھایا ہے اور اپنے دورِ حکومت میں ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنایا ہے، اور نہ جانے کیا کیا الزامات واتہامات فرقہ پرستوں کے زرخیز دماغ میں خودرَو پودوں کی طرح اگنے لگے، اور پھر یہ پودے اتنے گھنے اور تناوَر درخت بن گئے کہ عوام کے ذہن وفکر کے آنگن میں ہرطرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا، اس اندھیرے میں تاریخی صداقتوں کا آفتاب گہنا گیا۔

ٹی، وی سے ہماری کوئی دلچسپی نہیں، ہمارے نزدیک سنیما ہال میں دکھائی جانے والی فلموں کا وہ ایک ترقی یافتہ ایڈیشن ہے، ارباب بست وکشاد جو چاہیں گے فلمیں دکھائیں گے، ان کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے اب چاہے ٹی، وی پر مہا بھارت لڑی جارہی ہو یا رام وراون اور سیتا کی کہانی دہرائی جارہی ہو ہمارے جیسے ذہن ومزاج کے لوگوں کو اس سے کیا سروکار ہوسکتا ہے؟ بالکل اسی طرح ہندوستان کے مسلم ہیروز کی

زندگیوں پر فلمیں اور سیریل بنائے جائیں یا ان کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی ہم کو کوئی شکایت نہ ہوگی، کیوں کہ ہم سرے سے گھروں میں ٹی، وی رکھ کر ہر گھر کو سنیما ہال بنانے ہی کے خلاف ہیں کیوں کہ اس سے خاندانی زندگی کا تقدس پامال ہوتا ہے اور عائلی زندگی کی پاکیزگی کے مجروح ہونے کا سخت خطرہ ہے، لیکن سلطان ٹیپو کا نام آتے ہی ملک میں جو طوفان برپا ہوگیا اور ذہنوں میں جو غلاظت بھری ہوئی تھی وہ سڑکوں پر آگئی تو قدرتی طور پر ہم کو اس سے سخت ذہنی اذیت ہوئی کیوں کہ ہمارے سامنے ہی ہماری تاریخ مسخ کی جارہی ہے، اور جو ہمارا مقدس قومی ورثہ تھا اس کو پامال کیا جارہا ہے اس لئے مجبوراً ہمیں قلم اٹھانا پڑا، تاکہ ملک کے سامنے سلطان ٹیپو کی صحیح تصویر پیش کردیں، بس اس کے سوا ہمارا اور کوئی مقصد نہیں، ہم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ یہ سیریل ٹی وی پر دکھائی جائے یا اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔

سلطنتِ خداداد:

ہندوستان کی تاریخ میں سلطان ٹیپو کا کیا مقام تھا؟ اس کی عظمت واہمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آج سے دوسو سال پہلے ماضی کی طرف لوٹ جائیں اور جنوبی ہند کی سرزمین کی طرف چلیں جہاں ایک نئی حکومت کی بنیاد پڑی، جس کا بانی سلطان ٹیپو کا باپ نواب حیدر علی تھا اور اس نے اپنی حکومت کا نام ''سلطنت خداداد'' رکھا تھا، اس حکومت کی مدت صرف چالیس سال ہے، ۱۷۵۹ء میں اس کا آغاز ہوتا ہے اور ۱۷۹۹ء میں اس کا وجود صفحہ ہستی سے مٹادیا جاتا ہے، لیکن اتنی مختصر مدت میں یہ حکومت کتنی طاقتور تھی؟ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یورپ میں نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی زندگی اور اس کے دور حکمرانی سے متعلق ایک درجن انگریزوں نے کتابیں لکھیں اور ضخیم سے ضخیم تر کتابیں لکھیں جن کی فہرست اس وقت میرے سامنے ہے، آخر یہ چھوٹی سی اور کم عمر حکومت یورپ کے لئے اتنی اہم کیسے ہوگئی؟ تاریخ بہت تفصیل سے ہمیں یہ داستان سناتی ہے۔

انگریز سوداگروں کے بھیس میں:

افلاس کے مارے انگلینڈ نے تلاش معاش کے سلسلے میں اپنے فرزندوں کو واسکوڈِی گاما کے تلاش کردہ راستے سے ہندوستان بھیجنا شروع کیا کیوں کہ پورے یورپ میں یہ مشہور تھا کہ ہندوستان ''سونے کی چڑیا'' ہے، یہاں آ کر انھوں نے اپنی ایک تنظیم بنالی جس کو تاریخ میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کہا جاتا ہے، بنگال میں وہ مچھلی اور بانس بیچتے تھے اور نیل بوتے، کاٹتے اور گندے حوضوں میں پکاتے تھے، یہی ان کا کاروبار تھا، مدراس میں پانڈیچری کے مقام پر ان کا دوسرا مرکز تھا، اس طرح ان کی بہت بڑی تعداد تلاش روزگار میں ہندوستان آ گئی، یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوگئی تھی، تمام علاقے خودمختار ہوتے جارہے تھے، پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں مطلق العنان ہوگئی تھیں، بنگال میں علی وردی خاں نے خودمختاری کا اعلان کردیا پھر اس کا لڑکا سراج الدولہ حکمراں ہوا، بنگال میں انگریزوں کی تعداد اتنی ہوچکی تھی کہ انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی فوج بنالی تھی، سراج الدولہ کی مخالفت میں انگریزوں نے میر جعفر کو کھڑا کردیا یا خود جعفر نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد طلب کی، بہرحال سودا طے ہوگیا، قیمت متعین ہوگئی، انگریز ٹامیوں نے سراج الدولہ کی فوج پر حملہ کردیا، میر جعفر جو وزیر جنگ تھا اس نے سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو چند گھنٹوں میں شکست دے دی، حسب معاہدہ میر جعفر کو بنگال کے تخت حکومت پر انگریزوں نے بٹھادیا، اس طرح بنگال کی حکومت ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے زیر اثر آ گئی اور اس کو کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی، پھر انگریزوں نے میر جعفر کے خلاف میر قاسم کو کھڑا کر کے اس سے سودا کیا اور قیمت طے کرلی اور میر جعفر کو تخت سے اُتار کر حکومت میر قاسم کے سپرد کردی گئی، چند دنوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت کے الٹ پھیر سے اتنی دولت حاصل کرلی کہ سالہا سال جدوجہد کے بعد بھی اتنی دولت نہیں کما سکتی تھی، بنگال کے اس تجربہ نے انگریزوں کی آنکھیں کھول

دیں، اب وہ پورے ملک میں اسی نقطۂ نگاہ سے کام کرنے لگے، مدراس کے انگریزوں نے محمد علی والا جاہ کو چندا صاحب سے لڑا کر ارا کاٹ کی حکومت دلوادی اس کے بدلے میں ارا کاٹ کا ایک بہت بڑا علاقہ انگریزوں کو انعام میں مل گیا، جہاں وہ خودمختار ہوکر اپنی حکومت بنانے کی پوزیشن میں آگئے، یہی وہ علاقہ ہے جہاں سب سے پہلے انگریزوں کو حکمرانی کا موقعہ ملا اور ہندوستان میں ایک قطعہ زمین کے مالک بنے۔

حکومت میسور سے ٹکراؤ:

اب انگریزوں نے سنہرے خواب دیکھنے شروع کردیئے اور پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے پر بڑی سرگرمی سے غور کرنے لگے، جنوبی ہند میں انگریزوں کی طاقت زیادہ تھی، اس لئے پہلے انہوں نے حیدرآباد کو اپنے چنگل میں لیا اور اپنی حسب مرضی اس سے کام لینا شروع کیا اور وہ طریقہ کار اختیار کہ نظام انگریزوں کے چشم وابرو کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوگیا، ہندوستان کی فتوحات میں سب سے بڑی رُکاوٹ حیدرعلی اور سلطان ٹیپو تھا گویا ہندوستان کو غلام بنانے کی راہ میں نواب حیدرعلی اور سلطان ٹیپو کی حیثیت ایک آہنی پھاٹک کی تھی، اس پھاٹک کو توڑے بغیر منزل مقصود تک رسائی ممکن نہ تھی، اس لئے انگریزوں نے نواب حیدرعلی اور ٹیپو کے خلاف لڑائی چھیڑدی، گونر مدراس محمد علی والا جاہ کو حکم دیا کہ جنرل اسمتھ کے ماتحت جانے والی انگریزی فوج کے ہمراہ محاذ پر پہنچ جائے، اس مشترکہ فوج نے میسور پر حملہ کردیا، لیکن اس کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں بڑا تلخ نکلا، حیدرعلی اور سلطان ٹیپو نے دو طرف سے گھیر کر جنرل اسمتھ کی فوج پر اتنا زبردست حملہ کیا کہ وہ زیادہ دیر میدان جنگ میں نہیں ٹھہرسکی، اور مورچہ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی خود جنرل اسمتھ پر اتنی دہشت سوار ہوئی کہ جب وہ محاذ جنگ سے بدحواس ہوکر بھاگا تو پیچھے مڑکر دیکھنے کی بھی اس میں ہمت نہیں رہی تھی اور اس نے مدراس پہنچ کر اطمینان کی سانس لی، انگریزوں کا زرخرید غلام محمد علی والا جاہ نے بھی اپنی فوج کے ساتھ بھاگ کر مدراس میں

جا کر پناہ لی۔

گورنر نے اب جنرل اسمتھ کے بجائے فوج کی کمان جنرل اَوڈ کو دی مگر وہ بھی میدان جنگ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا، اور جب اس نے فرار اختیار کیا تو سلطان ٹیپو اس کے تعاقب میں تھا اور جب وہ مڑ کر دیکھتا کہ شیر میسور دھاڑتا ہوا پیچھے آرہا ہے تو اور تیز بھاگنے لگتا، یہاں تک کہ ٹیپو کی فوجیں مدراس تک پہنچ گئیں جو اس وقت انگریزوں کا کلکتہ کے بعد سب سے بڑا اور مضبوط مرکز تھا، مدراس پہنچ کر سلطان ٹیپو کی فوجوں نے انگریزوں کے قلعہ سینٹ جارج پر گولہ باری شروع کردی، اتفاق سے ایک گولہ ٹھیک اس جگہ گرا جہاں گورنر مدراس اور محمد علی والا جاہ جنگ کی حکمت عملی پر گفتگو کررہے تھے، گورنر مدراس پر خوف و ہراس سوار ہوگیا اور اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ساحل سمندر کی طرف بھاگا جہاں سمندر میں انگریزی جہاز کھڑے تھے، اس نے ایک جہاز میں جا کر پناہ لی، بدحواسی کا عالم یہ تھا کہ گورنر کو اپنے تن بدن کا کچھ ہوش نہیں تھا اس کی ٹوپی اور تلوار وہیں میز پر دھری رہ گئی ان کے اٹھانے کی بھی اس کو ہمت نہیں ہوئی، اگر سلطان چاہتا تو اسی دن جنوبی ہند سے انگریزوں کا صفایا کردیتا لیکن انگریزوں نے دست بستہ حاضر ہوکر صلح کی درخواست کردی اور سلطان نے اس کو منظور کرلیا۔

انگریزوں سے دوسری جنگ:

سازش اور توڑ جوڑ انگریزوں کی ہمیشہ سے فطرت رہی ہے، انھوں نے صلح تو ضرور کرلی لیکن نیتوں میں فتور موجود تھا چونکہ اب وہ تجارت سے زیادہ فوجی پیش قدمی کو نفع بخش سمجھنے لگے تھے اور ان کے حوصلے اس حد تک بلند ہوچکے تھے کہ وہ پورے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے، اس لئے انھوں نے جوں ہی اپنی فوجی حالت کو درست کرلیا اور فریقین کے درمیان لکھے گئے صلح نامہ کی سیاہی بھی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ پھر انھوں نے اعلان جنگ کردیا، اب کی بار پوری

تیاریوں کے ساتھ پیش قدمی شروع کی جنگ بکسر کے انگریز ہیرو سرہکٹر منرو اور کرنل بیلی کو سلطان ٹیپو کے مقابلہ کے لئے منتخب کیا گیا وہ دونوں اپنی فوجوں کو لے کر میدان جنگ میں آ گئے، لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ ان کا خواب پھر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، حیدر علی اور ٹیپو نے انگریزی فوج کے پرخچے اڑا دیئے، کرنل بیلی کو گرفتار کر کے جیل میں رسی بٹنے اور چکی پیسنے کے لئے بھیج دیا گیا، کمانڈر کی گرفتاری کے بعد فوج کے مقابلہ کرنے کا کیا سوال؟ سر الفرڈ لائل اپنی تاریخ میں اس جنگ کے متعلق لکھتا ہے:

''ہندوستان میں اس سے بڑھ کر مصیبت انگریزوں پر کوئی نہیں پڑی، جس میں دو ہزار انگریزی سپاہ اسیر ہو گئے، ان میں جنرل ڈیوڈ بیرڈ تھا جس نے بعد میں محاصرہ سرنگا پٹم ۱۷۹۹ء میں نام پیدا کیا''۔ (تاریخ سلطنت خداداد مطبوعہ لاہور ص:۱۴۲)

رسالہ ملٹری بیا گرافی مطبوعہ لندن اس جنگ کے سلسلے میں تحریر کیا گیا:

اس جنگ میں چار ہزار پانچ سو فرنگی سپاہی مقتول ہوئے، کرنل فلیچر بھی اس لڑائی میں مارا گیا، کرنل بیلی اور کپتان بیرڈ باقی ماندہ فوج کے ساتھ اسیر ہو گئے۔ (ص:۱۴۳)

یورپ کا رستم وافراسیاب اور جنگ بکسر کا ہیرو سرہکٹر منرو کو جب اس شکست کی خبر ملی تو اتنا دہشت زدہ ہو گیا کہ وہ اپنی بڑی بڑی توپوں کو دریا میں پھینک کر سیدھا مدراس بھاگا، اور کہیں بھی رک کر مقابلہ کی بات نہیں سوچی، مگر ان تمام ذلت آمیز شکستوں کے باوجود انگریزوں کی سلطان ٹیپو کے خلاف سرگرمیاں جاری تھیں کیوں کہ جب تک حکومت میسور کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں دیا جاتا ہندوستان جیسی سونے کی چڑیا کا قابو میں آنا ممکن نہیں اور اس ملک کو انگریزوں کی نوآبادی بنانے کا جو خواب برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ٹپ نے دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

انگریزوں کی اس دوسری فوج کی شکست کا صدمہ ان کے لئے ناقابل برداشت بن گیا مدراس کے گورنر ہاؤس ہی سے نہیں بلکہ پورے جنوبی ہند میں پھیلے ہوئے انگریزوں کے انگلستان لکھے جانے والے خطوط کا تانتا بندھ گیا اور لندن میں

گھر گھر ماتم کدہ بن گیا، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف پورے انگلینڈ میں نفرت اور غم وغصہ کا طوفان برپا ہو گیا کیوں کہ ان لڑائیوں میں جلیل القدر خاندانوں کے چشم و چراغ مارے گئے تھے، انگریزوں میں مایوسی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔

نواب حیدر علی کے بعد:

۱۷۸۲ء میں نواب حیدر علی کی وفات ہوگئی اور سلطنت خدا داد میسور کی زمام حکومت سلطان ٹیپو کے ہاتھوں میں آئی، چونکہ انگریزوں سے ہونے والی تمام لڑائیوں میں سلطان ٹیپو اپنے باپ حیدر علی کے ساتھ شریک رہا اور انگریزوں کو شکست دینے میں اس کی حکمت عملی کو بہت دخل تھا، اس لئے وہ انگریزوں کی فطرت سے خوب واقف تھا، سلطان ٹیپو نے اپنی فوجی طاقت کو مزید مضبوط کرنا شروع کر دیا۔

اس کی حکومت کے ابتدائی چار پانچ سال تو انگریز خاموش رہے تا کہ ان کے زخم مندمل ہو جائیں، سلطان ٹیپو اس عرصہ میں انگریزوں کے کاسہ لیس یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے آلۂ کار بنے ہوئے نظام حیدر آباد اور مرہٹوں سے نبرد آزمائی کرتا رہا، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس کا اصل حریف پھر سامنے آ گیا، اب بہت بڑی فوجی تیاریاں کی گئیں انگلستان کے مایۂ ناز سپوتوں کو فوج کی کمان دی گئی، گورنر مدراس سے لے کر گورنر جنرل تک کو بدل دیا گیا، کیوں کہ ان کی سرگرمیاں ٹیپو کے مقابلہ میں ناکام ثابت ہو چکی تھیں، اس لئے نئے سورماؤں کو فوج کی کمان دینے کی پالیسی تیار کی گئی کیوں کہ اس کے بغیر پرانے طریقہ کار سے سلطان ٹیپو کو شکست نہیں دی جا سکتی تھی اور اس کی موجودگی میں ہندوستان پر قبضہ کرنا اور اس کو غلام بنانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

لارڈ کارنوالس:

اب تک ہندوستان میں گورنر جنرل کے عہدہ پر جنرل دارن ہسٹینگز تھا، اسی کے زمانے میں بنگال کے اندر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم مضبوطی سے جمے تھے لیکن اب

مقابلہ کمزور بنگالیوں سے نہیں شیر میسور سلطان ٹیپو سے تھا جو فولادی عزم وارادے کا ایک آہنی انسان تھا، اب دارن ہسٹینگر کا طریقہ کار مفید نہیں تھا بلکہ گورنر جنرل کو ٹیپو کو شکست دینے کیلئے دوسری راہیں تلاش کرنی تھیں اسلئے اس کو انگلستان بلایا گیا اور اس کی جگہ پر برطانوی وزیر اعظم مسٹر ٹپ نے لارڈ کارنوالس کو گورنر جنرل بنا کر بھیج دیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب امریکہ نے انگلستان سے بغاوت کر کے آزادی حاصل کر لی تھی جس شخص نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو گنوایا تھا وہ خیر سے یہی لارڈ کانوالس تھا اس لئے برطانیہ کی نگاہ میں اس کا وقار زائل ہو چکا تھا، وزیر اعظم برطانیہ نے کارنوالس کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر ایک چانس دیا تا کہ وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم کر کے امریکہ کا داغ بدنامی دھو سکے، ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کارنوالس کیا کچھ نہ کرنے کا ارادہ لے کر آیا ہوگا اس نے یہاں آکر زمام اختیار ہاتھ میں لے لی مدراس کے گورنر نے سلطان ٹیپو کے مقابلے میں پے در پے ہزیمتیں اٹھائی تھیں اور انگریزی فوج کا رعب داب ہلکا کر دیا تھا اس لئے اس کو ہٹا کر یورپ کا مایۂ ناز فرزند جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر بنا دیا گیا۔

ان دونوں نے یہاں آکر ہر طرف سازشوں کا پہلے جال بچھایا اور پھر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، کارنوالس نے انگریزی فوج کے ساتھ حیدر آباد کی ۶۰ ہزار فوج کو لے کر سلطنت میسور پر چڑھائی کر دی، اگلا دستہ کرنل فلائڈ کے تحت تھا، سلطان ٹیپو کی فوج سے سب سے پہلے اسی کی ٹکر ہوئی، سلطانی فوج سیلاب کی طرح آگے بڑھی اور زبردست گولہ باری کر کے کرنل فلائڈ کی فوج کو تتر بتر کر دیا، کرنل فلائڈ زخمی ہو کر گر پڑا، اور انگریزی فوج میدان چھوڑ کر فرار ہوگئی، سلطان ٹیپو نے چار سو انگریزی سپاہیوں کو گرفتار کر کے دارالسلطنت سرنگا پٹم کے جیل خانے میں بھیج دیا۔

دوبارہ کارنوالس نے ایک زبردست فوج تیار کی جس میں خود کارنوالس کے ماتحت ۲۲؍ ہزار انگریزی فوج تھی اور دوسرے انگریز جنرل امبر کرامبی کے تحت نو ہزار حیدر آباد کی فوج، ۱۸؍ ہزار مرہٹی فوج ہری پنتھ اور پرسرام راؤ کے ماتحت ۳۲؍ ہزار تھی،

جملہ ۸۱ ہزار کا لشکر جرار لے کر دوبارہ سلطان ٹیپو سے نبرد آزما ہوا اور طوفان برق وباد بن کر سلطانی افواج پر چھا گیا، پھر بھی میسور کی فتح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، انجام کار فریقین میں کچھ دنوں کے لئے صلح ہوگئی اور کارنوالس کے دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی اور وہ اپنی بدنامی کا داغ نہ دھوسکا، اور ''بہت بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے'' کہتا ہوا ہندوستان سے رخصت ہوگیا، اور انگلینڈ میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔

لارڈ ولزلی:

تقریباً تیس سالوں سے انگریز نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے پنجہ آزمائی کرتے رہے تاکہ ہندوستان پر قبضہ کی راہ میں جو سنگ گراں حائل ہے اسے دور کردیں، لیکن ہزاروں انگریزوں کو جنگ کے دیوتا کی بھینٹ چڑھا کر بھی ان کی مراد پوری نہیں ہوئی اور بزورِ شمشیر اس کو میدانِ جنگ میں شکست نہ دے سکے، اس لئے لارڈ کارنوالس اور سر جان شور کو واپس بلا کر ایک سازشی ذہن کے انگریز کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا گیا جس کا زرخیز دماغ سازشوں کا سرچشمہ تھا وہ تاریخ میں لارڈ ولزلی کے نام سے مشہور ہے، اس نے اپنے پیش رووں سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ بنگال میں میر جعفر کو سراج الدولہ سے غداری پر آمادہ کرکے قبضہ کیا گیا ہے تو اس نے سوچ لیا کہ یہ طریقہ کار اگر بنگال میں کامیاب ہوسکتا ہے تو میسور میں اس کے ناکام ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور اس نے فوجی طاقت میں اضافہ کے بجائے ضمیر فروشوں اور وطن دشمنوں کی سرگرمی سے تلاش شروع کردی، ضمیر فروشوں کی دنیا میں نہ کمی رہی ہے اور نہ آج ہے، انگریز ''جعفر از بنگال'' کا تماشہ دکھا چکے تھے اب ''صادق از دکن'' کا ڈرامہ شروع کردیا، میر صادق سلطان ٹیپو کا وزیر اعظم تھا اور اس ڈرامہ کا دوسرا ایکٹر پورنیا تھا جو وزیر خزانہ تھا، دونوں نے انگریزوں کے ہاتھوں اپنے ضمیر، اپنے وطن اور اپنے ایمان کا سودا کرلیا، میر صادق کے ساتھ ''میروں'' کے ایک جتھے میر قاسم علی، میر

معین الدین، میر غلام علی لنگڑا نے اور پورنیا کے ساتھ ترمل راؤ، کرشن راؤ وغیرہ کی ٹولی نے انگریزوں سے ساز باز کر لی اور دو انگریزوں کو رات میں بلا کر قلعہ کے سارے راستوں سے واقف کرا دیا اور انگریزوں اور غداروں کے درمیان دوران جنگ کی حکمت عملی طے کر لی گئی۔

انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے معتمد اور کلیدی عہدوں کے ذمہ داروں کو جب اپنا ہم نوا بنالیا تو یک بیک انگریزی فوجیں سیدھی دارالسلطنت سرنگاپٹم پہنچ جاتی ہیں، سلطان کے فوجی سردار جو دشمنوں پر نظر رکھنے کے لئے سارے راستوں پر متعین تھے ان میں سے کسی نے بھی انگریزی فوج سے مزاحمت نہیں کی بلکہ سلطانی افواج کے سردار دم ہلاتے ہوئے کتوں کی طرح انگریزی فوج کے پیچھے پیچھے چل رہے، انگریزوں نے ٹھیک قلعہ کے سامنے پہنچ کر گولہ باری شروع کر دی، سلطان ٹیپو قلعہ میں محصور ہو گیا، اور اپنے وفادار سپاہیوں کے ساتھ مدافعت کرتا رہا، قلعہ کی فصیلوں سے دشمنوں پر گولہ باری جاری تھی کہ سازش کے تحت عین لڑائی کے وقت پورنیا نے مورچہ میں یہ خبر پہنچائی کہ سپاہی تنخواہیں لیجائیں اور وہ مورچہ چھوڑ کر چلے گئے، اور غدار افسروں نے توپ کے گولوں میں سن اور مٹی ملا دی تھی اس لئے توپیں چلتی تھیں اور پٹاخوں کی طرح آواز کر کے سرد ہو جاتی تھیں، نتیجہ ظاہر ہے انگریزی فوج قلعہ میں گھس آئی اور سلطان ٹیپو دست بدست جنگ کرتے ہوئے اندرونِ فصیل شہید ہو گیا، پچاس سال پہلے بنگال میں میر جعفر کے ذریعہ سراج الدولہ کی حکومت کو انگریزوں نے تباہ کیا اور اس کے ٹھیک پچاس سال بعد میر صادق کو آلہ کار بنا کر ہندوستان کے مایہ ناز سپوت سلطان ٹیپو کے سینے میں خنجر اتار دیا گیا۔

جعفر از بنگال وصادق از دکن
ننگ ایمان، ننگ دین، ننگ وطن

گاندھی جی نے سلطان ٹیپو کے ساتھ غداری کرنے والے پورنیا کے بارے میں اپنے انگریزی اخبار ''ینگ انڈیا'' کے ایک مقالہ میں لکھا تھا:

''میسور کا بادشاہ سلطان ٹیپو انگریز مورخوں کی نگاہ میں متعصب مسلمان تھا

جس نے اپنی ہندو رعایا کو بہ جبر مسلمان بنایا، لیکن یہ سب جھوٹ ہے......اس عظیم المرتبت سلطان کا وزیر اعظم ایک ہندو تھا، جس نے، نہایت شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے مجاہد آزادی اور فدائے وطن کو دغا دے کر ہندوستان کو انگریزوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ (تاریخ سلطنت خداداد مطبوعہ لاہور ص ۵۳۱)

ہندوستان ہمارا ہے:

ضمیر فروش غداروں نے اس آہنی پھاٹک کو توڑ دیا جو ہندوستان کو غلام بنانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا، شیر دل ٹیپو جس کو انگریزوں کی مجموعی طاقت میدان جنگ میں شکست نہ دے سکی، اس کو سازشوں کے جال میں جکڑ کر بے بس کر دیا اور جب ان کو یقین ہوگیا کہ سلطان ٹیپو اب اس دنیا میں نہیں رہا تو مدراس کے انگریزوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، تاریخ سلطنت خدا داد کا مصنف ہم کو بتاتا ہے کہ جب جنرل ہارس سلطان ٹیپو کی لاش پر آیا تو خوشی سے پاگل ہوگیا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ''اب ہندوستان ہمارا ہے''۔ (ص ۳۱۸)

ہندوستان سے لے کر انگلینڈ تک جشن فتح منایا گیا، ۶ر فروری ۱۸۰۰ء کو کلکتہ میں جشن فتح کے سلسلے میں جس شان کا جلوس نکالا گیا، اب تک ہندوستان میں انگریزوں کا اس شان کا کوئی جلوس نہیں نکلا تھا، سر جان اینس ٹروتھر جو اس وقت کلکتہ کا چیف جسٹس تھا اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

''ٹیپو کی طاقت ہی ہماری فوجوں کو شکست دینے کے لئے کافی تھی، یہ اس زمانے میں خاص طور پر قابل توجہ تھی اس کے مرتے ہی ہندوستان میں ہمارا قبضہ ہمیشہ کے لئے ہوگیا۔ (ص ۱۷)

انگریزوں کا انتقام:

سلطان ٹیپو کے نام سے قصر بکھنگم میں زلزلہ آجاتا تھا، دہشت و مرعوبیت کا عالم

یہ تھا کہ انگلستان کی عورتیں اپنے بچوں کو ڈرانے کیلئے کہتی تھیں، ''دیکھو، سو جاؤ، ورنہ ٹیپو آ رہا ہے، تمہیں کھا جائے گا'' مارے غصے کے انگریز اپنے کتوں کے نام ٹیپو رکھتے تھے، انگریزوں کی محفلوں میں ٹیپو کا نام آتے ہی ان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا تھا اور ان کی پیشانیوں پر سلوٹیں پڑ جاتی تھیں، نفرت وغصہ سے ان کے چہرے اور سرخ ہو جاتے۔

سلطان ٹیپو کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے انگریزوں کو لوہے کے چنے چبانے پڑے اس لئے کہ دو بار حیدر علی اور ٹیپو نے انگریزی فوجوں کو ساحل سمندر تک کھدیڑ دیا تھا، اگر ان دونوں نے سانپ کے پھن کو اسی دن کچل دیا ہوتا جب کہ وہ ہر طرح ان پر قابو پا چکے تھے تو شاید ہمارا ملک غلامی کی ذلت میں گرفتار ہی نہیں ہوتا، ہزاروں انگریز حیدر علی اور ٹیپو سے ہونے والی چار لڑائیوں میں مارے گئے، کتنے انگریز جنرلوں اور کرنلوں کو ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' چاٹ گئی، جس کی وجہ سے انگلینڈ کے ہزاروں خاندانوں میں صبح وشام سلطان ٹیپو کو گالیاں دی جاتی تھیں، آگ اور خون کے کتنے دریا پار کر کے انگریز اپنی منزل پر پہنچے؟ اور جب وہ اپنی مشکلات اور مصائب کو یاد کرتے ہیں تو ان کے دل سلطان کے خلاف نفرت اور غم وغصہ سے بھر جاتے ہیں اسی غم وغصہ کا نتیجہ ہے کہ ایک درجن انگریزوں نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی زندگی پر کتابیں لکھیں اور ہر کتاب میں یہ کوشش کی گئی کہ سلطان ٹیپو کو زیادہ سے زیادہ بدنام کر دیا جائے، اس کے علاوہ ان کو ٹیپو سے انتقام لینے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آئی، لیکن جب سچائی کی تلاش کی جاتی ہے تو انگریزوں کی دروغ بیانی کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

انگریز مصنّفین نے مسلمان حکمرانوں میں اورنگ زیب کے بعد جس شخصیت کو بدنام کرنے کے لئے اپنے قلم کی نوک سے زہر میں بجھے ہوئے تیروں اور نیزوں کا کام لیا ہے وہ یہی سلطان ٹیپو ہے، آج ہمارے ملک میں تنگ نظر، تنگ دل، فرقہ پرست انگریزوں کا چبایا ہوا لقمہ چبا رہے ہیں اور ان کی کتابوں سے جھوٹے الزامات کو لے کر سلطان ٹیپو کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنی حکومت کی پالیسی کے پیش نظر ہندو، مسلم کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع سے وسیع

تر بنانے کے لئے یہ کتابیں لکھی تھیں جس میں سچائی کم اور فرضی الزامات زیادہ ہیں، تاریخی حقائق ان کی نفی کرتے ہیں، افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کو آزاد ہوئے چالیس سال کا عرصہ گزر چکا لیکن آج تک برادران وطن بالخصوص تنگ دل، فرقہ پرست انگریزوں کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہوسکے، یہ بہت ہی عبرتناک المیہ ہے۔

ہم سلطان ٹیپو کی زندگی کے سلسلہ میں کچھ حقائق پیش کرتے ہیں جن سے اس کی عظمت کا اندازہ ہوگا اور اگر آپ انصاف پسند دل کے مالک ہیں، اور صداقت کے تسلیم کرنے کو انسانیت کا ایک شرف سمجھتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کا دل پکار اٹھے گا کہ سلطان ٹیپو ہندوستان کا ایک قابل فخر حکمراں تھا، جس نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لئے ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے اور اپنے عظیم و بے مثال مجاہدانہ کارناموں کی بدولت اس کا حق رکھتا ہے، کہ آزاد ہندوستان کے پارلیمنٹ ہاؤس کے میدان میں اس کا مجسمہ نصب کیا جائے۔

سرزمین میسور آواز دیتی ہے:

چونکہ انگریزوں نے اپنی کتابیں نفرت اور غم وغصہ کی فضا میں لکھی ہیں اس لئے انہوں نے دانستہ حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور سلطان ٹیپو کے محاسن کو مثالب کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، ان حالات میں انگریز مصنّفین کی تاریخوں پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس لئے سچائی اور اصل حقیقت کی تلاش کے لئے ہمیں دوسرے راستے اختیار کرنے پڑیں گے، اس لئے آیئے سرزمین میسور کا سفر کریں، محکمہ آثار قدیمہ کا جائزہ لیں، مندروں میں چلیں اور ان کے محفوظ ریکارڈوں کا معائنہ کریں، ان کے درودیوار اور ان کے گنبدوں سے سوالات کریں یقیناً وہ ہم کو صحیح جوابات دیں گے کیونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے سلطان ٹیپو کو دیکھا ہے وہ اس سے براہ راست واقف ہیں، میسور گزیٹر کے رجسٹروں کو کھنگالیں، میسور آرکولاجیکل کی طرف سے شائع ہونے والی رپورٹوں کا باریک بینی سے تجزیہ کرلیں، صداقت مل کر

رہے گی، رات چاہے کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہو اگر ایک بھی جگنو کہیں چمک رہا ہوگا تو ضرور نظر آجائے گا۔

ٹیپو پر الزامات کی فہرست:

انگریزوں نے سلطان ٹیپو کو بدنام کرنے کے لئے دو باتیں بڑے شد و مد سے بیان کی ہیں جن سے ان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے کیوں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کی حکومت ایک دن بھی نہیں چل سکتی تھی۔

پہلا فرد جرم یہ ہے کہ سلطان ٹیپو سخت متعصب مسلمان تھا، اس نے مندروں کو ڈھایا اور منہدم کرایا ہے یا جلایا ہے؟ اس کا دوسرا جرم یہ تھا کہ اس نے ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنایا ہے، ہم انہیں دونوں اتہامات کا جائزہ لیتے ہیں اور خود سرزمین میسور سے اس کے متعلق سوال کرتے ہیں، دیکھئے وہ کیا جواب دیتی ہے؟

ٹیپو سچا اور پکا مسلمان تھا:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سلطان ٹیپو سچا اور پکا مسلمان تھا، سچا مسلمان پیدائشی طور پر بہترین حکمراں ہوسکتا ہے کیوں کہ وہ اصول حکمرانی جانتا ہے، اسلام نے بہت تفصیل سے اس کو آداب حکومت سکھائے ہیں اس لئے جو جتنا ایماندار، سچا اور مخلص مسلمان ہوگا اتنا ہی اس کا طرز حکمرانی مثالی ہوگا اور اس ملک کے باشندوں کے لئے چاہے وہ کسی قوم اور مذہب وملت کے ہوں اس کا دور حکمرانی سراپا رحمت ہوگا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ حکمرانی کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے، پورا یورپ بھی اگر اپنے دل ودماغ کی ساری غلاظتوں کو اگل دے تب بھی حضرت عمر فاروقؓ کے صاف وشفاف دامن پر دھبہ نہیں پڑسکتا ہے اس لئے اگر سلطان ٹیپو سچا اور پکا مسلمان تھا تو یہ عیب کیسے ہوگیا؟ انگریز مصنّفین نے اپنی فطرت سے مجبور ہوکر اس کو

متعصب کہا ہے جب کہ نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی پوری زندگی سے اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں جا سکتی بلکہ اس کے برعکس دونوں کی غیر جانبداری، مذہبی رواداری کی درجنوں ناقابل تردید مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، موافق ومخالف دونوں طرح کی کتابوں کو طاق پر رکھ دیجئے اور آیئے ہم خود سرزمین میسور چلتے ہیں، اس کی شہادت ہی ہمارے لئے فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

حیدر علی کا عہد حکومت:

نواب حیدر علی کا عہد حکومت مذہبی رواداری اور غیر جانبداری کے لئے سرزمین میسور میں زبان زد خلائق تھا، اس کا پرائیویٹ سکریٹری ایک ہندو کھنڈرے راؤ تھا جو برہمن تھا اور جلوت وخلوت میں اس کے ساتھ رہتا تھا، اس کے مقرب ترین وزیروں میں کشن راؤ اور پورنیا مشہور ہیں، ان کے علاوہ ریاست میسور کے ہندو زمینداروں جاگیرداروں اور علاقہ داروں پر اس کا اتنا اعتماد تھا کہ اکثر سیاسی مجرمین اور انگریزی قیدیوں کو انہیں کی نگرانی میں رکھتا تھا اور وہ بھی حیدر علی کے اتنے وفادار تھے کہ کبھی یہ اعتماد مجروح نہیں ہوا، مذہبی رواداری کے سلسلہ میں یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ میسور میں جتنے قدیم مندر تھے سب کی جاگیروں کو نہ صرف یہ کہ بحال رکھا بلکہ اپنی طرف سے بھی جاگیریں دیں اور انعامات دیئے جن کی اسناد آج تک ان مندروں میں محفوظ ہیں، اور تاریخ میسور پر تحقیق کرنے والوں میں سے بہت سے محققین نے ان سندوں کو حاصل کر کے اپنی کتابوں میں نقل بھی کیا ہے، خود گاندھی جی نے اپنے اخبار ”ینگ انڈیا“ کی اشاعتوں میں ان سندوں اور دستاویزوں کا ذکر کیا ہے اور ان خطوط کا خلاصہ لکھا ہے جو ان مندروں کے مہنتوں اور گروؤں کو لکھے گے ہیں، یہ اسناد ودستاویز اور خطوط آج بھی ان مندروں میں موجود اور محفوظ ہیں اور ان کو دیکھا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ میسور محکمہ آثار قدیمہ کی جو سالانہ رپورٹیں شائع ہوتی رہی ہیں ان میں بھی ان سندوں کا ذکر موجود ہے مثلاً میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۴ء میں

ہے کہ:

۱- دیون ہلی کے مندر میں جو ناقوس استعمال میں ہے وہ نواب حیدر علی کا عطیہ ہے۔

۲- میسور آرکولاجیکل رپورٹ ۱۹۱۶ء کے صفحہ ۷۳ پر حیدر علی کے ایک خط کا ذکر ہے جو مندر کے گرو کے نام لکھا گیا تھا جو مطلاً و مذہّب ہے۔ (ص ۱۶۷)

۳- سری نگر کے مندر میں نواب حیدر علی کی لکھی ہوئی سندیں موجود ہیں جو بطور ریکارڈ محفوظ ہیں ان میں ایک وہ خط ہے جو نواب نے ۱۷۶۹ء میں یہاں کے گرو کو لکھا تھا، اس میں نواب نے تحریر کیا تھا:

''آپ کی شخصیت واجب التعظیم اور آپ کا تقدس باعث برکت ہے، یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ہر شخص کے دل میں آپ سے ملنے اور سعادت حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو، معلوم ہوا ہے کہ صاحب رگھوناتھ راؤ پیشوائے پونا آپ سے ملنا اور آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ آپ کو ان کے پاس بغرض ملاقات بھیجا جائے اس لئے اب آپ سے درخواست ہے کہ آپ پونا تشریف لے جا کر صاحب موصوف کی خواہش کو پورا کریں، آپ کے اس سفر کے لئے ایک ہاتھی، ایک پالکی، پانچ گھوڑے اور پانچ اونٹوں کا انتظام کر دیا گیا ان کے علاوہ دیوتا کے لئے زریں کپڑے، آپ کے علَم کے لئے پانچ ریشمی تھان اور خاص آپ کے لئے خلعتیں اور ایک جوڑی شال بھی ارسال خدمت ہے، اخراجات سفر کے لئے ساڑھے دس ہزار روپے ارسال ہیں۔ (ص ۱۶۹)

یہ ایک بادشاہ وقت کا خط ہے اس کا طرز خطاب اور لب ولہجہ خاص طور سے قابل توجہ ہے، بادشاہ کی طرف سے کسی مکتوب الیہ کے لئے جو اس کی رعایا میں ہے درخواست کرنے کا جملہ لکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن نواب حیدر علی اپنی حکومت میں رہنے والے ایک غیر مسلم گرو کے لئے وہی الفاظ استعمال کرتا

ہے جو ایک خادم اپنے مخدوم کے لئے استعمال کرتا ہے، کیا اس مذہبی رواداری کی کوئی دوسری مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے؟ کیا کسی ہندو دشمن اور مندروں کو ڈھانے والے کا یہ طرزِ عمل ہوسکتا ہے؟؟

۴- اسی میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء کے صفحہ ۳۷ میں نواب حیدر علی کے ایک دوسرے خط کا بھی ذکر ہے جو مندر میں موجود ہے، یہ خط سوامی ابھینوا نرسمہا بھارتی کے نام ہے، جس میں سوامی جی کی طرف سے لکھے گئے خط اوران کے تحفوں کی وصولیابی کا ذکر ہے، اور گرو جی کو یقین دلایا گیا ہے کہ مندر کے نام جو انعام ہیں وہ بحال رکھے جائیں گے اور سوامی جی سے درخواست کی گئی ہے کہ آپ بہ اطمینان مندر میں اقامت کریں اور سرکاری تحائف جو ارسال کئے جارہے ہیں ان کو قبول فرمائیں۔ (تاریخ سلطنت خداداد ص ۱۶۹)

۵- اسی سال کی رپورٹ میں ایک اور خط کا بھی ذکر ہے، یہ خط ۱۷۸۰ء کا ہے، یہ ایک حکمنامہ ہے جو سرکاری حکام کو لکھا گیا ہے اور مندر کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، اس میں حکومت کے اہل کاروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ سری نگر مندر کی جاگیروں میں مندر کے ملازم اپنی جانب سے جو محصولات وصول کرتے ہیں ان میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کی جائے، اس حکم نامہ پر حیدر علی کی مہر اور سنہ ہجری لکھا ہوا ہے۔ (تاریخ سلطنت خداداص: ۱۷۰)

۶- سری رنگا پٹم (دارالحکومت) کا سب سے بڑا مندر جو سری رنگناتھ جی کے نام سے مشہور ہے، نواب حیدر علی کا بنوایا ہوا ہے، اس کے لئے میتھک سوسائٹی جرنل ماہ اپریل ۱۹۳۹ء کا شمارہ دیکھا جائے، اس کے ۴۵۴ پر یہ تحریر ہے:

''۱۷۷۴ء میں قدیم الدین خاں نامی ایک شخص کے گھر میں آگ لگ گئی جس کی وجہ سے بہت سی جانوں کے اتلاف کے علاوہ سری رنگناتھ کا مندر بھی جل کر تباہ ہوگیا''۔

حیدر علی نے اس مندر کو دوبارہ تعمیر کیا‘‘۔ (ص ۱۷۰)

۷۔ اسی جرنل میں ایپی گرافی کرناٹکا جلد پنجم صفحہ ۳۷ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا گیا ہے، کہ ’’بیلور میں گنگا سیوا کے مندر کا درمیانی قبہ حیدر علی کا تعمیر کردہ ہے۔‘‘

حیدر علی کی حکومت میں مذہبی رواداری اور وسعت ظرفی کی یہ چند ایسی ٹھوس اور مضبوط شہادتیں ہیں کہ اس سے متعصب سے متعصب انسان بھی انکار نہیں کرسکتا، اگر حیدر علی اور سلطان ٹیپو متعصب مسلمان تھے تو انہوں نے اپنے غیر مذہب کے مندروں کی تعمیر میں کیسے حصہ لیا؟ یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ انگریز مورخین کا گھڑا ہوا افسانہ ہے جن کا ذہن ومزاج خود تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور دانستہ جھوٹ بولتے ہیں، ان کے طبع زاد افسانوں کی تردید کے لئے یہ حقائق کافی ہیں، ہم یہ تو بلا تکلف تسلیم کرتے ہیں کہ حیدر علی اور ٹیپو سچے اور پکے مسلمان تھے انہوں نے یہ کام مداہنت کی وجہ سے اور مذہبی عقیدے میں کمزوری کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اصول حکمرانی کے تحت کیا ہے، ایک سچا مسلمان حکمران اپنے حدود حکومت میں آباد ہر فرقہ اور ہر مذہب کی عبادت گاہوں کا محافظ ہے، اس کا مذہب اس کو اس سے نہیں روکتا ہے، حیدر علی نے جو کچھ کیا وہ اس کی حکومت کی طرف سے عائد ایک فرض کی ادائیگی تھی۔

کہا یہ جارہا تھا کہ باپ بیٹوں نے ہندو مندروں کو منہدم کیا ہے، یہاں انہدام کے بجائے تعمیر، ویرانی کے بجائے آبادی، مندروں کی جائداد کی ضبطی کے بجائے تحائف، انعامات اور مالی امداد کا ثبوت ملتا جارہا ہے، انصاف اور انسانیت وشرافت کا تقاضا ہے کہ انگریز مورخین کی جوش انتقام میں پھیلائی ہوئی افواہوں کی تردید ان لوگوں کی طرف سے ہونی چاہئے جن کے دلوں کو ان جھوٹی افواہوں اور کہانیوں سے دلی تکلیف پہنچی ہے، کیا ہماری یہ توقع صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ **الیس منکم رجل رشید؟**

سلطان ٹیپو کے عہد حکومت میں:

حیدر علی سے کہیں زیادہ اس کے بیٹے سلطان ٹیپو کی ذات کو نشانہ بنایا گیا ہے اور اس کی ذات پر الزامات واتہامات کا طومار باندھ دیا گیا ہے لیکن جب ہم ان الزامات کی تحقیق کے لئے سرزمین میسور میں پہنچتے ہیں تو وہاں کا ذرّہ ذرّہ ان افسانوں اور جھوٹی افواہوں کے خلاف شہادت دیتا ہے، اور بے لچک گواہی دیتا ہے کہ سلطان ٹیپو کا دامن بے داغ اور ان سارے الزامات واتہامات کے دھبوں سے قطعاً پاک اور صاف شفاف ہے، چند شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہم سب سے پہلے سری نگری کے مندر چلتے ہیں، یہ مندر تمام جنوبی ہند اور خاص طور پر ریاست میسور میں نہایت متبرک اور مقدس مانا جاتا ہے، یہاں کے گرو اکثر راجاؤں اور مہاراجوں کے مذہبی رہنما اور گرو سمجھے جاتے رہے ہیں، ہندوؤں کی سب سے بڑی حکومت وجیا نگر کے راجاؤں کی پیشانیاں اسی مندر کی چوکھٹ پر جھکتی تھیں اور اس کے گرو کو اپنا گرو مانتے رہے ہیں، سری نگری کے اس مندر میں آج تک حیدر علی کے تین اور سلطان ٹیپو کے تیس خطوط اور فرامین موجود ہیں، جیسا کہ میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء میں صراحت کی گئی ہے، خود گاندھی جی نے ان خطوط اور فرامین کو دیکھا ہے اور اپنے اخبار ''ینگ انڈیا'' میں ایک شاندار اور مدلل مضمون سلطان ٹیپو کی بے تعصبی اور مذہبی رواداری پر سپرد قلم کیا ہے۔

یہ تمام خطوط اور فرامین سرخ کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں اور اکثر خطوں پر سلطانی مہر لگی ہوئی ہے ان خطوط میں بخلاف دوسرے خطوط کے جن میں سلطان کا نام پہلے لکھا جاتا تھا، سلطان نے سری نگری کے گرو کا نام اور القاب پہلے لکھا ہے اور اپنے نام کے ساتھ کوئی خطاب یا القاب استعمال نہیں کیا ہے، ان خطوں میں سے ایک خط گرو جی کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے گرو جی نے سلطان کے نام اپنے خط میں مندر پر پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا ہے، مرہٹے جو اپنے کو ہندو کہتے ہیں ان کی فوج پر سرام بھاؤ

کے ماتحت سری نگری پہنچی اس نے پوری آبادی کو تاخت وتاراج کیا اسی کے ساتھ سری نگری کے اس مشہور مندر کو بھی لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا اور سارا دیوی کا بت مندر سے نکال کر باہر پھینک دیا تھا، مندر کے جملہ نقصان کا اندازہ ساٹھ لاکھ روپیہ بتایا گیا تھا، مندر کے ہاتھی، گھوڑے اور سونا چاندی اور زیورات وغیرہ مرہٹی فوج لوٹ کر لے گئی تھی اس خط کے جواب میں سلطان ٹیپو نے گروجی کو تحریر کیا ہے کہ:

۸- ''ہم ان دشمنوں کو سزا دے رہے ہیں جو ہمارے ملک پر چڑھائی کر کے ہماری رعایا کو ستا رہے ہیں، آپ کی ذات تقدس مآب اور تارک الدنیا ہے، اس لئے آپ اور مندر کے دوسرے برہمن بھی ملک کے دشمنوں کی تباہی کے لئے دعا کریں کہ ہمارا ملک محفوظ اور ہماری رعایا خوش وخرم رہے''۔

(تاریخ ص ۵۲۲)

گروجی نے اپنے دوسرے خط میں سلطان کو لکھا تھا کہ میں فی الحال دوسری جگہ اقامت گزیں ہوں، مرہٹوں نے بہت سے برہمنوں کو قتل کیا ہے اور زخمی کیا ہے، اور سارا اثاثہ لوٹ کر لے گئے ہیں، اب بغیر حکومت کی مدد کے سارا دیوی کا بت دوبارہ مندر میں نصب نہیں کیا جا سکتا، اس کے جواب میں سلطان ٹیپو نے گروجی کو لکھا کہ:

۹- ''ان لوگوں کو جو مقدس مقامات کی بے حرمتی کرنے سے باز نہیں آتے یقین ہے کہ اس کالی یوگ میں انہیں بہت جلد اپنے کرتوتوں کا خمیازہ ملے گا، لوگ بدی کا کام ہنستے ہوئے کرتے ہیں لیکن خمیازہ روتے ہوئے بھگتیں گے، گرووں سے دغابازی خود اپنی نسل کو منقطع کرتا ہے''۔ (تاریخ ص ۵۲۲)

۱۰- اس خط کے ساتھ سلطان نے ایک حکم نامہ نگر کے آصف کے نام بھیجا تھا جو ریکارڈ میں محفوظ ہے، اس میں حاکم علاقہ کو حکم دیا گیا تھا کہ دوسو راحتی (سلطانی اشرفی) نقد اور دوسو راحتی (اشرفی) کی اجناس فوراً گروجی کی خدمت میں پیش کرے۔

۱۱- سلطان ٹیپو نے جب گرو جی کی بے سروسامانی کی اطلاع ان کے خط سے پائی تو ایک خط میں گرو جی کو لکھا کہ:

''آپ کو اختیار ہے کہ انعامی دیہات سے جن چیزوں کی ضرورت ہو حاصل کریں اس رقم اور جنس سے سارا دیوی کے بت کو نصب کرتے ہوئے برہمنوں کو کھانا کھلائیں اور دشمنوں کی تباہی کے لئے دعا کریں''۔ (تاریخ ص:۵۲۲)

۱۲- ایک اور خط میں سلطان ٹیپو نے گرو جی کو تحریر کیا ہے کہ ''آپ کا بھیجا ہوا پرساد اور شالیں موصول ہوئیں آپ کے استعمال کے لئے ایک جوڑی شال اور سارا دیوی کے بت کے لئے کپڑے روانہ کئے جاتے ہیں۔ (ص ۵۲۳)

۱۳- ایک خط میں سلطان ٹیپو نے گرو جی کو اطلاع دی ہے کہ آپ کی خاص سواری کے لئے ایک ہاتھی روانہ کیا جا رہا ہے، گرو جی نے سلطان ٹیپو کو خط لکھا کہ مندر میں دو خاص پوجا کی رسمیں ادا کی جانے والی ہیں حکومت سے امداد کی درخواست ہے کیوں کہ یہ پوجا ۴۸ دنوں تک مسلسل چلے گی اور اس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں، سلطان نے درخواست کو منظور کرتے ہوئے لکھا کہ:

۱۴- آپ کی حسب مرضی پوجا کے دنوں میں روزانہ ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلانے اور نقدی دینے کے متعلق نگر کے آصف کو حکم بھیج دیا گیا ہے۔

(تاریخ سلطنت خداداد ص:۵۲۳)

۱۵- پوجا کے انتظامات کے سلسلہ میں جو حکم نامے جاری ہوئے تھے اور حکام کو سلطان کی طرف سے ہدایات دی گئی تھیں یہ تمام کاغذات بھی ریکارڈ میں محفوظ ہیں، ایک حکم نامہ میں نگر کے آصف محمد رضا کو ہدایت دی گئی ہے کہ:

''پوجا کے دنوں میں خاص انتظام رکھے تا کہ شریر لوگ مندر کے کاموں میں مداخلت نہ کر سکیں''۔

۱۶- ایک دوسرے خط میں سلطان ٹیپو نے گرو جی کو خبر دی کہ:

''سارا دیوی کے بت کے استعمال کے لئے ایک پالکی اور گرو جی کے استعمال

کے لئے دوسری پالکی بذریعہ چوبدار فقیر محمد روانہ کی جاتی ہے۔ (ص ۵۲۳)

۱۷- ریکارڈ میں سلطان کا ایک اور خط ہے جس میں نگر کے آصف کو حکم دیا گیا ہے کہ:

وانمباڑی قوم (جو ایک خانہ بدوش ہندو قوم ہے اور جنگلوں میں رہتی ہے اور لوٹ کھسوٹ کرتی رہتی ہے) کے حملوں سے مندروں کو محفوظ رکھنے کے لئے پیادہ فوج کے سپاہیوں کو مندر کی حفاظت پر مامور کر دیا جائے تاکہ وہ حملہ آور نہ ہوسکیں اور مندر کو نقصان نہ پہنچائیں۔

۱۸- مندر کے ریکارڈ میں سلطان کا ایک اور خط ہے جس میں شہر کے حاکم کو سلطان ٹیپو نے تحریر کیا ہے کہ:

''سوامی جی سمندری غسل کے لئے جانے والے ہیں ان کے لئے سفر میں تمام ضروریات مہیا کی جائیں''۔ (ص ۵۲۴)

۱۹- ایک خط میں سلطان نے گرو جی کو اطلاع دی ہے کہ آپ کے استعمال کے لئے چاندی کے دو چنور ارسال کئے جارہے ہیں (ص ۵۲۴) سوامی جی نے سلطان ٹیپو کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا کہ وہ پونا جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، مرہٹے جو مندر کا سامان لوٹ کر لے گئے ہیں اس کی واپسی کے لئے وہ خود پرسرام بھاؤ کے پاس جانا چاہتے ہیں تاکہ اس سے درخواست کریں کہ مرہٹی فوج نے مندر کے جو سامان لوٹ لئے ہیں ان کو واپس کر دیا جائے، اس کے جواب میں سلطان نے سوامی جی کو پروانہ راہداری دیتے ہوئے عمالان حکومت کو لکھا کہ

۲۰- ''دورانِ سفر سوامی جی کو ہر قسم کا آرام اور تمام ضروریات مہیا کی جائیں''۔

۲۱- سوامی جی کو سلطان نے ایک خط میں لکھا کہ آپ کے استعمال کے لئے شالیں، ہاتھی، نوبت ونقارہ اور علَم بطور نذرانہ ارسال خدمت ہے پلیٹ ۱۷

نمبر۳ میں سلطان کا ایک خط اور بھی ہے، یہ خط سوامی جی کو اس وقت لکھا گیا جب سوامی جی کو پونا میں پرسرام بھاؤ کے پاس گئے ہوئے زیادہ عرصہ گذر گیا اور کشود کار کی کوئی شکل نہ بن سکی اس لئے واپسی میں توقع سے زیادہ تاخیر ہوئی تو سلطان نے لکھا کہ

۲۲- ''آپ جگت گرو ہیں، آپ دنیا کی بھلائی کے لئے ہمیشہ عبادت میں لگے رہتے ہیں، جس ملک میں آپ جیسی مقدس ہستی موجود ہو اس ملک پر خدا کی رحمت ہوتی ہے بارش اچھی اور فصلیں عمدہ ہوتی ہیں، آپ کو ایک غیر ملک میں اس قدر عرصہ ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے آپ اپنا کام نمٹا کر اپنے ملک واپس آجائیں۔

سوامی جی نے پونا سے سلطان کو لکھا تھا کہ مندر کی طرف سے برہمنوں کو جو کھانا کھلایا جاتا رہا ہے وہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے بند نہ ہو جائے بلکہ وہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے اس کے جواب میں سلطان نے سوامی جی کو تحریر کیا۔

۲۳- ''آپ کی ہدایت کے مطابق چھتروں (سراؤں) میں برہمنوں کو کھانا کھلایا جارہا ہے، آپ اپنی خیریت سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہیں''۔ (تاریخ سلطنت خداداد، ص ۵۲۵)

۱۷۹۸ء میں سوامی جی نے سلطان ٹیپو کو مطلع کیا کہ وہ پونا سے واپس آنے والے ہیں، اس کے جواب میں سلطان نے اپنے افسروں کے نام جو حکم نامہ جاری کیا ہے وہ بھی مندر کے رکارڈ میں محفوظ ہے اس حکم نامہ میں ہے:

۲۴- ''راستے میں سوامی جی کی تمام ضروریات فراہم کرتے ہوئے ان کے تمام اعزاز و مراتب کا لحاظ رکھا جائے''۔ (ص ۵۲۵)

سوامی جی جب سرنگری واپس آئے تو سلطان نے ان کو خط لکھا تھا جو ریکارڈ میں محفوظ ہے اس میں سوامی جی کو لکھا گیا کہ:

۲۵- ''پایہ تخت سرنگاپٹم میں تشریف لا کر درشن دینے کی زحمت فرمائیں''۔

(ص ۵۲۵)

سرنگری کے مشہور مندر میں جو۳۳ خطوط وفرامین نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے محفوظ ہیں ان میں سے نصف کے مندرجات کی طرف میں نے مختصر اشارے کئے ہیں، یہ خطوط وفرامین عرصہ گذر جانے کے باوجود محفوظ تھے اور اسی مندر سے اجازت لے کر دوسری سرکاری رپورٹوں، محکمہ جاتی کارروائیوں اور تحقیقی کام کرنے والوں نے اپنے مقالوں میں ان خطوط وفرامین کو نقل کیا ہے، ان کی موجودگی میں اگر کوئی تنگ نظر سلطان ٹیپو کی مذہبی رواداری کا قائل نہیں ہوتا اور اس کی وسعت ظرفی اور عالی ظرفی کا معترف نہیں ہوتا تو اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ سورج نصف النہار پر ہے اور دن کے وجود سے جو انکار کرتا ہے وہ آنکھ کا ہی اندھا نہیں عقل کا بھی اندھا ہے، اس کو متعصب اور ہندوؤں کا دشمن اور مندر کو تباہ وبرباد کرنے والا کہتا ہے تو وہ خود اندھا متعصب اور انسانیت وشرافت سے عاری، صداقت ودیانت کا دشمن اور بزدل انسان ہے کہ سورج کی طرح چمکتی ہوئی صداقتوں کو تسلیم کرنے کی اس میں جرأت وہمت نہیں ہے۔

کچھ دوسری شہادتیں:

یہ ۳۳ خطوط وفرامین ہی تنہا سلطان ٹیپو کو آفتاب وماہتاب بنانے کے لئے کافی ہیں لیکن مزید کچھ شہادتیں اور پیش کی جاتی ہیں تاکہ وہ لوگ جو سچائیوں کو انگلیوں سے چھو کر بھی ان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، دمکتا ہوا سورج ان کے سروں پر ہوتا ہے لیکن دن کے وجود سے ان کا انکار جاری رہتا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ سچائیوں اور صداقتوں کا تپتا ہوا سورج ان کے سروں پر اپنی تیز کرنیں بکھیرتا رہے تاکہ سورج اور دن کے وجود سے وہ انکار بھی کریں تو کم از کم سورج کی تمازت سے ان کا بھیجہ ہمیشہ کھولتا رہے۔

ریاست میسور مندوروں کی راجدھانی ہے، ہندوستان میں جن مندروں کی شہرت ہے ان میں سے کئی ایک میسور میں ہیں، میسور میں داخل ہوتے ہی سب سے زیادہ جو عمارتیں ہر جگہ نمایاں نظر آئیں گی وہ ہندوؤں کی قدیم پوجا پاٹ کی عمارتیں اور بلند وبالا مندر ہوں گے، ان میں سے بعض مندروں کی تعمیر ہزار سال پہلے کی ہے لیکن حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے کسی ایک مندر پر غلط نگاہ نہیں ڈالی بلکہ اس کے برعکس بہت سے مندروں کو ہدایا وتحائف دیئے، جاگیریں اور انعامی گاؤں دیئے، میسور کے بیشتر مندروں میں سلطان ٹیپو کی یادگاریں دوسو برس گذر جانے کے باوجود آج بھی موجود ہیں اور استعمال میں لائی جاتی ہیں اس سلسلہ میں صرف دو شہادتوں کو کافی سمجھتا ہوں، یہ دونوں محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے شائع ہونے والی رپورٹیں ہیں ان میں سے ایک میسور آرکولاجیکل رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء کی ہے اور دوسری رپورٹ ۱۹۱۷ء کی ہے، ۱۹۱۶ء کی رپورٹ میں میل کوٹ کے مندر کا ذکر ہے اس رپورٹ کے صفحہ ۶۷ پر ایک صراحی نما نقشہ دیا گیا ہے، یہ نقش اس نقارے پر ہے جو سلطان نے مندر کے استعمال کے لئے دیا ہے، تاریخ سلطنت خداداد کے مصنف کا بیان ہے کہ میری اس تصنیف کے وقت بھی یہ نقارہ مندر میں استعمال کیا جارہا ہے یہ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے اس نقارہ پر اس کے بنانے کی تاریخ، اس کا وزن اور سلطان کا نام تحریر ہے۔

۲۷- ۱۹۱۷ء کی رپورٹ میں صفحہ ۲۱ پر ہے کہ میل کوٹ کے مندر میں بعض زیورات اور سونے چاندی کے برتن پائے گئے ہیں ان پر جو تحریر ہے اس کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ سلطان ٹیپو کے دیئے ہوئے انعامات ہیں۔

۲۸- اسی رپورٹ کے صفحہ ۵۹ پر ہے کہ موضع کلالی KALALI تعلقہ تجن گڈھ میں لکشمی کنتا کے مندر میں چاندی کے چار پیالے، ایک طبق، اور ایک گلدان موجود ہے جو ٹیپو سلطان نے اس مندر کو دیئے تھے۔

۲۹- اسی علاقہ کے نارائن سوامی کے مندر میں ایک چاندی کا گلدان ہے جس پر ''عطیہ سلطان ٹیپو'' لکھا ہوا ہے۔

۳۰- دارالسلطنت سرنگاپٹم کا سب سے بڑا مندر حیدر علی کا تعمیر کردہ ہے، اس مندر کے استعمال کے لئے جو کپڑے اور برتن ہیں سب سلطان ٹیپو کے عطیئے ہیں۔

ینگ انڈیا کا اعتراف:

''ینگ انڈیا'' گاندھی جی کا مشہور اخبار ہے جو انگریزی میں شائع ہوتا تھا تاریخ میسور کے مصنف نے اپنی کتاب میں اس کے ایک مضمون کا ترجمہ دیا ہے، اس مضمون میں مالابار کے ایک مشہور مندر گرواپور سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ:

۳۱- ''مالا بار میں گرواپور کا مندر بہت پرانا اور مشہور ہے، مالابار کے ہندوؤں کا اگر اس کو کعبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، ہزاروں خوش اعتقاد اس کی زیارت کے لئے دور دور سے آتے ہیں، ٹیپو سلطان جب مالابار کو فتح کرتا ہوا گرواپور کے قریب پہنچا تو اس مندر کے پجاری بہت گھبرائے اور انہوں نے دیوتا کی بیش قیمت مورت کو ریاست ٹراونکور کے ایک مشہور مندر میں بھیج دیا، ٹیپو تو گرواپور سے دور ایک مقام پر ٹھہر گیا اور فوج کو گرداپور فتح کرنے کے لئے بھیج دیا، فوج نے گرداپور فتح کرلیا چونکہ ان مرہٹوں سے مسلمانوں کی سخت جنگ چل رہی تھی اس لئے بعض سپاہیوں نے مندر کی دیوار پر گھی چھڑک کر آگ لگا دی، ابھی یہ آگ زیادہ پھیلی نہ تھی کہ افسران فوج کو اس کی اطلاع ملی ان کو سلطان کے احکام کا خیال آیا اور فوراً آگ بجھا دی اور تین برہمنوں کو سلطان ٹیپو کے پاس بھیجا کہ شورش پسند سپاہیوں کی شکایت کریں، جب سلطان ٹیپو کو برہمنوں کے ذریعہ یہ اطلاع ملی تو تو رات کا وقت تھا، فوراً اس نے کوچ کر دیا اور گرداپور پہنچ گیا، آگ لگانے والے سپاہیوں کو سخت سزا دی اور مندر کو درست کرایا اور حکم دیا کہ آئندہ اس شہر سے جو بھی آمدنی ہو وہ سرکاری خزانے میں داخل کرنے کے بجائے ہمیشہ اس مندر کو دی جایا کرے اور

پجاریوں سے کہا کہ دیوتا کی مورتی کو فوراً واپس منگا کر اس مندر میں نصب کر دیا جائے۔" (تاریخ سلطنت خداداد ص ۵۲۹)

آخری شہادت:

آخر میں ایک ایسی شہادت اور ثبوت بھی پیش کیا جا رہا ہے کہ جس کے چہرے پر آنکھیں ہیں اور قدرت کی دی ہوئی ان میں روشنی موجود ہے وہ بھی دیکھ لے اور پھر یقین کر لے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت ہے، صداقت ہے، اصلیت اور سچائی ہے، اس کے خلاف جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ غلط ہے، جھوٹ ہے، الزام واتہام ہے اور کچھ نہیں۔

زوالِ سلطنت کے بعد سلطان ٹیپو کا پایۂ تخت سرنگا پٹم ایک عرصہ تک زیارتگاہ خلائق رہا ہے اب تو اس کی حیثیت ایک معمولی قصبہ کی ہو کر رہ گئی ہے پھر بھی اس دور کی بہت سی نشانیاں وہاں آج بھی موجود ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ ایک بار سرنگا پٹم کی سیر کر لیں تا کہ میری باتوں کی تصدیق میں آپ کو کوئی تردد نہ رہ جائے۔

ریلوے اسٹیشن سے اترتے ہی سب سے پہلے زائر کی نگاہ ان دو بڑے مندروں پر پڑتی ہے جو اسٹیشن سے بالکل قریب ہیں، سلطان کا محل انہیں مندوروں کے بالکل قریب تھا جس کو انگریزوں نے جوش انتقام میں ڈھا کر زمین بوس کر دیا، محل کے پیچھے محل سے لگا ہوا ایک اور بڑا مندر ہے، سلطان کے دورِ حکومت میں ان مندروں میں پوجا پاٹ کی رسمیں شان وشوکت سے برابر جاری رہیں، بنگلور میں بھی سلطانی محل سے لگا ہوا ایک چھوٹا مندر ابھی تک موجود ہے، اس کے علاوہ میسور کے علاقہ میں سرنگری، بیلور، نجن گڈھ، السور وغیرہ میں ایسے مندر موجود ہیں جن کی تعمیر صدیوں پہلے کی ہے سلطان نے ان مندروں سے اپنے دورِ عروج میں بھی کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے جاگیریں دیں، انعامات، ہدایات وتحائف دیتا رہا، گاندھی جی نے اپنے انگریزی

اخبار ''ینگ انڈیا'' میں انہیں مندروں کے سلسلہ میں لکھا تھا:

''ٹیپو کے محلات کے گرد و پیش شری ونکٹا رامنا، سری نواس، اور شری رنگنا تھ کے مندروں کی موجودگی سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا بین ثبوت ہے ...... وہ خدا کی عبادت میں پوجا کی گھنٹیوں سے پریشان نہیں ہوتا تھا، ہمیں بھی سلطان ٹیپو کے اس الہامی مقولے کو یاد رکھنا چاہئے۔

''دو دن شیر کی طرح جینا کتوں کی دو سو سال کی زندگی سے بہتر ہے''۔ (تاریخ سلطنت خداداد ص ۵۳۱)

سلطان ٹیپو پر ایک اور بڑا الزام:

تنگ نظر فرقہ پرست اور تنگ دل رجعت پسند سلطان ٹیپو پر ایک اور تہمت لگاتے ہیں کہ اس نے اپنے دور حکومت میں ہندوؤں کو بہ جبر واکراہ مسلمان بنایا، الزام لگانے والے تاریخ سے واقف نہیں، قدرتاً وسعت ظرفی سے بھی محروم ہیں کہ کسی صداقت کو پاکر اس کو کھلے دل سے تسلیم کرلیں، ان کے سفید فام آقاؤں نے جو سبق پڑھایا ہے، بس اسی کو رٹے جارہے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ الزام تراشی کی تہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے، اور جو شمشیر بے نیام انہوں نے انگریزوں سے مستعار لی ہے کہیں انہیں کی گردنیں نہ صاف کردے، سچ ہے بیوقوف وکیل سچا مقدمہ بھی ہار جاتا ہے الزام تراشی کرنے والے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

اگر وہ سلطان ٹیپو کو سچا اور پکا مسلمان کہتے ہیں تو ان کو یہ بھی تسلیم کرلینا چاہئے کہ وہ کسی بھی شخص کو بہ جبر واکراہ مسلمان نہیں بناسکتا کیوں کہ اس کے مذہب نے اس کو اس سے منع کیا ہے، یا تو سلطان ٹیپو کو متعصب مسلمان نہ کہیں اور اگر کہتے ہیں تو یہ تسلیم کرلیں کہ اس نے اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ایک بھی ہندو کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا کیوں کہ بیک وقت دونوں دعوے سچے نہیں ہوسکتے ہیں، اب آیئے اس الزام کی اصلیت تلاش کریں کہ یہ بات کہاں سے چلی؟ اور کیوں کر چلی؟

جب اس واقعہ کا علم ہو جائے گا تو صداقت خود اپنے کو تسلیم کرا لے گی۔

انگریز مؤرخین نے سلطان ٹیپو کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی جو مہم چلائی تھی اور اس کے کردار کو مسخ کرنے کی جدوجہد کی تھی اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ انگریز اور ہندو دونوں مل کر اس کی طاقت کو ختم کر دیں، میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ انگریزوں سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری تھا اور سلطان کی ان سے چار طوفان بدوش لڑائیاں ہوئیں اور جب انگریز شکست کھا کر اپنی پناہ گاہوں میں بھاگ جاتے تھے تو انگریزوں کی جگہ مرہٹے میسور پر دوڑ پڑتے تھے، اس طرح سلطان ٹیپو تخت نشینی کے وقت سے اپنی شہادت کے وقت تک مسلسل سلطنت خداداد کے ان دشمنوں سے پنجہ آزمائی کرتا رہا، والا جاہ اور نظام حیدر آباد کے انگریزی چرواہوں کے پالے ہوئے بھیڑیئے، مرہٹی فوج کے منہ کھولے ہوئے مگرمچھ، انگریزی کرنلوں اور جنرلوں کے پھنکارتے ہوئے اژدھے سب کے سب بیک وقت سلطان ٹیپو کو لقمۂ تر سمجھ کر نگل جانا چاہتے تھے لیکن ٹیپو ان سبھوں کے حلق کا کانٹا بن گیا تھا، اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ ٹیپو کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلائی جائے، جھوٹی افواہ پھیلا کر ٹیپو دشمن طاقتوں کو بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جائے اور پھر ایک چنگاری سے سلطان ٹیپو کی حکومت اور اقتدار کے محل کو خاکستر بنا دیا جائے، خود انگریز مورخین ہم کو جو واقعہ بتاتے ہیں ہم اس سے انکار نہیں کرتے بلکہ تسلیم کرتے ہیں لیکن اس واقعہ کو اس کے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ دیکھنا چاہئے تبھی سچائی آپ کے سامنے آئے گی، انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ’’نواح کے کورگ میں اکثر ہندو عیسائی مذہب قبول کرتے جاتے تھے سلطان نے ان کو لکھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب کو ترک نہ کریں، مگر جب چھ دفعہ لکھنے پر بھی اس کا اثر نہ ہوا تو آخر میں سلطان نے لکھا کہ آئندہ تم میں سے کوئی شخص اپنا آبائی مذہب ہرگز ترک نہ کرے اور اگر ایسا تبدیلیٔ مذہب کا شوق ہو تو خود اپنے بادشاہ کا مذہب اختیار کرو‘‘۔(تاریخ سلطنت خداداد ص۵۳۲)

حکومت میسور کے چالیس سالہ دور میں صرف یہی ایک واقعہ ہے جس کو مثال

میں پیش کیا جاتا ہے اور سلطان پر تعصب کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن کوئی غیر جانبدار شخص اس کے یہ معنی ہرگز نہیں لے سکتا کہ سلطان ٹیپو بہ جبر واکراہ ہندوؤں کو مسلمان بنا رہا تھا کیوں کہ اس تحریر میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے اور نہ پوری تاریخ میسور بتاتی ہے کہ سلطان کے اس تہدیدی حکم کے بعد کوئی ہندو مجبور ہو کر مسلمان ہوگیا۔

اس تحریر سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ انگریز ایک طرف ہندوستانی حکومتوں کو تہ و بالا کر کے اپنے حدود حکومت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مذہب پر بھی ڈاکہ ڈال رہے تھے، ملکی فتوحات کا دائرہ جتنی تیزی سے وہ وسیع کر رہے تھے اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ وہ ہندوؤں کو عیسائی بنا کر ہندو مذہب کا قلع قمع کر رہے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ جنوبی ہند میں آج دیسی عیسائیوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ ہے اور یہ سب کے سب ہندو تھے، ٹیپو سلطان کو متعصب ثابت کرنے کے لئے اور ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنانے کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے یہ واقعہ پیش کرتے ہوئے یہ فرقہ پرست ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکتے، اس کے برعکس ایک کروڑ دیسی عیسائیوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں کہ انگریزوں نے ہندوؤں کو زبردستی عیسائی بنایا، انگریز پادریوں کی اس مہم کے وقت ہندوؤں کو شرم وغیرت نہیں آئی تو سلطان ٹیپو میدان میں آیا وہ پادریوں پر پابندی عائد کر کے تمہارا کام کر رہا تھا اور الٹے تم نے اسی کو موردالزام بنا ڈالا، سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے فرقہ پرست سوجھ بوجھ، عقل وخرد، فہم وفراست، صداقت ودیانت، انسانیت وشرافت کے لحاظ سے دیوالیہ ہو چکے ہیں، اور ایک آزاد ملک کے آزاد باشندوں کا ذہن ومزاج ان میں پیدا ہوا نہ مستقبل قریب میں اس کے پیدا ہونے کا امکان ہے آیئے، اس واقعہ کا تجزیہ کیا جائے۔

۱- میسور کے ہندو انگریز پادریوں کے فریب میں آکر عیسائی ہوتے جا رہے ہیں، کیوں کہ ٹیپو کو بار بار پادریوں کی ان سرگرمیوں کی روک تھام کی طرف

توجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی، آخر کیوں ٹیپو اتنی سختی کے ساتھ ہندوؤں کو عیسائی ہونے سے روکنا چاہتا ہے؟ بات یہ ہے کہ انگریزوں کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سفید فام قوم جو خود کو ملحد ہوتے ہوئے بھی عیسائی کہتی ہے جب بھی کسی ملک کو اپنی شکار گاہ بنانا چاہتی ہے تو وہاں سب سے پہلے پادریوں کے بھیس میں اپنے جاسوسوں کو بھیجتی ہے، وہ عیسائیت کا جال بچھاتے ہیں، اس ملک کے اہم رازوں کو معلوم کرتے ہیں اور حکمراں طبقہ کی اندرونی کمزوریوں کا پتہ چلاتے ہیں اور اس ملک کے ضمیر فروش اور وطن دشمن افراد کو کھوج نکالتے ہیں اور جب عوام عیسائیت کے جال میں پھنس جاتے ہیں تو یورپ کے مردہ خور گدھ پر اجمائے اس ملک میں ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں اور اتر پڑتے ہیں اور پھر صدیوں کے لئے ان کی خوراک کا بندوبست ہوجاتا ہے اور وہ ملک انگریزوں کا غلام ہوجاتا ہے، ہندوستان کی تاریخ یہی بتاتی ہے، اسپین اور اندلس کا مؤرخ بھی یہی بتاتا ہے اگر سلطان ٹیپو کی دوررس نگاہیں میسور ہی کو نہیں پورے ہندوستان کے انجام کو دیکھ لیتی ہیں اور وہ اس کی پیش بندی کرتا ہے اور پادریوں کے اس جال کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اس کے تدبر اور سیاست دانی کا کمال ہے اور کمال ہنر ہوتا ہے عیب نہیں، اس لئے ٹیپو کی مذمت نہیں، اس کی تعریف کرنی چاہئے اور اس کو اپنی قوم اور اپنے ملک کا محسن ماننا چاہئے آخر فرقہ پرست یہ الٹی گنگا بہانے کی غلط کوشش کیوں کرتے ہیں؟

سلطان ٹیپو نے افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کرکے ہندوؤں کو اپنے دھرم پر جمے رہنے کی تاکید کی اور بار بار سمجھایا کہ اپنا مذہب مت چھوڑو، کیوں کہ روایتی طور پر جس تہذیب اور رسم ورواج اور طور طریق سے وابستہ ہو اس سے کٹ جاؤ گے، عیسائیت اختیار کرکے یہاں کے باشندوں کی نگاہوں میں اجنبی بن جاؤ گے، تمہاری قدر وقیمت گھٹ جائے گی، تمہارے بھائی تم کو نگاہوں سے گرادیں گے، تمہارے دکھ سکھ میں شریک نہیں ہوں گے، اس کے باوجود وہ باز نہیں آئے، اور ٹیپو کے صحیح مشوروں کو نہیں مانا، یہ اپنی رعایا کے ساتھ اس کی رواداری اور خیر خواہی کا سب سے بڑا ثبوت

ہے کہ ہر شخص کو مذہب وملت کے اعتبار سے آزادی ومختاری دی، یہ سلطان ٹیپو کے محاسن کا ایک حصہ ہے، پھر اس کا یہ کام عیب کیسے بن گیا؟

سلطان بار بار ہندوؤں کو سمجھاتا رہا ہے کہ عیسائیت کے دام میں مت آؤ، سفید فام شکاریوں کے شکار مت بنو، کیوں کہ تم مستقبل میں اپنے ملک، اپنے وطن، اپنی حکومت کے دشمن بن جاؤ گے اور انگریز کے لئے فتوحات کے راستے کھول دو گے اور تم انگریزوں کا آلۂ کار بن جاؤ گے، اس کے باوجود ان کی عقل میں یہ بات نہیں آئی اور پانچ بار نرم لب ولہجہ میں سمجھا کر اتمام حجت کر دی اس کے باوجود وہ باز نہیں آئے اور اپنا قدیم مذہب عیسائی سوداگروں کے ہاتھ فروخت کرتے رہے تو چھٹی بار اس نے تہدیدی حکم بھیجا اس موقعہ پر بھی دونوں پہلوں کو ملحوظ رکھا کہ آئندہ کوئی شخص عیسائی نہ ہو ورنہ انجام بھگتنے کے لئے تیار ہو یعنی حتی الامکان ہندوؤں کو عیسائی ہونے کے بجائے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنے کی کوشش کرتا رہا، اس طرح ٹیپو ہندو قوم کا محسن تھا، تم احسان فراموش ہو کر خود کو رسوا کر رہے ہو۔

۴- واقعہ کا چوتھا جزیہ ہے کہ اگر تم سچ مچ ہندو نہیں رہنا چاہتے، اور کسی سچے مذہب کی تلاش ہے تو عیسائیت کے بجائے نخل اسلام کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں آجاؤ، ایک سچے مسلمان کی طرح ٹیپو نے ان کو دعوت حق دے دی، بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا یہ فرض تھا جو اس نے ادا کیا، فرض کا احساس انسانیت کا کمال ہے، سلطان اس کسوٹی پر بھی کھرا سونا ثابت ہوتا ہے، واقعہ کے اس تجزیہ کے بعد کیا کوئی عقلمند فرقہ پرستوں کے اس الزام کو صحیح تسلیم کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اور کبھی نہیں۔

آخری بات:

سلطان ٹیپو کی بے داغ شخصیت اور اس کے عظیم الشان مجاہدانہ کارناموں کا انصاف پسند، انسانیت دوست اور وسیع النظر ہندوؤں نے کھلے لفظوں میں اعتراف کیا اور اس کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس کے باوجود بعض تنگ نظر تنظیم کے

کارکنوں نے سلطان ٹیپو کو جھوٹی اور غلط افواہوں کی بنیاد پر بدنام کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے در حقیقت انہوں نے آسمان پر تھوکنے کی کوشش کی ہے اس کا انجام سب کو معلوم ہے، سلطان ٹیپو نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی کی لعنت سے بچانے کے سلسلہ میں جو اہم اور مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، ہم اس پر فخر کرتے ہیں، ہم اس کو مجاہدین آزادی کی فوج کا ہراول دستہ سمجھتے ہیں اور ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' جو اس کے عظیم الشان مجاہدانہ کارناموں سے عبارت ہے ہمارا تاریخی ورثہ ہے، ہم کسی کو قابل فخر تاریخ مسخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، چاہے آگ اور خون کے دریا میں بار بار غوطہ کھانا پڑے۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کو آزاد ہوئے چالیس برس سے زائد ہوگئے لیکن اب تک یہاں علمی سنجیدگی اور تحقیقی مزاج اور سچائیوں کی دریافت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا جو آزاد قوموں کا خاصہ ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں باہمی منافرت پھیلانے اور یہاں کی آب وہوا کو خراب کرنے کے لئے جتنے زہریلے پودے لگائے تھے اس کو کھود کر پھینک دینے کے بجائے ان کو اور سینچا جارہا ہے، یہ اس ملک کے لئے بڑی بد قسمتی کی بات ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اکثریت کو جذباتی نعروں میں الجھا کر اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا آسان ذریعہ بنالیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی ایک گذارش ہے اور بالخصوص ان بزرگوں سے جو تصنیف وتالیف کے اداروں کے ذمہ دار ہیں، تحقیقات ونشریات کے کام کرتے ہیں کہ ہر قوم کا ماضی اور اس کی تاریخ اس قوم کا بہت قیمتی اور اہم ورثہ ہوتی ہے، قومی وملی زندگی میں ساری توانائیاں وہیں سے ملتی ہیں، اسی کی بنیاد پر حال اور مستقبل میں کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے، اس لئے ہر قوم اپنی تاریخ کو ہمیشہ یاد رکھتی ہے اور اپنے سینے سے لگائے رہتی ہے۔

انگریزی حکومت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور یہاں کے مسلم حکمرانوں کی جو تصویریں پیش کی ہیں ان کو دانستہ طور پر انتہائی بدمنظر بنا کر پیش

کیا ہے، یہ ان کی سیاست کا لازمی عنصر تھا، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب اس ملک میں کوئی ایسا مسئلہ اٹھتا ہے جس کا تعلق مسلمانوں سے ہوتا ہے تو انگریزی تاریخوں سے ان کا ماضی نکال کر پوری فضا کو مکدر بنا دیا جاتا ہے، اور مسلمان اپنی پوری توانائیاں لگاتے ہوئے اس دھبے کو دھونے میں صرف کر دیتے ہیں اور کوئی مثبت کردار نہیں کرتے، اور کچھ دیر کے لئے ہم اپنے کو مجرم سمجھ لیتے ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس لئے ہمارا یہ قومی فریضہ ہے کہ انگریزی دور حکومت میں لکھی گئی تاریخوں کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے علمی تحقیق کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح تاریخ ملک کے سامنے پیش کی جائے تو مسلمان قوم کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک مفید ترین کارنامہ ہوگا، کیا ہمارا دانشور طبقہ اس پہلو پر غور کر کے کسی عملی اقدام کے لئے کوئی لائحہ عمل بنانے کے لئے تیار ہے؟ وقت ان کے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔

طوفان سے ساحل تک

تصویر کا پہلا رخ

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے در وبست پر قابو پا چکی تھی، انگریزی اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اسی وقت سے یہ پالیسی بن چکی تھی کہ اس ''سونے کی چڑیا'' کو اگر قبضہ میں رکھنا ہے تو اس کی شرط اولیں یہ ہے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ دیا جائے اور ہندوستانیوں کو ترغیب وتحریص اور ضرورت پڑے تو طاقت و جبر سے عیسائی بنایا جائے اور اسی نقطۂ نگاہ سے عملی اقدامات کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔

لندن میں باقاعدہ ایک مرکز علمی صرف اس لئے قائم کیا جا چکا تھا کہ عیسائی مشنریوں کو اردو، فارسی اور عربی کی مکمل تعلیم دی جائے اور وہ مرکز برسوں سے ایسے پادریوں کی ایک فوج تیار کرنے میں مصروف تھا جو علوم اسلامی اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے پورے طور پر واقف ہوں اور مسلمانوں کے مجمع میں فراٹے سے اردو میں تقریریں کرسکیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے ان ترتیب یافتہ پادریوں کی فوج آنا شروع ہوگئی تھی، انگریزی حکومت ان کو ہندوستان کے اہم اور مرکزی مقامات پر متعین کر چکی تھی اور ان کی سرگرمیاں زور شور سے جاری تھیں کیونکہ ان کو یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کو عیسائی بنا لیا گیا تو اس کی وجہ سے انگریزی سلطنت کے استحکام میں بہت بڑی مدد ملے گی، اور ملک کے بت پرستوں اور دوسرے باشندوں کو عیسائی بنا لینا بہت آسان ہو جائے گا، اس سلسلہ میں انگلستان کی پارلیمنٹ پر زور دیا گیا کہ وہ ہندوستانی باشندوں کو عیسائی بنانے میں ہندوستان میں مقیم انگریزی حکام کی مدد کرے اگر ہو سکے تو انہیں زبرستی عیسائی بنائے، مگر چونکہ جبر اور زبردستی عیسائی بنانے میں بہت سے

خطرات تھے اس لئے اس کی کھلم کھلا حمایت تو نہیں کی گئی البتہ طے یہ کیا گیا کہ اول تو ہندوستان میں ایسے گورنر، کلکٹر، وائسرائے، کمشنر اور دوسرے عہدیدار مقرر کئے جائیں جن کو مذہبی مناظروں سے دلچسپی ہو اور جو اپنے سیاسی فرائض انجام دیتے ہوئے مشنری فرائض بھی انجام دیتے رہیں، چنانچہ اس مقصد سے جو عہدیدار بھی مقرر ہوا اس کے ذمہ یہ فرض لگایا گیا کہ وہ اسلام کے خلاف کتابیں لکھے اور مسلمان ملازموں سے گفتگو کر کے ان کو عیسائی بنالے۔

سرولیم میور جو اعلیٰ درجہ کے پادری اور مشنری تھے انہیں اسی لئے ممالک متحدہ آگرہ واودھ کا گونر بنایا گیا اور انہوں نے ملازمت کے دوران ہی ''لائف آف محمد'' ''کتاب خلافت'' شہادت قرآنی پر کتب ربانی'' اور اسی طرز کی اور دوسری مناظرانہ کتابیں لکھیں اور اسلام کے خلاف پادریوں اور عیسائی منادوں کی ایک پوری فوج کھڑی کر دی اور اسی کے ساتھ یورپ کی ایک ''متحدہ مذہبی مجلس'' نے اسلام پر شدید حملہ کرنے کے لئے مناظر پادریوں کا ایک زبردست جتھ تیار کر کے ہندوستان بھیج دیا جس کے سرخیل پی فنڈر (P.Fandar) قرار پائے، پادری لیفرائے پادری منسل (Minsal) اور دوسرے بڑے بڑے پادری جو عربی فارسی اور اردو زبان پر عبور رکھتے تھے پادری فنڈر کے معاون بنائے گئے، خود فنڈر بھی عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور اردو زبان پر پوری طرح قادر تھا، پادری فنڈر نے ہندوستان آکر اسلام کے قلعہ پر پہلا گولہ کتاب ''میزان الحق'' کی شکل میں پھینکا اور پھر ''طریق الحیات''، ''حل الاشکال''، طلوع آفتاب صداقت'' اور دوسری کتابیں لکھ کر شائع کیں، خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کے خلاف یورپ کی یہ متحدہ یورش تھی جو مذہب کے رنگ میں کی گئی اور جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور پارلیمنٹ دونوں کو کامیابی کی پوری پوری توقع تھی۔

چونکہ مغلیہ سلطنت اپنی زندگی کا آخری سانس لے رہی تھی اور اس میں کوئی دم باقی نہیں رہا تھا اس لئے پادریوں کی دریدہ دہنی حد سے متجاوز ہو چکی تھی، پادری فنڈر

روزانہ دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ناواقف عوام کے سامنے عیسائیت کے مناقب وفضائل پر تقریریں کرتا تھا اور اسلامی تعلیمات میں کیڑے نکالتا تھا، ایک طرف انگریزی حکومت رعب داب اور ہیبت تھی، دوسری طرف پادریوں کی یک طرفہ تقریریں تھیں اور پھر کسی کو ان کے سامنے لب کھولنے کی ہمت نہیں تھی اس لئے ان کی تقریروں کا عوام پر کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا تھا، کچھ لوگ اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر چکے تھے، اور اس دور کے بہت سے اسلامی نام کے پادریوں کا تاریخوں میں ذکر آتا ہے جیسے پادری محی الدین، پادری صفدر علی وغیرہ یہ وہی ہیں جنہوں نے اس وقت اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی، اور جن لوگوں نے ان پادریوں کی مسلسل تقریریں سنی تھیں ان میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جن کا ایمان متزلزل ہو چکا تھا جیسا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی کتاب ''ازالۃ الشکوک'' میں لکھا ہے۔

چونکہ تبلیغ عیسائیت کی مہم پورے زور وشور سے جاری تھی، ہر مرکزی شہر میں ان کا پریس تھا، اخبار تھے، اور ہر سینٹر میں عیسائی مناظرین ومقررین کی ایک پوری فوج رہتی تھی اور وہ شب وروز اپنی مہم میں مصروف تھے، پھر عیسائی ہوجانے والوں کا اعزاز واکرام بھی تھا، خوشحالی اور فارغ البالی ان کے قدم چومنے لگتی تھی اور انگریزی حکام سے رابطہ کی وجہ سے ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی اس لئے ترغیب وترہیب دونوں راہوں سے عیسائیوں کی کامیابی کے آثار واضح طور پر نظر آتے تھے۔

مبلغین عیسائیت کا جواب دینے کی کسی میں ہمت نہیں تھی کیونکہ ابھی بھی مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرتی تھی اور ان گنت معزز اور سر برآوردہ مسلمانوں کو دہلی کے چوراہوں پر سولیوں پر لٹکتے ہوئے لوگوں نے دیکھا تھا اور ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ پادریوں کی زبان میں حکومت بول رہی ہے اور یوں بھی ہر پادری کے ساتھ پولیس کا ایک دستہ بھی رکھا جاتا تھا جو ہر ضلع کلکٹر کی ذمہ داری تھی کہ مبلغین عیسائیت کو ہر طرح مدد پہنچائی جائے اس لئے فضا میں ہر طرف سناٹا تھا، اس مہیب سناٹے میں صرف پادریوں کی

زہر آلود تقریروں کی آواز ہی سنائی دے رہی تھیں، اخبارات روزانہ عیسائی ہو جانے والے خاندانوں کی خبریں شائع کر رہے تھے۔

ان حالات کو دیکھ کر مسلمان پیچ و تاب کھا رہے تھے لیکن بے بسی کا وہ عالم تھا کہ اس کے خلاف لب کھولنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی اس لئے حکومت کی ہمت بڑھتی جارہی تھی اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر ایسی زبردست چوٹ لگائی جائے جو ان کو یاس و ناامیدی کے گہرے غار میں دفن کردے اور اس کا واحد طریقہ کار یہ طے کیا گیا کہ دہلی شاہجہانی جامع مسجد جو مسلمانوں کے دور عروج کی اہم ترین نشانی کے طور پر قلب شہر میں کھڑی ہے اس کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال کر عیسائی گرجا کی شکل میں تبدیل کردیا جائے، یہ ساری داستان جو حقائق پر مبنی ہے ہم کو فرانس کا مشہور عالم مستشرق موسیو گارسان وتاسی سناتا ہے جو پیرس یونیورسٹی میں السنہ شرقیہ کا استاد تھا اور وہ ہر تعلیمی سال کے آخر میں اپنے طلبہ کے سامنے ایک لکچر دیتا تھا جس میں وہ اردو زبان کے ارتقاء پر تبصرہ کرتا تھا وہ اپنے لکچر میں ہندوستان میں اردو زبان کی نشر و اشاعت اور اسکی ادبی ترقی کا جائزہ لیتا تھا اور وہ بتاتا تھا کہ اس سال اردو میں کتنی کتابیں شائع ہوئیں کتنے مطابع قائم ہوئے؟ کتنے رسالے اور اخبار جاری ہوئے؟ اور اردو کے کون کون ممتاز شاعر اس وقت ہندوستان میں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام معلومات وہ پیرس میں بیٹھ کر مختلف ذرائع سے حاصل کرتا تھا، وہ ہندوستان میں انگریز عہدہ داروں سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھتا تھا اور ان سے اس سلسلہ میں ضروری معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا رہتا تھا، ان سے شعراء کے دیوان اردو میں شائع ہونے والی کتابوں، رسالوں اور اخباروں رسالوں اور شعراء کے دیوانوں کی قدر و قیمت ادبی معیار، مصنّفین اور مدیران جرائد کے حالات ان کی مساعی کی قدر و قیمت بھی ظاہر کرتا تھا، اس سلسلہ میں وہ بعض اوقات ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی ایک خاص انداز میں کرجاتا ہے، وہ پکا عیسائی ہے اور ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ سے اسے بڑی دلچسپی ہے، وہ

عیسائی مبلغین کی کوششوں اور کامیابیوں اور حکومت کے اقدامات کو بڑے شوق سے اور لذت لے لے کر بیان کرتا ہے۔

اس کے ان لکچروں کا اردو ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کی تصحیح ونظر ثانی کے بعد شائع ہو چکا ہے میں اسی سے جستہ جستہ عیسائیت کی اشاعت کی تفصیل پیش کر رہا ہوں، یہ خطبات ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹/سال کے عرصہ میں دیئے گئے ہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جب عیسائیت کی تبلیغ پر انگریزی حکومت اپنا پورا زور صرف کر رہی تھی، موسیو گارسان وتاسی ۵/دسمبر ۱۸۵۳ء کو اپنا لکچر دیتے ہوئے کہتا ہے۔

''رومن کیتھولک نقطۂ نظر سے سردھنہ ان صوبجات میں ایسا ہے جیسے صحراء میں نخلستان، یہاں رومن کیتھولک مشنریوں نے مطبع قائم کیا ہے جس میں حال ہی میں علاوہ اور چیزوں کے مذہبی عقائد کی سوال و جواب کی کتاب چھپی ہے......

پروٹسٹنٹوں کی مذہبی مطبوعات کا میں آپ سے ذکر نہیں کروں گا وہ بلاشبہ بہت زیادہ ہیں اور ان کی اشاعت سے اہل ہند میں رفتہ رفتہ عیسائی خیالات کی اشاعت ہوتی جاتی ہے۔

گذشتہ سال میں نے آپ کے رام چندر کے اینگلیکن فرقہ کی عیسائیت قبول کرنے کا ذکر کیا ہے اور میں نے ابھی ابھی اس کے اخبار کا ذکر کیا ہے جس کے وہ ایڈیٹر ہیں، اس سال ایک ہندوستانی شاہزادہ کا ذکر کرتا ہوں اور صرف یہی ایک ہندوستانی شہزادہ ہے جو ہمارے زمانہ میں عیسائی ہوا ہے، یہ مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شہزادہ ہے اور اس نے فتح گڑھ میں گذشتہ مارچ میں آٹھ تاریخ کو عیسائی مذہب اختیار کیا ہے''۔

مسلمانوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے:

اس نے اپنے پانچویں خطبہ میں بعض ان مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے عیسائیت قبول کر لی ہے، وہ ۴/دسمبر ۱۸۵۴ء کو لکچر دیتے ہوئے کہتا ہے:

''ہندوستان کے بعض مصنّفین میں بعض ایسے ہندو بھی پائے جاتے ہیں جو عیسائی ہو گئے ہیں، نیز بعض مسلمان بھی ہیں، جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ ایک اردو شاعر کی نسبت جس کا تخلص شوکت ہے اور جو نصرانی ہو گیا تھا شیفتہ اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ شوکت بنارس میں ایک یورپین کا بڑا دوست تھا اور اس کی ترغیب سے اس نے اسلام ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کر لیا چنانچہ اس نے اپنا نام بھی سیف علی سے بدل کر منیف مسیح رکھ لیا ہے ایسی حالت میں نام کی تبدیلی اکثر و بیشتر صورتوں میں ضروری ہوتی ہے ہندوستانی زبان کے ایک اور شاعر نے جو عیسائی ہو گیا ہے اپنا نام فیض محمد سے فیض مسیح رکھ لیا ہے۔''

اشاعتی لٹریچر:

ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کے لئے باضابطہ حکومت کی طرف سے باتنخواہ پادری اور کارکن رکھے گئے تھے اور وہ اردو فارسی سے بخوبی واقف تھے ان کو پریس اور چھاپہ خانے کی تمام سہولیات بھی فراہم کی گئی تھیں اور وہ بڑے پیمانے پر اخبارات، رسالے اور کتابیں شائع کرتے تھے اور ہر ایک میں عیسائیت کے فروغ اور اشاعت کو اولیت دیجاتی تھی، اس سلسلہ میں گارسان وتاسی اپنے ساتویں لکچر میں جو اس نے ۴ر دسمبر ۱۸۵۶ء کو دیا تھا اس میں کہتا ہے۔

''حضرات! میں نے آپ کو ان مذہبی کتابوں کا حال نہیں سنایا جو سرگرم مبلغین عیسائیت دیسیوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے شائع کرتے رہتے ہیں ایسی کتابوں میں ''عہد نامہ قدیم'' اور خصوصیت کے ساتھ ''عہد نامہ جدید'' کے ترجمے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، چاہے ان مقدس کتابوں کو پڑھ کر بہت کم ہندوستانیوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہوتا ہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن لوگوں نے انہیں پڑھا ہے ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور زیادہ خوشی کی ضرور ہوئی ہوگی۔

پورے ملک میں جال پھیلایا گیا:

یورپ میں عیسائیوں کے دو فرقے خصوصی شہرت رکھتے ہیں ایک رومن کیتھولک اور دوسرا پروٹسٹنٹ، حکمراں انگریز موخر الذکر فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن عیسائیت کے فروغ میں باہمی اختلافات کی جھلک نہیں آنے دیتے تھے بلکہ دوسرے فرقہ کو بھی حکومت کا پورا تعاون حاصل تھا، دونوں فرقے الگ الگ اپنے طور پر تبلیغ عیسائیت کے کام میں تن من دھن سے لگے ہوئے تھے جیسا کہ ہم گارسان وتاسی سے سنتے ہیں وہ اپنے آٹھویں خطبے میں جو اس نے ۱۰ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو دیا تھا کہتا ہے:

''بہر حال پروٹسٹنٹ مبلغین اور رمن کیتھولک مبلغین کے درمیان تو کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں سے یکساں برتاؤ کیا جاتا رہا ہے اور انگریزی حکومت نے پروٹسٹنٹ ہونے کے باوجود رومن کیتھولک کو پوری آزادی دے رکھی ہے، فوجی چھاؤنیوں میں رومن کیتھولک فرقے کے مذہبی پیشواؤں کو تنخواہ دی جاتی تھی، اور خود اپنے مقبوضات کے قلب میں تین خانقاہیں آگرہ، سردھنہ، سیالکوٹ میں عورتوں کے لئے بنانے کی اجازت دے دی تھی علاوہ ازیں رومن کیتھولک تعداد میں پروسٹنٹوں سے زیادہ تھے، اول الذکر کے دو اسقف یا عاقب احاطۂ بنگال میں تھے، ممبئ کے لئے پھر مدراس، حیدرآباد وزینگاپٹم، سیبورکوئمبتور، سردھنہ، آگرہ، پٹنہ، ویراپلی، کنٹرالین، منگلور، کرکولم اور اندھرا میں بھی الگ الگ اسقف تھے مجموعی تعداد ان اسقفوں یا عاقبوں کی سولہ تھی، برخلاف اس کے خود انگریزی چرچ یعنی اینگلیکن کلیسا کے ہندوستان بھر میں صرف تین اسقف تھے (بڑے پادری) ایک کلکتہ، ایک مدراس، اور ایک ممبئ میں[1]۔

[1] (خطبات گارسن وتاسی: ج ۱ ص ۲۱۷-۲۱۸)

دہلی جامع مسجد کو گرجا بنانے کا ارادہ:

انگریزی حکومت کے بے انتہا مظالم اور جور و استبداد کی بے تحاشا کارروائیوں کی وجہ سے سارے ملک میں ایک دہشت اور مرعوبیت کی فضا بن گئی تھی اور انگریزی حکومت یہ سمجھنے لگی تھی کہ ہندوستانیوں کے مذہب، ضمیر اور رائے کے خلاف کوئی بڑے سے بڑا کام بھی کیا جائے گا تو کسی ہندوستانی میں اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت وجرأت نہیں ہوسکتی اس کا ان کو اتنا یقین تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے کلیجہ پر اپنے اقتدار اور عونت کا پرچم گاڑنے کا تہیہ کرلیا تا کہ مسلمان دیکھے اور تلملائے خون کا گھونٹ پیئے، لیکن لب نہ کھول سکے، دل خون بن کر آنکھوں میں اتر آئے لیکن احتجاج کے لفظ سے ان کی زبان آشنا نہ ہو سکے جیسا کہ گارسان وتاسی ہم کو بتاتا ہے:

> بلاشبہ دہلی میں عہدۂ اسقفی قائم کرنے کا سوال درپیش ہے اور یہ بھی تجویز ہے کہ سرخ گار کے پتھروں کی شاہجہانی مسجد جامع کو کیتھڈرل یعنی منبر دار گرجا میں تبدیل کردیا جائے، بشرطیکہ پایہ تخت دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں کے لئے انگریزوں کے شدید حملے میں وہ محفوظ ہو، علاوہ ازیں کنٹربری کا لاٹ پادری مطالبہ کررہا ہے کہ تین بڑے پادریوں (اسقفوں) کا جدید تقرر عمل میں لایا جائے، ایک لاہور میں پنجاب کے لئے، دوسرا آگرہ میں صوبہائے شمال مغربی کے لئے، اور تیسرا تناولی میں جنوبی کرناٹک کے لئے، مزید براں رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے سے تبلیغ کے باب میں سبقت لے جانے کی کوششوں میں سرگرم ہیں، رومن کیتھولک ہندوؤں کو عیسائی بناتے ہیں اور پروٹسٹنٹوں کی نظر صرف مسلمانوں پر ہے کیونکہ مسلمانوں کو بتوں اور مجسموں سے جو کیتھلکوں کے یہاں ہوتے ہیں بہت نفرت ہے۔"

عیسائی لٹریچر کی تفصیل:

حالات اور مواقع کے لحاظ سے مختلف انداز سے کتابیں لکھی جاتی تھیں البتہ

بنیادی کتابوں اور ان کو سہل بنانے اور اس کو دوسری رائج زبانوں میں منتقل کرنے کا کام بھی زوروں پر جاری تھا، ہمیں گارسن وتاسی اپنے گیارہویں لکچر میں جو اس نے ۲ر دسمبر ۱۸۶۱ء کو دیا تھا ہمیں کچھ تفصیل بتاتا ہے، وہ کہتا ہے۔

''انجیل کے اردو ترجمہ کا تعارف کرانے کے بعد وہ کہتا ہے کہ میں ان مبلغین مسیحیت کی ساری کتابوں کے متعلق تفصیل سے ذکر نہیں کروں گا اس واسطے کہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا، یہ لوگ انجیل مقدس کی تعلیمات کی بڑے جوش وخروش سے نشر واشاعت کر رہے ہیں، مذہبی قسم کی مطبوعات جو حال میں شائع ہوئی ہیں اور جن کا مجھے علم ہے ایک کتاب ''سچے اوتار'' یعنی خدا کے انسانوں میں حلول کرنے کے متعلق لکھی گئی ہے، ایک حقیقی تثلیث اور ہندوؤں کی تری مورتی کے متعلق ہے، ایک کتاب میں اسلام کی ابتداء اور عروج وزوال پر تبصرہ ہے ان کتابوں کے علاوہ بہت ساری انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں جن میں سے متعدد فرانسیسی میں موجود ہیں، ''حضرت سلیمان کی امثال'' اور ''پہاڑی وعظ'' کا اردو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے، ممبئی کی مسیحی انجمن کتب ورسائل'' بھی اپنے کام میں مشغول ہے، اس انجمن نے ۲۳۰ چھوٹی بڑی کتابیں شائع کی ہیں جو ہندوستانی اور دوسری زبانوں میں بھی ہیں، اس قسم کی تبلیغی کتب کو تقسیم کرنے کے علاوہ مبلغین مسیحیت ملک کے طول وعرض میں کلیساؤں اور گرجاؤں کی بنیادیں بھی ڈال رہے ہیں اور مدرسے قائم کر رہے ہیں''۔

کلیسا کی کامیابی:

عیسائیت کی اشاعت کے سلسلہ میں سرگرمیوں کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے گارسن وتاسی اپنے تیرہویں لکچر میں جو اس نے ۷ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو دیا تھا وہ کہتا ہے:

''انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انہیں خوب کامیابی ہو رہی ہے ہر روز اینگلو انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے ۱۸۶۲ء

میں بنگال، صوبہائے شمالی و مغربی صوبہ، ممبئی اور صوبہ مدراس میں دیسی عیسائیوں کی تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار آٹھ سو تیرانوے (۱۱۸۸۹۳) تھی مشنریوں کی تعداد جو تبلیغی کام کررہے تھے ۴۱۸ تھی اور کل ۸۹۰ کلیسا اور گرجا تھے"۔[1]

مسلمانوں کی طرف سے مایوسی:

گارسان وتاسی نے اپنے کئی لکچروں میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مبلغین عیسائیت کو مسلمانوں میں بہت کم کامیابی حاصل ہورہی ہے پھر بھی وہ بالکل مایوس بھی نہیں ہیں وہ اپنے چودہویں لکچر میں جو اس نے ۵؍دسمبر ۱۸۶۴ء کو دیا ہے وہ کہتا ہے:

"انگریزی مشنریوں کو ہندوستانی مسلمانوں میں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ ان کو ترکی میں حاصل ہوئی ہے، بہرحال ہندوستان اور ترکی ہر دو ملکوں کے مسلمانوں میں مذہبی بیداری پیدا ہوگئی ہے، چنانچہ ایک جماعت جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاحی کام کرے، دراصل خود اس انجمن کا رجحان بہت کچھ مسیحی مذہب کی طرف ہے، عموماً مسلمان دراصل مسیحی تعلیم سے اس قدر دور نہیں ہوتے ہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے، ہندوستانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسیحی مذہب کی خوبیوں کو اپنے مذہب میں سمو رہی ہے اس جماعت کے اصل لیڈر سید احمد خان ہیں جو غازی پور میں ہیں"۔[2]

عیسائیت کے فروغ پر مسرت:

گارسان وتاسی نے اپنے اس لکچر میں جو اس نے ۷؍دسمبر ۱۸۶۳ء کو دیا ہے دو مشنریوں کی کامیابی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہتا ہے:

۱؎　خطبات گارسن وتاسی ج:۱، ص:۳۷۹-۳۸۰

۲؎　خطبات گارسن وتاسی ج:۱، ص:۴۱۷-۴۱۸

''ہندوستانیوں میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب ہمارے تمدن اور ہمارے مذہبی ماحول سے قریب ہوتے جاتے ہیں، یہ مذہبی اصول مسیحیت ہماری تہذیب وتمدن کا ماخذ ہیں ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہورہی ہے اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں اور اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہئے[1]۔

وہ گرجاؤں میں گائے جانیوالے گیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''مسلمانی گیت ہندو گیتوں سے مختلف ہوتے ان میں سے بعض شجاعت علی کے اپنے ہیں، موصوف پہلے مسلمان تھے اب دین مسیحی قبول کرلیا ہے، آج کل وہ کلکتہ کے دیسی گرجا میں پادری کی حیثیت سے کام کرتے ہیں[2]''۔

جائزے اور خوش فہمیاں:

گارسان وتاسی اپنے چودھویں لکچر میں ایک موقعہ پر کہتا ہے:

مہاراجہ دلیپ سنگھ جب حال ہی میں ممبئی سے گذرے تو ڈاکٹر دلسن نے گرجا میں ہندی زبان میں دینی لکچر دیا اس لئے کہ حاضرین میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جو انگریزی سمجھتے، مہاراجہ نے ۱۲/اپریل کو ''دی جزیلزم انسٹی ٹیوٹ'' کے عظیم الشان ہال میں ان تمام ہندوستانیوں کو مدعو کیا جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کیا ہے اس دعوت میں ساڑھے چار سو آدمی شریک ہوئے اس موقعہ پر متعدد تقریریں ہوئیں، ڈاکٹر دلسن نے مہاراجہ کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی اہمیت بتلائی اور کہا کہ اس کا دوسرے ہندوستانیوں پر بہت اچھا اثر پڑے گا، ایک مسیحی مشنری نے دکن میں مسیحی مذہب کی تبلیغ واشاعت کے متعلق تفصیلات بیان کیں اور کئی دیسیوں نے بھی تقریریں کیں، آپ لوگوں کو معلوم

۱؎ خطباتِ گارسن وتاسی ج:۱،ص:۳۸۷

۲؎ خطباتِ گارسن وتاسی ج:۱،ص:۳۷۹

ہو گیا ہوگا کہ مشنریوں کی جدو جہد ہندوستان میں بالکل رائیگاں نہیں گئی گذشتہ سالوں میں ڈاکٹر ڈف کو خاص کامیابی حاصل ہوئی، موصوف پچھلے سال ہندوستان میں ۲۴؍سال رہنے کے بعد انگلستان واپس آگئے ہیں آپ کی مساعی کی بدولت کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا ہے آپ نے پورا وقت ہندوستان میں مذہب کی تبلیغ واشاعت پر صرف کیا[۱]''۔

پادری صفدر علی کا ذکر:

گارسن وتاسی صفدر علی کے عیسائی ہونے کا ذکر بڑی مسرت سے کرتا ہے، اس کی مسرت بجا بھی ہے کیونکہ وہ پڑھا لکھا اور ذہین وفطین آدمی تھا بعد میں علماء اسلام سے اس نے مناظرے کئے اور عیسائیت کی تبلیغ واشاعت میں اس نے بڑی سرگرمی دکھائی گارسن وتاسی نے اپنے پندرہویں لکچر جو اس نے پیریس یونیورسٹی میں ۴؍دسمبر ۱۸۶۵ء کو دیا اس میں اس داستان کو مزے لے لے کر سناتا ہے۔

''ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کو زیادہ کامیابی اب تک نہیں حاصل ہوئی لیکن بعض مسلمانوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے مسیحی مذہب کی تعلیم کو قبول کرلیا ہے چنانچہ ناگپور کے ایک تعلیم یافتہ اور ممتاز مسلمان نے جو جبل پور کے ناظر مدارس ہیں اور جن کا نام مولوی صفدر علی ناگپوری ہے ابھی حال میں مسیحی دین قبول کیا ہے، موصوف نے مسیحی مذہب کی کتابوں کو پڑھ کر اور اس کی صداقت کا قائل ہو کر خود بخود مذہب تبدیل کرلیا، ان کے اثر سے ایک اور مسلمان عیسائی ہو گیا جو ان کے ماتحت اسکول میں مدرس تھا، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس وقت ۵۱۵ مبلغین مسیحیت کام کر رہے ہیں ان میں اینگلیکن اور دوسرے غیر کیتھولک شامل ہیں، ہمارے خیال میں کیتھولک

---

[۱] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۱ص:۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱

مبلغین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی اس لئے کہ اس وقت ہندوستان میں دس لاکھ کیتھولک موجود ہیں[۱]"۔

میلوں ٹھیلوں میں مسیحی مبلغین:

مسیحی مبلغین اور پادری ہندوستانیوں کے میلوں ٹھیلوں میں بھی عوام کو ورغلانے کا کام بڑی تندہی اور مستعدی سے کرتے تھے، گارسن وتاسی اپنے خطبہ میں کہتا ہے:

"مسیحی مبلغین اپنا مذہبی جوش ظاہر کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں دیتے چنانچہ میلوں کے موقعہ پر جو مذہبی اور تجارتی دونوں اہمیت رکھتے ہیں ہندوستانیوں کے جم غفیر میں وہ اپنے خیمے لگا لیتے ہیں، تقریریں اور وعظ کہتے ہیں اور رسالے تقسیم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، چنانچہ پچھلے دنوں ۲۸/جنوری کو گنگا جمنا کے سنگم آلہ آباد میں میلے کے آخری دن کہتے ہیں کہ کوئی ستر ہزار نفوس موجود تھے اس میلے میں ان مبلغوں نے بڑی سرگرمی سے کام کیا، ۲۱/دسمبر کو ممبئی کے بشپ نے ۹ کم عمر ہندستانیوں کو عیسائی بنانے کی رسم ادا کی ان میں دو مسلمان ہیں ایک پارسی ہے ایک تامل ہے چار مرہٹے ہیں اور ایک اودھ کا ہندو ہے ان کے علاوہ دس لڑکیاں بھی مسیحی دین کے حلقہ میں داخل کی گئیں ان میں سے دو مسلمان ہیں، اس سال ۹/اپریل کو کلکتہ کے بشپ نے امرتسر میں چالیس سے زیادہ ہندوستانیوں کو داخل مسیحیت کیا[۲]"۔

کچھ نئے عیسائی ہونے والے کا ذکر:

گارسن وتاسی نے اپنے سولہویں لکچر میں جو اس نے ۳/دسمبر ۱۸۶۶ء کو پیرس یونیورسٹی میں دیا، اس میں اس نے کچھ نئے عیسائی ہونے والوں کا ہمیں پتہ بتایا ہے وہ کہتا ہے:

---

۱ خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۵۹-۶۰

۲ خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۶۰-۶۱

''باوجود مسیحی کلیساؤں کے اختلاف کے کوئی نہ کوئی مشہور ہندوستانی مسیحی مذہب قبول کرتا رہتا ہے، بعض ایسے مسلمانوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے جو اپنی تعلیمی یا معاشرتی حیثیت سے ملک میں ممتاز سمجھے جاتے تھے چنانچہ مولوی کریم الدین جو ہندوستانی زبان کے مشہور انشاء پردازوں میں ہیں اور ان کے بھائی مولوی عمادالدین جو خود فاضل آدمی ہیں لیکن جن کو شہرت حاصل نہیں، یورپین لوگوں کے میل جول سے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مسیحی مذہب سچا اور اسلام باطل ہے، ان میں مولوی عمادالدین بھی غالباً عنقریب باقاعدہ مسیحی مذہب میں شامل ہوجائیں گے، بہرحال اب دونوں مل کر ایک کتاب لکھ رہے ہیں، جس میں اسلامی اصولوں پر اعتراضات ہوں گے''[۱]۔

قابل اطمینان کامیابی:

عیسائی مبلغین کی مسلسل جدوجہد کا ثمرہ ان کے حق میں اچھا نکلا، انہوں نے عیسائیت کے فروغ میں اطمینان بخش حد تک کامیابی حاصل کرلی، اب یورپین مشنریوں اور پادریوں کے علاوہ خود ہندوستانی عیسائی بھی بڑی تعداد میں پادری کے عہدوں پر سرفراز ہوکر تبلیغ عیسائیت میں سرگرم حصہ لینے لگے، یہ داستان بھی ہم کو گارسن وتاسی کے سترہویں خطبے میں ملتی ہے جو اس نے ۷/دسمبر ۱۸۶۷ء کو دیا تھا، وہ کہتا ہے:

''بالعموم ہندوستانیوں میں جو لوگ عیسائیت قبول کرتے ہیں وہ جاہل طبقہ کے لوگ نہیں ہوتے، لکھے پڑھے لوگ ہوتے ہیں، چنانچہ ان میں بعض تو راہبانہ سلسلوں میں بھی داخل ہوگئے ہیں، مدراس کے بشپ نے پچھلی مرتبہ مذہبی نگرانی کے دورے میں پانچ ہزار دوسو باون (۵۲۵۲) دیسی لوگوں کے مسیحی مذہب قبول کرنے کی تصدیق کی، انہیں دیسی لوگوں میں سے نو کو پادری مقرر کیا اور گیارہ کو ڈیکن (مددگار پادری) ابھی حال میں متھرا میں ایک ہندو

۱؎ خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۱۲۴-۱۲۵

جانو نے عیسائی مذہب قبول کرلیا وہ ایک مدرسہ چلا رہا تھا، چنانچہ ممبئی کے لاٹ پادری نے اس کو پادری کے عہدے پر باقاعدہ مامور کر دیا۔

آگرہ کے کلیسا میں ہر اتوار کو دو مرتبہ ہندوستانی زبان میں عبادت کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں، پچھلے سال اسی گرجا میں آٹھ آدمیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا، اضلاع میں بھی گرجے قائم ہوگئے ہیں، جہاں عیسائی لوگ عبادت کیلئے جمع ہوتے ہیں، بہرحال عیسائی مبلغین کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ابھی حال میں ہاتھرس میں بعض مبلغین کی مار پیٹ کی گئی، اور ان پر پتھر پھینکے گئے۔

مسیحی مبلغین کو نسبتاً ان نیم وحشی اقوام میں بھی کامیابی ہو رہی ہے، جو انگریزوں کے زیر حکومت اس وسیع سرزمین کے تحت بعض گوشوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، چنانچہ بنگال کی مغربی سرحد اور ناگپور کے جنوب کے علاقے کے درمیان ایک جرمن مشنری نے حال میں چودہ ہزار نفوس کو مسیحی حلقہ میں داخل کر لیا ہے[1]"۔

ترقی پذیر عیسائیت:

گارسن وتاسی نے ۷؍دسمبر ۱۸۶۸ء کے خطبہ میں ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی کامیابی کا جائزہ لیا ہے اس جائزہ میں امید و یاس دونوں پہلو ہیں، پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ جس سرزمین پر ایک متنفس بھی عیسائی نہیں تھا، مشنریوں کی انتھک جدوجہد نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں لاکھوں عیسائی پیدا کر دیئے اور ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، مایوسی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حکومت کے جابرانہ طریقے پر پورا بھروسہ کر لیا تھا کہ بزور قوت چند سالوں میں ہم پورے ملک کو یا کم از کم اس کی بڑی اکثریت کو دامِ عیسائیت میں ضرور گرفتار کر لیں گے، یہ توقع ان کی پوری نہیں ہوئی، گارسن وتاسی کہتا ہے:

"اس سچے مذہب (مسیحیت) کی ترقی اس قدر تیزی کے ساتھ نہیں ہو رہی

---

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۱۴۸-۱۴۹

ہے جیسی کہ ہونی چاہئے تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کام کیا جا رہا ہے وہ نہایت ٹھوس ہے۔

رسالہ ''سالنامہ تبلیغ واشاعت'' میں ہندوستان کے کیتھولک عیسائیوں کی تعداد آٹھ لاکھ بتائی گئی ہے ان میں سے ایک لاکھ ۶۰ ؍ ہزار سیلون میں ہیں جیسا کہ وہاں کے نمائندہ پوپ نے واضح کر دیا ہے، آج اس وقت ہمارے زمانے میں بھی پر جوش مبلغین مسیحیت ہندوستان میں جوش اور خلوص کے ساتھ کام کر رہے ہیں، قدیم شرک وکفر کے ماننے والوں اور جدید فطرت پرستی کے علمبرداروں کے مقابلہ میں ان مبلغین کو ہر جگہ کامیابی ہو رہی ہے، مسٹر آر کلاک نے اپنے خطہ مورخہ ۱۳ ؍ فروری ۱۸۶۸ء میں شہر امرتسر کے چرچ مشن کے متعلق مجھے بعض اطلاعات بہم پہنچائی ہیں، اس کاتستان کے آزاد کلیسا کی شاخ جونا گپور میں قائم کی گئی ہے، مسیحی تہذیب وتبلیغ کا کام کمال خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے، لاہور کا امریکی مشن بھی خوب پھل پھول رہا ہے، شہر سیہور میں جو بیگم صاحبہ بھوپال کے حدود حکومت میں ہے تقریباً چالیس ہزار روپے کے خرچ سے ایک کلیسا تعمیر کیا گیا ہے، اس رقم کا بیشتر حصہ خود بیگم بھوپال صاحبہ اور ہلکر والی اندور نے اپنے پاس سے دیا ہے، دیسی امراء نے بھی چندے سے اس کام میں مدد دی، اس سال کے دوران میں بعض ممتاز مسلمان مسیحیت کے حلقے میں داخل ہوئے ہیں، چنانچہ دہلی کے شاہی خاندان کے کئی ایک شہزادیوں کے بپتسمہ کی رسم ابھی حال ہی میں ادا کی گئی ہے۔

اخبار عالم مورخہ ۲۱ ؍ مئی ۱۸۶۸ء میں ایک عجیب وغریب واقعہ درج ہے، مسیحی مبلغین اور مسلمان مولویوں نے ایک موقعہ پر باہم یہ طے کیا ہے کہ وہ آپس میں پرسکون طور پر مباحثہ کریں گے اگر مبلغین مسیحیت کے دلائل تسلی بخش ثابت ہوئے نو مولوی ان کا مذہب قبول کرلیں گے، ورنہ وہ اسلام کے حلقے میں اپنے تئیں شامل کرلیں گے مجھے اس کا علم نہیں کہ اس مباحثہ کا انجام کیا ہوا؟

لیکن بہرنوع مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ مسلمان کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ مباحثہ میں ہار گئے، پچھلے سال عماد الدین کے مسیحیت قبول کرنے اور اس کی تصنیف کے متعلق میں ذکر کر چکا ہوں جس میں اس نے اسلام کی تردید کی ہے، اس کتاب کا نام ''تحقیق الایمان'' ہے، مجھے اس کا ایک نسخہ پہنچ چکا ہے۔

گارسن وتاسی سرسید احمد خان کی ایک کتاب کا بھی ذکر بڑی مسرت سے کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کی کتابوں سے عیسائیت کے فروغ اور تبلیغ واشاعت میں بڑی مدد ملے گی، اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس نے ان کی کتاب کا تفصیلی تعارف اپنے لکچر میں کرایا ہے وہ اپنے اٹھارہویں لکچر میں جو ۷؍دسمبر ۱۸۶۸ء کو دیا تھا کہتا ہے:

''اردو کی اور بعض دوسری کتابیں جنہیں ہم خالص مسیحی تو نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں ان میں وہ کتاب شامل ہے جو ایک مسلمان عالم نے بائبل کی تفسیر پر لکھی ہے یہ کتاب اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہے اور فاضلانہ بھی ہے میری مراد سید احمد خان کی تفسیر بائبل سے ہے[1]''۔

آخری جائزہ:

موسیو گارسان وتاسی کا آخری خطبہ ۶؍دسمبر ۱۸۶۹ء کو دیا گیا، اس میں اس نے تبلیغ عیسائیت کا ایک بھرپور جائزہ لیا ہے اور انگریزی حکومت کے پھیلائے ہوئے تعلیمی جال سے اس کو توقع ہے کہ بتدریج اس راہ سے عیسائیت کو ہندوستان میں فروغ حاصل ہوگا، یعنی اس نے ایسا خواب دیکھا جو مستقبل میں شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، وہ اپنے انیس سالہ تجربات ومشاہدات کے بعد کچھ صاف صاف باتیں بھی اس نے کہی ہیں وہ اپنے اس لکچر میں کہتا ہے:

''اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں

---

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۲۰۱-۲۰۲

میں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کرر ہے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں گے، مسلمانوں کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، لیکن ہندو اس باب میں زیادہ سخت ہیں چنانچہ انہیں کی جماعت کے افراد مسیحی مذہب زیادہ قبول کرر ہے ہیں، ایک کتاب اردو میں لکھی گئی ہے، مدارس کے محترم اسقف نے از راہ عنایت اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے، اس کتاب سے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی ہے، ہر جگہ مولویوں نے جلسے کر کے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دیا ہے، جو لوگ ابھی حال میں مسیحی زمرے میں شامل ہوئے ہیں ان میں مولوی سراج الدین پانی پتی قابل ذکر ہیں ان کی عمر اس وقت سو سال ہے اور وہ اس وقت انگریزی کلیسا میں پادری ہیں وہ عماد الدین کے والد ہیں، ان کے بھائی خیر الدین اور ان کی بیوی اور خود عماد الدین کی بیوی کے سوا اس خاندان کے سب افراد نے عیسائی مذہب قبول کرلیا ہے، کریم الدین اس خاندان کے واحد شخص ہیں جو اب تک اسلام کے نام لیوا ہیں، ایک دن آنے والا ہے جب پورا ہندوستان مسیحی جھنڈے کے تلے ہوگا ہمیں پوری توقع ہے، براہ راست حکومت برطانیہ کے تحت اس وقت ۱۵ کروڑ ہندوستانی زندگی بسر کرر ہے ہیں، ان میں سے دس لاکھ پچانوے ہزار عیسائی ہیں ان میں چھ لاکھ چالیس ہزار رومن کیتھولک اور چار لاکھ ترپن ہزار پروٹسٹنٹ وغیرہ ہیں، گیارہ کروڑ برہمنی مذہب کے ہندو ہیں تیس لاکھ بدھ مت کے متبعین ہیں دو کروڑ پچاس لاکھ مسلمان ہیں، ایک کروڑ بیس لاکھ قدیم باشندے ہیں جو نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں ستر لاکھ پارسی اور یہودی وغیرہ ہیں[1]۔

عیسائیت کی تبلیغ اور حکومت کے رویہ کے سلسلہ میں ان لکچروں کو خصوصیت سے

---

[1] خطباتِ گارسن وتاسی ج:۲،ص:۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷

اس لئے منتخب کیا گیا کہ یہ وہی زمانہ ہے جب یہ مہم پورے شباب پر تھی اور اس کے یہ لکچر ہندوستان سے بہت دور پیرس میں طلبہ کے سامنے دیئے گئے ہیں، کسی پروپیگنڈہ کی غرض سے نہیں کہ بہت سے حقائق کے اظہار میں مصلحت مانع ہو، اس نے پوری سچائی اور دیانتداری کے ساتھ یہ معلومات فراہم کی ہیں، چونکہ اس کا ذریعہ معلومات ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ذمہ دار حکام تھے اس لئے اس کی معلومات مستند بھی ہیں اور قابل قبول بھی۔

ان لکچروں کے علاوہ ہندوستان میں لکھی جانے والی بہت سی کتابوں سے بھی ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور عیسائیت کی تبلیغ میں حکومت کی چیرہ دستیوں اور اس کے مستبدانہ رویہ کا واضح ثبوت ملتا ہے، ان کتابوں میں خاص طور سے سرسید کی ''اسباب بغاوت ہند'' قابل ذکر ہے جس میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ حکومت کے رویہ سے بلا امتیاز ہر شخص یہ یقین کئے ہوئے ہے کہ حکومت تمام ملازمین سرکار کو ایک دن بجبر واکراہ عیسائی بنا کر رہے گی، اسی طرح عام ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے سلسلہ میں کلکتہ کے لاٹ پادری کی وہ گشتی چھٹی بھی نقل کی گئی ہے جس میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجبر واکراہ عیسائی بنانے کی کاروائی کا آغاز کر دیا جائے۔

یہی وہ ماحول اور حالات ہیں جب **دارالعلوم دیوبند** کا قیام عمل میں آیا۔

تصویر کا دوسرا رُخ

ہم نے کوشش کی ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں جب ہندوستانی مسلمانوں کا نیر اقبال مائل بہ زوال ہوتے ہوتے ایک غیر معین مدت تک کے لئے غروب ہوگیا، اس وقت اور اس کے متصلاً بعد مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے عوامل ان کے ماحول اور گردو پیش کے حالات، ذہنی وفکری ارتداد کے حوادث اور ان کی اپنی عملی شناخت کھودینے پر ایک ہلکی سی روشنی ڈال دیں، اس سلسلہ میں ہم نے انیسویں صدی کے فتنہ عظیم عیسائیت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔

یہ فتنہ صرف عیسائی مشنریوں کا پیدا کردہ ہوتا اور اس کی پشت پر کوئی دوسری مادی طاقت نہ ہوتی تو علماء اسلام اس کو کب دفن کر چکے ہوتے، لیکن عیسائیت کا تبلیغی کارواں جب ہندوستان میں گرم سفر ہوا تو بانگ جرس کے پس منظر میں چمچماتی ہوئی تلواروں کی جھنکار بھی صاف سنادے رہی تھی جو ہر دل کو خوف و ہراس کی آماجگاہ بنا رہی تھی، اس لئے یہ مشنری کارواں نہیں بلکہ عیسائیت کی مسلح فوج کا مارچ تھا، صرف صورت سوداگروں کی تھی، جذبات اور حوصلے غارتگرانہ تھے، بالکل ایسے ہی جیسے یہ سفید فام قوم ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اوڑھے مچھلی، بانس اور نیل کی تجارت کرتے ہوئے بنگال میں میر جعفر کو لے کر سراج الدولہ کی چالیس ہزار فوج کو اپنے چند ہزار سپاہیوں کے تعاون سے چند گھنٹوں میں دھول چٹادی، میسور میں میر صادق اور پورنیا کو سامنے کھڑا کرکے سلطان ٹیپو جیسے بہادر فرمانبردا کو ایسی جگہ مارا جہاں اس کو پانی نہ مل سکا۔

اسی طرح عیسائیت کا ہندوستان میں سفر بھی دونوں رخ رکھتا تھا، ایک طرف پادری جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مسلمانوں کو مناظرہ کے لئے للکارتے بھی رہے دوسری طرف اگر عیسائی مشنریوں کی راہ میں کسی نے رکاوٹ ڈالنے کی غلطی کردی تو حکومت کی مشنری اس کو پیس کر رکھ دیتی تھی، اس وقت تمام کلیدی عہدوں پر

مشنری ذہن ومزاج کے حکام رکھے جاتے تھے، پولیس کو حکم تھا کہ تبلیغ عیسائیت میں پادریوں کو بھر پور تعاون دے اس لئے جب مجمع عام میں پادری اسلام پر اعتراضات کے زہریلے تیر چلاتے تھے اور مسلمانوں کے مذہب اور پیغمبر کی ذات مقدس پر تنقید کرتے اور لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دیتے تھے، تو ہر شخص صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ پادریوں کی زبان سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظالم حکمراں بول رہے ہیں۔

حکومت کی ہیبت اور رعب داب:

انگریز سوداگروں کی ہندوستان میں ابھی نئی نئی حکومت تھی، ہندوستان کی سرزمین ہندوستانیوں کے خون سے لالہ زاری بنی ہوئی تھی اور اس سے بڑے مظالم کے لئے یہ انگریز حکومت پر تول رہی تھی ایسے حالات میں کس کی ہمت تھی کہ پادریوں کے ان چیلنجوں کا جواب دے اور ان کی دعوتِ مبارزت قبول کر کے میدان مناظرہ میں اترے لیکن جب پانی سر سے اوپر ہو چکا، تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے اصول کے مطابق اسلامی غیرت وحمیت نے ایک بار جوش مارا اور ایک مرد مجاہد سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر پڑا، اور وہ مولانا[1] رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے انھوں نے خطرات سے صرفِ نظر کیا، مصلحت اندیشی کو ٹھوکر ماری اور عشق کی امتحان گاہ میں اتر پڑے۔

---

[1] مولانا رحمت اللہ کیرانوی اپنے دور کے جید عالم تھے اور ایک رئیس کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے، شاہانِ مغلیہ کی طرف سے ان کے آباء واجداد کو بہت بڑی جاگیر دی گئی تھی، آپ کی پیدائش محلّہ دربار قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر میں جمادی الاول ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں ہوئی آپ عثمانی شیوخ میں سے ہیں، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور تکمیل دہلی کے مدرسہ مولانا حیات میں کی، مزید تعلیم کے لئے آپ نے لکھنؤ کا سفر کیا اور مفتی سعد اللہ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے معاصرین ایک ہی جذبہ جہاد سے ان سب کے سینے معمور تھے، کچھ دِنوں آپ نے اپنے محلّہ دربار میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور کئی مشہور علماء کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا، ۱۸۵۴ء کا حادثہ ہو گیا، حکومت کو انتقام کا بہانہ ہاتھ آ گیا، آپ کو گرفتار کر کے سزا دینی چاہی لیکن بہ عنایت خداوندی خفیہ طور پر مکہ مکرمہ پہنچ گئے، اور وہیں سکونت اختیار کر لی، سلطانِ ترکی کو جب اطلاع ملی کہ پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے والے عالم مکہ مکرمہ میں ہیں تو ان کو باقاعدہ دعوت نامہ دے کر ترکی بلایا اور بڑا اعزاز کیا، ترکی سے واپسی کے بعد آپ نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا جو آج بھی جاری ہے، تقریباً پچاس سال مکہ میں مہاجر بن کر رہے اور ۲۲/رمضان ۱۳۰۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے جوارِ جنت المعلاۃ میں آسودۂ خواب ہوئے۔ (اسیرادروی)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مناظرۂ اکبرآباد:

عیسائی پادریوں کا سرخیل پادری فنڈر تھا، اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز دارالسلطنت دہلی کو بنایا تھا، دہلی کا شاہجہانی مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اسلام پر اعتراضات اور علماء اسلام کو مناظرہ کا چیلنج کیا کرتا تھا، لیکن مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اور ان کی مثال اس چڑیا کی تھی جسے کسی شکاری نے پکڑ کر پروں کو باندھ دیا تھا، اس لئے پادری فنڈر کے دعویٰ مبارزت کے جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، حالات کی ناسازگاری کے باجود ابھی ہندوستان میں ایسے علماء موجود تھے جو فولادی عزم وارادے کے مالک تھے، وہ اسلام پر ان شدید حملوں کو دیکھ کر ضبط نہ کرسکے، ایسے ہی لوگوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر پادری فنڈر کی دریدہ دہنی اور لاف زنی کا جواب دینے کا تہیہ کرلیا اور سر سے کفن باندھ کر میدان عمل میں اتر پڑے اور انہوں نے اعلان کیا:

> ''میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علماء مسیحین میں ممتاز حیثیت کا مالک اور میزان الحق کا منصف ہے اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ کرے تاکہ حق واضح ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ علماء اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لئے نہیں کی کہ وہ عاجز تھے بلکہ وہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے''۔

مولانا کیرانوی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے لئے جدوجہد فرمائی کہ پادری فنڈر کو مجبور کردیں کہ وہ میدان مناظرہ میں آئے اور بالمشافہہ مجمع عام میں گفتگو کرے، آپ مہاراجہ بنارس کے میر مختار مولوی امیر اللہ صاحب کو لے کر پادری فنڈر کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے تاکہ مناظرہ کے لئے گفتگو کریں، فنڈر مکان پر نہیں تھا

اس لئے آپ نے ۲۳/ مارچ ۱۸۵۴ء سے پادری فنڈر سے خط و کتابت کا آغاز کیا اور اس سلسلہ کا آخری خط مولانا موصوف نے ۷/ اپریل ۱۸۵۴ء کو لکھا ان خطوط میں عنوان مناظرہ، مقام، اور تاریخ مناظرہ طے ہوئی اور طرفین کے اتفاق سے مناظرہ کے ابتدائی مراحل طے ہوئے اور مورخہ ۱۱/ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰/ اپریل ۱۸۵۱ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں بمقام کٹرہ عبدالمسیح ہونا طے پا گیا۔

مناظرہ سے حکومت کی دلچسپی:

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان یہ مناظرہ نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے دم خم اور جرأت و ہمت اور انگریزی حکومت کے رعب وداب، طاقت و جبروت کے درمیان مقابلہ تھا، چونکہ پوری انگریزی قوم ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا عزم بالجزم کئے ہوئے تھی اور اس راہ کا سنگ گراں صرف مسلمان بن رہا تھا اس لئے حکومت مسلمانوں کو اس موقعہ پر بھی مرعوب کرنا ضروری سمجھتی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے معرکۃ الآراء مناظرہ میں شریک ہونے والے عوام وخواص کی تعداد تو ایک ہزار سے بھی کم تھی لیکن حکومت کی انتظامیہ کے بڑے عہدیدار اور فوج کے بہت سے اعلیٰ افسران اس مناظرہ میں شرکت کے لئے کٹرہ عبدالمسیح اکبر آباد میں موجود ہیں، مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی مسٹر کرسچن سکنڈ صدر صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈلی ترجمان حکومت، پادری ولیم گلبن اور ہندوستانی ملازمین حکومت میں منشی ریاض الدین، مولوی فیض احمد سرشتہ دار صدر بورڈ مولوی حضور احمد، مولوی امیر اللہ مختار راجہ بنارس اس مناظرہ میں شریک ہیں، مسلمانوں کی حمایت و ہمدردی میں مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، منشی سراج الحق جیسے کچھ افراد بھی شریک مناظرہ تھے۔

مسلمانوں کی طرف سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظر تھے اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں آپکے معاون تھے، عیسائیوں کی طرف سے یورپ کا مایہ ناز پادری فنڈر مناظر تھا،

اور اسکی امداد اور تعاون کیلئے درجنوں اردو فارسی اور عربی کے ماہر پادریوں کی فوج تھی۔

موضوع مناظرہ:

موضوع مناظرہ کے سلسلہ میں فریقین کے درمیان بنیادی اختلافی مسائل ہیں انہیں پر مناظرہ ہوگا، وہ پانچ مسئلے ہیں، تحریف انجیل، نسخ انجیل، عقیدۂ تثلیث، حقیقت قرآن، نبوت محمدی، پہلے تین مسائل میں مسلمان مدعی ہوں گے، اور عیسائی مناظرین اس کا جواب دیں گے، حقیقت قرآن اور نبوت محمدی کے ثبوت ودلائل مسلمان مناظر کی طرف سے دیئے جائیں گے، لیکن پہلے ہی مسئلہ تحریف انجیل زیر بحث آیا تو یورپ کے مایہ ناز پادریوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے، اور ان کو احساس ہوا کہ ہماری لن ترانیاں اسی وقت تک تھیں جب تک مسلمان تلوار کے خوف سے زبان بند کئے ہوئے تھا اور جب دلائل وشواہد، اعتراضات اور سوالات وجوابات کی کسوٹی پر مسلمان مناظر پادریوں کی علمی صلاحیتوں کے کھوٹے سکوں کو پرکھنے لگا تو وہ سب سے ردی ثابت ہوں گے اور سوائے ذلت وشرمساری کے ان کے مقدر میں اور کچھ نہیں ہوگا، چنانچہ روداد مناظرہ ہم کو یہ ساری تفصیل سناتی ہے۔

مناظرہ کا اہم ترین موضوع:

پادری فنڈر نے اپنی کتابوں میں جا بجا لکھا تھا اور اپنی تقریروں میں وہ اس بات کو بار بار بانگ دہل کہتا تھا کہ جب تک اہل اسلام عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو محرف ثابت نہ کردیں، انہیں دوسری باتوں پر بولنے کا کوئی حق نہیں ہے، مناظرہ میں بھی سب سے پہلے یہی مسئلہ زیر بحث آیا تو کتب مقدسہ کی تحریف کو ثابت کریں ورنہ قرآن کو چھوڑ کر عیسائیت مذہب قبول کرلیں۔

شرائط مناظرہ کے ساتھ یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ دونوں فریق میں سے کوئی بھی فریق اپنے حریف کی باتوں کا جواب نہیں دے سکے گا، تو وہ دوسرے فریق کے مذہب کو قبول

کر لے گا، اسلئے پادری فنڈر اسی مسئلہ تحریف پر مسلمانوں کی زبان بند کردینا چاہتا تھا۔

مباحثہ کا آغاز:

سب سے پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی اسٹیج پر آئے اور آپ نے انجیل کے محرف ہونے پر متعدد دلائل پیش کیے، لیکن جب پادری فنڈر تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو اس نے ان دلائل کو بے وزن اور ناقابل توجہ قرار دیا اور کہا کہ ان دلائل سے انجیل کا محرف ہونا ثابت نہیں ہوتا، انجیل میں تحریف اس وقت ثابت ہوسکتی ہے جب آپ لوگ ایسی عبارت پیش کریں جو اگلے نسخوں میں تو نہ ہو لیکن حال کے نسخوں میں وہ عبارت پائی جاتی ہو۔

تحریف کا ناقابل تردید ثبوت:

مولانا رحمت اللہ صاحب کے دست راست ڈاکٹر وزیر خان عبرانی زبان سے واقف تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تحریف کے مسئلہ پر وہ پورے طور پر تیار تھے، انہوں نے یوحنا کے پہلے خط باب ۵ آیت ۷، ۸ کا حوالہ دیا کہ سب مانتے ہیں کہ یہ آیات پرانے نسخوں میں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے نسخوں میں موجود ہیں، یہ ایسا ناقابل انکار ثبوت تھا کہ مجبوراً پادری فنڈر کو کھڑے ہو کر کہنا پڑا کہ ہاں صاحب یہاں اور ایک دو جگہ اور تحریف ہوئی ہے۔

یہ بات سنتے ہی مسٹر اسمتھ صدر دیوانی نے جو پادری فرنچ کے برابر بیٹھے ہوئے تھے ان سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ مسلمان بے پناہ خوشی سے اچھل کود رہے ہیں، پادری فرنچ نے ان کو بتایا کہ یہ مولوی صاحب مفسروں کی کتابوں سے چھ سات مقامات جن میں تحریف کا اقرار ہوا ہے نکال کر سند لائے ہیں، اس کے بعد پادری فرنچ نے کھڑے ہو کر کہا کہ فنڈر صاحب بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ انجیل مقدس میں سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے، اس بات پر مولوی قمر الاسلام صاحب امام

جامع مسجد آگرہ نے منشی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار سے کہا کہ آپ لکھ لیجئے کہ پادری صاحب نے آٹھ جگہ تحریف کا اقرار کیا ہے، پادری فنڈر نے یہ سن کر کہا کہ ہاں ضرور لکھ لیں، میں کہتا ہوں کہ سات آٹھ جگہ تبدیل اور تحریف ہوئی ہے۔

بس اس بات کا اعلان ہونا تھا کہ مسلمان مارے خوشی کے اچھل پڑے اور یورپین عیسائیوں کے ہوش اڑ گئے، کہ یہ کیا ہوگیا؟ پادری فنڈر اب تک مسلمانوں کو چیلنج کرتا رہا کہ وہ انجیل میں تحریف کا ثبوت دیں مگر اب مناظرہ کے پہلے ہی دن آٹھ جگہ تحریف کا اقرار کر گئے، ادھر مسلمانوں کے چہرے روشن تھے ادھر عیسائی پادریوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جب پادری فنڈر نے یہ صورت حال دیکھی اور یہ محسوس کیا کہ اس نے عیسائیت کا بیڑہ ہی غرق کر دیا تو وہ ذرا سنبھلے اور بولے کہ مانا کہ کہیں کہیں تحریف ہوئی ہے مگر انجیل کی اصولی تعلیم میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑا، یہ کہتے ہوئے آپ کو اتنا جوش آیا کہ مفتی ریاض الاسلام صاحب سے مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ آپ ہی بتائیے کہ ایسی تحریفوں سے انجیل مقدس کے مطالب میں کیا فرق واقع ہوتا ہے؟

جواب باصواب:

جب پادری فنڈر نے مفتی صاحب کو مخاطب کیا تو مولانا کیرانوی کے بجائے خود مفتی صاحب نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ:

> ''پادری صاحب! جب کسی دستاویز اور وثیقہ میں ایک جگہ جعل اور ملاوٹ ثابت ہوجائے تو پورا وثیقہ نا قابل اعتماد ہوجاتا ہے، اگر بقول آپ کے آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے تو اس کا اعتماد جاتا رہا، کیا ثبوت کہ دوسری جگہ تحریف نہیں ہے؟ اور پھر یہ بھی بتائیے کہ جب عبارت کا اختلاف آپ کے نزدیک مسلم ہے تو جہاں کہیں دو عبارتیں مختلف ہوں تو آپ ان دونوں میں سے ایک کو جزاً خدا کا کلام ٹھہرا سکتے ہیں، یا نہیں؟

اس پر پادری فنڈر نے کہا کہ نہیں، وہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا، مفتی صاحب نے اس پر فرمایا کہ مسلمانوں کا یہی تو دعویٰ ہے کہ موجودہ بائبل کا مجموعہ سب کا سب جزاً خدا کا کلام نہیں ہے اور جب خدا کا یقینی طور پر کلام نہیں ہے تو پوری کتاب نا قابل یقین ہوگئی، اس کا جواب پادری صاحب سے نہ بن پڑا اور وقت کے ختم ہونے کا بہانہ بنا کر میدان مناظرہ چھوڑ دیا''۔

پادری فنڈر کی بدعہدی:

شرائط مناظرہ میں یہ اہم ترین شرط بھی شامل تھی کہ اگر مولانا کیرانوی پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے، تو وہ مذہب عیسوی قبول کرلیں گے اور اگر پادری فنڈر جواب سے عاجز رہ گیا تو وہ اسلام قبول کرلے گا، جلسہ کے حکم اور اونچے طبقے کے انگریز حکام، با اثر مقامی افراد ذی علم ہندو اور مسلمان اشخاص کی پوری جماعت میدان مناظرہ میں موجود تھی، ہزاروں کے اس مجمع میں پادری فنڈر کی زبان پر تالا پڑ گیا، حسب شرائط اپنی شکست تسلیم کرکے اسلام قبول کرلینا چاہئے تھا، لیکن بے غیرتی کا بُرا ہو وہ مسلمان تو کیا ہوتا البتہ اس کے چہرے پر سیاہی پھر گئی۔

ہزاروں کے اس مجمع میں مسیحیوں کو ایسی ذلت آمیز شکست نصیب ہوئی کہ مسیحیوں کے اس بڑے باپ کو منہ چھپا کر فرار کرنا پڑا، بھرا مجمع موجود، حکم موجود، سامعین منتظر مگر پادری فنڈر غائب وہ منہ چھپا کر بھاگا تو سیدھے لندن جا کر ٹھہرا۔

بہت بے آبرو ہو کر......

چونکہ اس مناظرہ میں پادری فنڈر کو شکست فاش ہوئی تھی اور اس کا سارا رعب داب زائل ہو چکا تھا، حتیٰ کہ اس کے معاون پادریوں میں پادری فرنچ اور اس کے دوسرے ساتھی پادریوں میں بھی مایوسی پھیل گئی اس لئے فنڈر نے یہی مناسب سمجھا کہ آئندہ کوئی مناظرہ نہ ہو، حالانکہ ابتداء یہ طے ہو چکا تھا کہ جب تک تحریف اور تنسیخ کا

مسئلہ انجام کو نہ پہنچے بحث کا سلسلہ جاری رہے گا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے معاون ڈاکٹر وزیر خان کئی ہفتے اکبر آباد میں مقیم رہے اور پادری فنڈر سے مطالبہ کرتے رہے کہ مناظرہ کی دوسری مجلس منعقد کیجئے مگر وہ راضی نہیں ہوا اور یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ آئندہ خط و کتابت کے ذریعہ گفتگو ہوسکتی ہے، مولانا رحمت اللہ صاحب نے دیکھ کر کہ پہلے ہی مباحثہ میں خدا کے فضل سے عیسائیت کو کھلی شکست ہوئی، علماء اسلام اور عوام وخواص پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑا اس لئے پادری فنڈر کو بیک بینی و دو گوش نکل بھاگنے کا موقعہ دے دیا۔

راز درون خانہ:

اس مناظرہ کے بعد یہ حال ہوا کہ حضرت مولانا کیرانوی جس طرف نکل جاتے ہندو مسلمان خوش ہوکر مبارک باد دیتے اور عام طور سے لوگ کہتے تھے کہ اس مناظرہ نے ہزاروں انسانوں کے ایمان کو بچالیا اور پادریوں کو ایسی کھلی شکست ہوئی کہ اب وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتے۔

ایک مسلمان باورچی پادری فرنچ کے یہاں ملازم تھا، مولانا کیرانویؒ کے پاس آکر وہ تمام باتیں سناجاتا تھا جو پادریوں کی خفیہ مجلس میں مناظرہ کے دوران ہوتی رہتی تھیں، اس کا بیان ہے کہ تمام پادری سر جوڑ کر رات کے دو بجے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مولوی رحمت اللہ کا مطالعہ بہت وسیع ہے، کوئی کہتا ہے کہ ڈاکٹر محمد وزیر خاں انگریزی اور عبرانی زبان سے واقف ہے، کسی کا مشورہ یہ ہوتا کہ مناظرہ صرف چند گھنٹے ہونا چاہئے تھا، کیوں کہ اس کا اثر اچھا نہیں پڑے گا، غرض یہ مناظرہ کیا ہوا کہ پادری فنڈر اور اس کے ساتھیوں کی کمریں ٹوٹ گئیں اور سمجھ گئے کہ علماء اسلام سے بازی لیجانا ممکن نہیں۔

مناظرہ کی روداد یں:

چونکہ پورا ملک عیسائیت کی یلغار سے سہا ہوا تھا، حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں

اور پادریوں کی پشت پناہی اور تعاون کی وجہ سے پادریوں کی آواز سے حاکمانہ غرور جھلکتا تھا اور طاقت کا احساس دلا رہا تھا، اس کے بالمقابل مسلمان انگریزوں کا کمزور حریف بنا ہوا تھا اس لئے عیسائیت کے خلاف لب کھولنے کے لئے فولاد کا جگر اور پتھر کا کلیجہ چاہیئے تھا، اس لئے ملک میں ہر طرف سناٹا تھا، مخالفت کی ایک آواز بھی کہیں سے سنائی نہیں دیتی تھی، اس لئے جب مولانا کیرانوی نے اکبرآباد میں عیسائیت کے سب سے بڑے اژدہے پر بھرپور اور کاری وار کیا اور اس کی زہریلی پھنکار اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تو پورے ملک نے بڑی بے تابی سے مناظرہ کی کارروائیوں کو جاننا چاہا، شرکاء مناظرہ بھی اس کی اہمیت وافادیت کو محسوس کرتے تھے اس لئے مناظرہ کے دونوں دنوں کی کارروائی ضبط کی جاتی رہی اور فوراً بعد اس کو شائع بھی کر دیا گیا۔

یوں تو مناظرہ کی مفصل کارروائی اس وقت کے بیشتر اخبارات میں شائع ہوتی رہی لیکن اخباری خبروں سے کہیں زیادہ لوگ جاننا چاہتے تھے اس لئے مفصل روداد ہی ان کی تشنگی کو دور کر سکتی تھی، اس کی پہلی روداد فارسی میں مطبع منعمیہ اکبرآباد سے منشی محمد امیر خان نے ''مباحثہ مذہبی'' حصہ اول کے نام سے شائع کی، جس کے ٹائیٹل پیج پر نام کے نیچے عبارت تھی:

''فیما بین جناب مولوی رحمت اللہ صاحب پادری فنڈر صاحب در شہر اکبرآباد واقع شدہ، آں را سید عبداللہ اکبرآبادی ترجمہ نمودہ''۔

یہ روداد ۱۸۷ صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۲۷۱ھ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی، خود پادری فنڈر نے اپنی شکست پر مہر لگانے کے لئے اس مناظرہ کی روداد سکندرا آرفن پریس آگرہ سے ۱۸۵۵ء میں ''اختتام دینی مباحثہ'' کے نام سے چھپوائی جو ۱۵۲/ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس مناظرہ کی اور دوسری کئی ایک رودادیں اسی سال شائع ہوئیں، یہ رودادیں خود پادری فنڈر کی نگاہوں سے بھی گذریں، وہ خود اپنی شائع کردہ روداد میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''اوپر کا خط روانہ کرنے کے بعد مباحثہ کا وہ بیان میری نظر میں آیا جو دہلی سے فارسی زبان میں شائع ہوا، جس کو وزیر الدین ابن شرف الدین نے ''البحث الشریف'' کے نام سے طبع کرایا''۔

اس مناظرہ کی روداد کو اردو، فارسی، اور انگریزی زبانوں میں کثرت سے شائع کیا گیا اور اس قدر یہ رسالے مقبول ہوئے کہ ان سے گھبرا کر خود پادری فنڈر کو بھی اپنی طرف سے روداد شائع کرنی پڑی، مگر سچ ہے کہ اس نے اس مناظرہ میں مولانا کیرانوی کے ہاتھوں ایسی ذلت آمیز اور رسوا کن شکست کھائی تھی کہ وہ اپنی روداد میں بھی اس کو نہ چھپا سکا۔

مناظرہ کا پس منظر:

اکبر آباد کے مناظرہ کی روداد جاننے کے لئے پورا ملک کیوں مضطرب تھا؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے اگر مناظرہ کا پس منظر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے تو آپ ان بے چینیوں کا کچھ اندازہ کر سکیں گے جو لوگوں کو مناظرہ کی کیفیت اور سرگذشت جاننے کے لئے دلوں میں موجزن تھیں۔

بات یہ تھی کہ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کی حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا، باد صرصر کا ایک ہلکا جھونکا بھی اس کے بجھانے کے لئے کافی تھا دوسری طرف انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی تھیں، اور عملی طور پر مسلمانوں کی حکومت بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، اس کا دائرہ اختیار صرف دہلی شہر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، اس زمانہ میں کہا جاتا تھا ''حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم'' انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا، دل میں امنگیں تھیں اور جذبات لمبی سے لمبی چھلانگ لگانے کے لئے مہمیز کر رہے تھے اس لے انگلستان میں اسکیم بنی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے ایک بہت بڑی مہم شروع کی جائے کیونکہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کو عیسائی بنا لیا گیا تو اس کی وجہ سے انگریزی حکومت کے استحکام میں بہت بڑی مدد ملے گی، اور ملک کے

بت پرستوں کو عیسائی بنالینا بہت آسان ہوجائے گا، عام خیال تھا کہ پادری صاحب کے دلائل کا جواب مسلمانوں کے لئے ناممکن ہے، خصوصاً ان کی کتاب ''میزان الحق'' کا جواب کسی مسلمان عالم سے نہیں ہوسکتا، اور تو اور خود مسلمان ان کتابوں سے بہت مرعوب تھے اور بعض نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ معاذ اللہ اسلام جھوٹا ہے، اور پادری جو کچھ کہتے ہیں وہی حق ہے، چنانچہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس مناظرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ماحول کا نقشہ اپنی کتاب ''ازالۃ الشکوک'' میں ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''اب ان وجوہ کا تذکرہ کرتا ہوں جس کے سبب یہ مباحثہ ہوا، اول یہ کہ روز بروز شور وغل پادریوں کا بڑھتا چلا جاتا تھا اور زبانی فریاد کرتے تھے کہ مسلمانوں سے ہماری باتوں کا جواب نہیں بن پڑتا ہے اور اپنے رسالوں کے اخیر میں ایسی ایسی باتیں چھاپنے لگے تھے، اس پر میں نے چاہا کہ اپنے مقدور کے مطابق میں بھی ہاتھ ہلاؤں شاید اللہ کچھ ثمرہ نیک دیوے۔

دوم یہ کہ جس عیسائی سے ملاقات ہوئی اور اس سے جو کچھ تذکرہ آیا اس کی تقریر سے ہی معلوم ہوا کہ ''میزان الحق'' ان کے گمان میں ایسی ہے کہ گویا الہام سے لکھی گئی ہے اور مسلمان اس کے جواب سے عاجز ہیں اگر ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ بات غلط ہے، میزان الحق کا کیا ذکر اس کے مصنف سے بھی مسلمانوں کو کچھ خوف نہیں تو وہ کہتے تھے کہ صاحب جب تم کو اس سے پالا پڑے تب جانو۔

سوم یہ کہ جب میں ایک تقریب سے اکبر آباد کا عازم ہوا تو چلتے وقت ماسٹر رام چندر نے کہ مجھ سے محبت رکھتے تھے اور کچھ عرصہ عیسائیت کا دم بھر کے پادریوں سے بھی زائد تعصب میں قدم بڑھا بڑھا کر رکھتے تھے اور میزان الحق کے بڑے معتقد تھے کہا کہ اگر اتفاق ہو تو پادری فنڈر سے ملئے گا۔

چہارم یہ کہ جب اکبر آباد پہنچا تو بعض بعض کو تذبذب میں پایا، اگر ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے یہی کہا کہ اگر تمہارے پاس آتے ہیں تو تم ہم کو قائل کر دیتے ہو اور اگر کسی اچھے پادری کے پاس جاتے ہیں تو وہ بھی ہم کو لاجواب کر دیتا ہے

تو ہم کس کو سمجھیں کہ تم ہی حق پر ہو اور وہ باطل پر یا بالعکس، بلکہ ہم تو حیرت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہاں اگر مقابلہ منہ در منہ ہو جائے تو ہماری حیرانی کچھ دفع ہو جائے۔

(کتاب ازالۃ الشکوک مؤلفہ مولانا رحمت اللہ کرانوی جلد دوم ص ۴۷۴)

حکومت کی اسکیم فیل ہوگئی:

اکبرآباد کے مناظرہ نے درحقیقت اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کا رول ادا کیا جو عیسائیت کی شکل میں یورپ سے بڑی روانی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آرہا تھا، اور پورا پورا خطرہ تھا کہ سارے ملک کو بہالے جائے گا، مولانا کیرانوی کی جرأت ایمانی نے مؤرخ کے ہاتھ سے قلم چھین لیا جو ہندوستان میں اندلس کی تاریخ دہرائے جانے کی کہانی لکھنے کی تیاری کررہا تھا، پورا یورپ منصوبہ بند طریقے سے ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی مہم چلانے کے لے میدان میں اتر چکا تھا اور ایک نحیف الخلقت انسان نے اتنی بڑی اور طاقتور حکومت کے سارے پروگرام کو چشم زدن میں خاک میں ملادیا، یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ حکومت اس کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرسکتی تھی اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس کینہ پرور انگریز قوم نے مولانا کیرانوی کی اس جرأت ایمانی کو معاف نہیں کیا۔

حکومت کا انتقام:

ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے انگریز قوم نے ایک مستقل پلان بنایا کہ منصوبہ بند طریقے سے پورے ملک کو اندلس کی طرح عیسائی بنادیا جائے تو یہ ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمارے قبضہ میں رہ جائے گا، اگر ہندوستان میں اسلام زندہ رہے گا تو ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا محل کبھی بھی زمیں بوس ہوسکتا ہے، اسی جذبے اور خیال کے ماتحت ایک مکمل نقشہ عمل مرتب کیا گیا

اوراس کے مطابق کام کا آغاز بھی کر دیا گیا لیکن جس شیر کو مردہ سمجھ کر اس کو زمین میں دفن کر دینے کی تیاری کر رہے تھے وہ ایک بار پھر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی فطری زلزلہ افگن ڈکار لی تو پادریوں کی فوج پر سکتہ طاری ہو گیا اور خوف ودہشت سے کونوں اور کھدروں میں چھپنے لگی، پادری فنڈر بھاگا بھاگا پھرتا رہا یہاں تک کہ ہندوستان سے مایوس ہو کر یورپ چلا گیا اور ہندوستان میں ناکامی کی وجہ سے وہاں بھی اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تو بھاگ کر ترکی چلا گیا، اور جب مولانا رحمت اللہ ترکی پہنچے اور اس کو خبر لگی تو وہاں سے راتوں رات نکل گیا، اس کے بعد پھر کبھی بھی یورپ کی کسی کھڑکی سے ہندوستان کی طرف جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی اور گمنامی کی زندگی گذار کر کہیں مر کھپ گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء:

پادری فنڈر کے علاوہ ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں حشرات الارض کی طرح پادریوں کی جوفوج رینگ رہی تھی وہ خود سمٹ کر ہندوستان کے ساحلی اور جنگلی علاقوں کی طرف چلی گئی اور جرائم پیشہ اور وحشی اقوام میں عیسائیت کی تبلیغ میں لگ گئی اور ہندوستان کے شہری علاقوں اور متمدن، تعلیم یافتہ صوبوں میں کچھ کہنے اور کرنے کی ان میں ہمت نہیں رہ گئی، یہ انگریزی حکومت کی بہت بڑی ناکامی تھی، اس کا بنا بنایا سارا منصوبہ تہس نہس ہو کر رہ گیا جس کی وجہ سے انگریزی حکومت جھنجھلائی ہوئی تھی اور مسلمانوں پر دانت پیس رہی تھی مگر انتقام کی کوئی شکل نظر نہیں آ رہی تھی، مسلمانوں کی یا ہندوستان کی بدقسمتی سے ڈھائی سال بعد ۱۸۵۷ء کا حادثہ پیش آ گیا، ہندوستان کی غیرت ایک بار اور بیدار ہوئی اور میرٹھ سے بغاوت کا بگل بجا دیا گیا، اور دہلی پر قبضہ کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ایک آخری کوشش کی گئی لیکن ہندوستان اس کوشش میں بھی ناکام ہو گیا، انگریزوں نے ہندوستان بالخصوص مسلمانوں سے بھرپور انتقام لیا اس درندگی وبربریت کے نظاروں کو دیکھ کر پوری دنیائے انسانیت چیخ

پڑی، مکھی مچھر کی طرح مسلمانوں کو عذاب کی چکی میں پیس دیا گیا، مسلمانوں کو پھانسی دینے کیلئے میلے لگائے جاتے، تماشائیوں کی بھیڑ اکٹھا کی جاتی اور مسلمانوں کو توپ کی نال سے باندھ کر توپ چلادی جاتی، اس معصوم انسان کے جسم کے گوشت کے ٹکڑے کاغذ کے پرزوں کی طرح فضا میں اڑنے لگتے اور زمین پر خون کی بارش ہو جاتی۔

یہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کفن بردوش شریک ہوئے اور انگریزی فوجوں سے دست بدست جنگ کی، اس موقعہ پر انگریزوں نے اپنے ان دشمنوں کو بھی فراموش نہیں کیا، جنہوں نے ان کے فروغ عیسائیت کے منصوبہ کو ڈائنامیٹ کیا تھا، اس لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان کیسے بچ سکتے تھے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے وارنٹ کے ساتھ اکبر آباد مناظرہ میں پیش پیش رہنے والے ان دونوں بزرگوں کو بھی گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھانے کے ارادہ سے پولیس کو ان کی گرفتاری پر لگایا۔

پولیس کیرانہ کے محلّہ دربار میں پہنچی جہاں مولانا موصوف کا مکان تھا، پولیس کو مخبر نے بتایا کہ مولانا مسجد میں نماز پڑھنے آئے ہیں، پولیس نے مسجد کا محاصرہ کر لیا، لیکن مولانا کو موقعہ مل گیا اور مسجد کے حجرے سے نکل کر جس کا دروازہ محلّہ کے ایک مکان میں تھا اور ادھر سے جنگل ملا ہوا تھا، پنجیٹھ گاؤں میں چلے گئے جو کیرانہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر ہے، جس میں کیرانہ کے عثمانی خاندان اور انصاری شیوخ کی زمینداری تھی، مولانا اپنے ایک کاشتکار کے یہاں ٹھہر گئے، پولیس کے مخبر نے پھر پولیس کو خبر کر دی، پولیس پنجیٹھ پہنچی اور کاشتکار کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور گھر کی تلاشی لی۔

وہ کاشتکار گاؤں کا مکھیا تھا اس کو جب فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے مولانا موصوف سے کہا کہ آپ کھرپا لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں، گورہ فوج اسی کھیت کی پکڈنڈی سے گذری مولانا بیان کرتے تھے کہ میں کھیت میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگتی تھیں، میں ان کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

آخر مولانا بچتے بچاتے سورت کی بندرگاہ تک پہنچے اور ایک بادبانی جہاز میں کسی نہ کسی طرح سوار ہو گئے مگر ایک پولیس افسر نے مولانا کو پہچان لیا اور فوٹو سے چہرے کی مطابقت کر کے فوٹو اور وارنٹ دکھلایا اور کہا کہ مجھے آپ کی گرفتاری کا حکم ہے مگر میں مسلمان ہوں یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل ہی رہے تھے کہ جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور جدہ کی طرف روانہ ہو گیا، مولانا بخیریت مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور ساری زندگی وہیں گذاری مکہ میں مدرسہ صولتیہ آپ کی مقدس یادگار ہے ۲۲ / رمضان ۱۳۰۸ء مطابق ۱۸۹۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

ڈاکٹر وزیر خان:

اکبر آباد میں عیسائی مناظرین کو ذلت آمیز شکست دینے میں مولانا رحمت اللہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان بھی تھے، اس مناظرہ میں ان کا رول بہت نمایاں تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنے شدید دشمنوں میں شمار کیا اور ان کے نام وارنٹ جاری کر دیا گیا، گرفتاری کا مطلب تختہ دار تھا، ڈاکٹر صاحب بھی اس سے بے خبر نہیں تھے وہ خفیہ طور پر حدود ہند سے نکل گئے، کچھ دنوں بعد حکومت کو پتہ چلا کہ ڈاکٹر وزیر خان مکہ معظّمہ میں ہیں، انگریزوں نے ترکی حکومت کو لکھا اور زور ڈالا کہ ہمارا مجرم آپ کے حدود سلطنت میں ہے اس لئے آپ گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دیں۔

سلطان ترکی نے مکہ کے گورنر کو لکھا کہ ڈاکٹر وزیر خان کو گرفتار کر لیا جائے، چنانچہ گورنر نے ڈاکٹر وزیر خان کو بلایا اور باب خلافت سے آئے ہوئے حکم سے ان کو باخبر کیا، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اللہ اور رسول کی پناہ میں آ گیا ہوں، مجھے یہاں سے گرفتار کر کے دشمنان دین کے حوالہ کرنا کسی طرح آپ کے لئے جائز نہیں، اور اگر مجھے گرفتار کرنا ہی ہے تو میری گرفتاری سے پہلے فلاں قبیلہ کے سردار سے گفتگو کر لیجئے، کیونکہ میں اسی قبیلہ کے ساتھ زندگی گذار رہا ہوں، ڈاکٹر صاحب کا سردار قبیلہ سے تعارف اس کی قریب مرگ بیوی کے کامیاب علاج کے ذریعہ ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا

اس قبیلہ میں بڑا اعزاز واحترام تھا، گورنر نے سردار قبیلہ کو بلایا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا تو سردار نے گورنر سے کہا کہ آپ بے شک ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کر سکتے ہیں، مگر اس وقت جب میرے قبیلے کے بیس ہزار جوانوں میں سے ایک ایک کٹ کر مر نہ جائے اس وقت تک آپ ڈاکٹر صاحب کو گرفتار نہیں کر سکتے۔

گورنر نے ڈاکٹر صاحب کا جواب اور سردار قبیلہ کی بات لکھ کر دربار خلافت کو بھیج دی، خلیفہ نے انگریزوں کو جواب لکھ دیا کہ کسی مسلمان کو حرم محترم سے گرفتار کرکے کافروں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا، اس طرح ڈاکٹر وزیر خان انگریزوں کے شکنجۂ عذاب سے محفوظ رہے، پوری زندگی حرم محترم کے جوار میں گذار کر اسی پاک سرزمین میں آسودۂ خواب ہوئے۔

تبلیغ عیسائیت کا دوسرا دور

ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کی جدوجہد کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جدوجہد جو غدر ۱۸۵۷ء سے قبل شروع کی گئی اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا پنجۂ استبداد مسلمانوں کی حکومت کے گلے پر سختی کے ساتھ جم چکا تھا، حکومت مغلیہ کے چراغ کی لو آخری سانس لے رہی تھی، دہلی دربار میں انگریزی ریذیڈنٹ رہنے لگا تھا اس کی مرضی کے بغیر بہادر شاہ ظفر اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر سکتا تھا اور عملاً انگریز ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا۔

یورپ میں جب یہ سنا گیا کہ انگلستان کے چور، اچکے، بدمعاش و بدکردار افراد بھاگ کر ہندوستان گئے تھے وہ بانس، مچھلی، بھس اور نیل کی تجارت کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے ہندوستان جیسے وسیع و زرخیز ملک پر قابض ہو گئے اور وہاں کے بادشاہ کو مٹھی میں لے لیا ہے تو انگلستان میں خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی، اب یہی بداطوار افراد جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی تھی یورپ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، کیونکہ کمپنی کے ارکان جب لندن جاتے تھے تو ہندوستان میں بے انتہا کمائی کی وجہ

سے وہاں شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے تو عام انگریزوں کو ان کی قسمت پر رشک ہونے لگتا تھا اس لئے فطری طور پر ہندوستان میں کاروبار کرنے والے انگریزوں کا یورپ میں وقار و اعزاز بڑھ گیا، اس لئے وہاں کی حکومت نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون و امداد کا فیصلہ کرلیا کہ ہندوستان پر انگریز قوم کا قبضہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے، اس کی تدبیر وہاں کے دانشوروں کے ذہن میں یہ آئی کہ ہندوستان میں ایک مہم کے طور پر منصوبہ بند طریقے سے عیسائیت کو پھیلا جائے کیونکہ جب ہندوستان میں عیسائیت پھیل جائے گی اور وہاں کی اکثریت عیسائیت قبول کرلے گی تو ان کو ہم مذہب ہونے کی وجہ سے انگریز قوم سے ہمدردی ہو جائے گی اس سے انگریزی حکومت کو استحکام حاصل ہوگا اس کا ایک کامیاب تجربہ وہ اندلس میں کر چکے تھے یہ تو طے تھا کہ ہندوستان میں حکومت ہندوستانیوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں اور نظام حکومت چلانے کے لئے یورپ سے اتنی بڑی تعداد ہندوستان منتقل نہیں ہوسکتی کہ حکومت کے تمام شعبوں میں یورپین رکھے جائیں اس لئے انگریزوں نے دین عیسائیت کی محبت کی وجہ سے نہیں حکومت کی حرص سے بطور سیاست عیسائیت کے فروغ کا یہ لمبا چوڑا پلان بنایا، پادریوں کی ٹریننگ کے لئے تربیت گاہیں قائم کی گئیں، ان کو عربی فارسی اور اردو زبانیں سکھائی گئیں، اسلامی علوم وفنون پڑھائے گئے، تصنیف وتالیف کا سلیقہ سکھایا گیا اور مسلمانوں سے مناظرہ کی ان کو تربیت دی گئی اور جب آٹھ دس سال کی شب وروز کی جدوجہد کے بعد پادریوں کی یہ فوج تیار ہوگئی تو ان کو ایک جہاز سے لاکر ہندوستان کے ساحل پر اتار دیا گیا اور ملتان سے لے کر چاٹگام اور برما تک پادریوں کی اس فوج کو پھیلا دیا گیا، ہزاروں کی تعداد میں یورپین پادری اپنے لمبے چوڑے بجٹ کے ساتھ ہندوستان میں سرگرم کار ہوگئے۔

پادریوں کی کارگذاری:

چونکہ ان پادریوں کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے وہ بلاجھجھک

جہاں چاہتے کھڑے ہوکر اسلام کے خلاف زہر چکانی کرتے رہتے تھے، خالص مسلمانوں کے مجمع میں وہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو نشانہ تنقید بنائے مگر کسی مسلمان میں یہ ہمت وجرأت نہیں تھی کہ انہیں ٹوک سکے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں پر کتنا خوف وہراس چھایا ہوا تھا۔

پادریوں کی جدوجہد کا مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوتا تھا، کچھ ممتاز قسم کے ہندوؤں نے عیسائیت قبول کرلی، مسلمانوں میں بھی بعض خاندان عیسائی ہوگئے، ان عیسائیت قبول کرنے والوں کا خوب پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا تاکہ دوسرے لوگ اس سے متاثر ہوں اسی دوران کلکتہ کے بڑے پادری ایڈمنڈ کی گشتی چٹھی نے ہندوستانیوں کے بالخصوص مسلمانوں کے دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا، اس نے حکومت سے اپیل کی کہ اگر ہندوستانی بخوشی عیسائیت قبول نہیں کرتے تو ان کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم شروع کردی جائے۔

اسی دوران ایک واقعہ اور ہوا ۱۸۳۷ء میں ایک بار زبردست قحط پڑا اور بے شمار بچے یتیم ہوگئے، حکومت نے ان بچوں کو اپنی تربیت میں لے لیا اور بعد میں سب کو عیسائی بنالیا چاہے وہ مسلمانوں کی اولاد رہی ہو یا ہندوؤں کی، ان واقعات کی وجہ سے پورا ہندوستان اپنی جگہ سہما ہوا تھا کہ انگریز افہام وتفہیم کے ذریعہ عیسائیت کی ابھی تبلیغ کررہا ہے عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ پورے ملک کو تلوار کی نوک پر عیسائی بننے کے لئے مجبور کردیا جائے گا، ادھر پادریوں کے پروپیگنڈہ اور یک طرفہ بیان کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کا ایمان بھی ڈگمگانے لگا تھا یا کم ازکم عیسائیت کے لئے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا اور اگر کچھ دنوں تک اور یہ پادری بے لگام رہتے تو نہیں معلوم اس کا انجام کیا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو میدان عمل میں کھڑا کردیا اور انہوں ہوا کا رخ بدل دیا۔

پالیسی بدلی:

مولانا رحمت اللہ اور پادری فنڈر کے مناظرہ کے بعد اتفاق سے چند سالوں بعد

ہی غدر ۱۸۵۷ء کا حادثہ ظہور پذیر ہوگیا جس نے انگریزوں کی ہندوستان میں بنیاد ہلادی اوران کو ہندوستان میں اپنا وجود بھی خطرہ میں نظر آنے لگا اس لئے سب سے پہلے مسئلہ ان کو اپنی حکومت کے بقاء کا درپیش ہوگیا اس لئے قدرتی طور پر تبلیغ عیسائیت کا جوش سرد پڑ گیا، اوراپنی پالیسی بدلنے پر ان کو مجبور ہونا پڑا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد:

مگراس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی یہ مہم ختم ہوگئی یا اس مہم کی طرف سے سرد مہری برتی جانے لگی بس اتنا ہوا کہ وہ گرمی اور زبان وبیان کی تلخی باقی نہیں رہی، اب وہ محتاط طریقے پر اپنی مہم چلانے پر مجبور ہوگئے اور ایک دوسرے منصوبے کے مطابق کام آغاز کردیا، نئی پلاننگ اور نئے نقشے کے مطابق اب ان کی ساری کارروائیاں ہونے لگیں۔

یورپ اور امریکہ میں چرچ کی آمدنی بے حساب تھی ان کا بجٹ ایک چھوٹی سی حکومت کے بجٹ کے برابر ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ ہندوستان جو اس زمانے میں ''سونے کی چڑیا'' کہا جاتا تھا اس سونے کی چڑیا پر انگریزوں کا مکمل قبضہ تھا، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد برطانیہ نے زمام اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لے لی اس لئے ساری آمدنی چاہے حسب معمول طریقے سے ہو یا نئے نئے ٹیکس لگا کر سب کی مالک حکومت برطانیہ ہوچکی تھی اور حکومت ہی تبلیغ عیسائیت کی ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے تھی اس لئے عیسائیت کے فروغ پر بے تحاشا دولت پھونکی جارہی تھی، ہر بڑے شہر میں عیسائی مشن قائم کئے جانے لگے، یہ مشن درحقیقت ایک بڑا ادارہ ہوتا تھا جس سے متعلق بہت سے افراد ہوتے تھے، اسی کے تحت مشن ہسپتال کھولے جاتے جو اعلیٰ پیمانہ پر کام کرتے، یورپ کے مایۂ ناز ڈاکٹر مشنری ذہن ومزاج کے ہوتے ان ہسپتالوں کے علاوہ ہر جگہ مشن اسکول کھولے جاتے اس میں بچوں کو اس نقطہ نگاہ سے تعلیم دی جاتی کہ وہ انگریزی حکومت کی مشنری کے بہترین پرزے ثابت ہوں اور عیسائیت کے لئے ان کے دلوں میں نرم گوشہ بھی پیدا ہوجائے، انجیل کی تعلیم

ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے دی جاتی تھی، ہر مشن میں چرچ کا ہونا ضروری تھا اس میں ہسپتال کے مریضوں اور اسکولوں کے اساتذہ اور طلبہ کو ہفتہ کے دن حاضری ضروری ہوتی، حضرت مریم کی تصویر کے سامنے دعائیں کرائی جاتیں، مریضوں کے لئے شفا کی دعائیں ہوتیں۔

غرضیکہ ہسپتال، اسکول اور چرچ وغیرہ پر لاکھوں لاکھ روپیہ خرچ کیا جاتا تھا، مشن سے وابستہ ہر ہر فرد مشنری دماغ کا ہوتا ہر فرد کے اندر فروغ عیسائیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا تھا، ہسپتال میں کام کرنے والے ڈاکٹر اور نرسیں اور کمپاؤنڈر اسکول کے ٹیچرس تبلیغ عیسائیت کے جذبے سے سرشار ہوتے تھے اس لئے جو مسلمان یا ہندو ان اداروں میں کام کرتا وہ بھی بالعموم عیسائی ہوجاتا تھا، اور اسکی خوب آؤ بھگت ہونے لگتی اس کا اعزاز بڑھ جاتا بسا اوقات اس کے پورے خاندان کے اخراجات کو یہ مشن پورا کرتا تھا، ان کی سفارشوں پر لوگوں کو نوکریاں دی جاتیں۔

عیسائی مشنریوں کا دائرہ کار:

عیسائی مشنریوں نے کتنے وسیع پیمانے پر تبلیغ عیسائیت کو شروع کیا اس کا اندازہ ان رپورٹوں سے ہوتا ہے جو اپنی کارگذاری کے سلسلے میں کبھی کبھی شائع کی جاتی تھیں، عیسائیوں میں متعدد فرقے ہیں، ہر فرقہ اپنے وسائل وذرائع کے مطابق فروغ عیسائیت میں بھرپور حصہ لیتا تھا، ان فرقوں نے آپس کی رضامندی سے اپنے اپنے مقدور اور استطاعت کے موافق کل ہندوستان اور برما کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے تقسیم کرلیا تھا اور اپنے اپنے گروہ کے حدود اور وسعت کی کارروائی پہلے سے تجویز کرلی تھی مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ اور راجپوتانہ اور ہندو ریاستوں میں آئر لینڈ کا رومن کیتھولک اور ممالک مغربی وشمالی میں زیادہ تر امریکہ کا میتھوڈیسٹ چرچ وغیرہ کا کام کرتے تھے۔

اب ان الگ الگ ملکوں کی عیسائی مشنریوں کے کتنے آدمی اور ادارے اس مہم

میں لگے ہوئے تھے اس کی وسعت اور حدود کار کو سمجھنے کے لئے صرف ایک شاخ میتھوڈسٹ ایسکوپل آف امریکہ کی کارروائیوں کا مختصر حال یہ ہے کہ اس کے پادری تبت کے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے لے کر ہند کی جنوبی منتہا راس کماری تک اور بلوچستان کے صدر شہر کوئٹہ کے لئے جو انگریزی عملداری کی مغربی سرحد ہے جزیرہ نما ملایا کی انتہا سنگاپور تک بیس لاکھ مربع میل کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی قصبہ اور قریہ ہندوستان کا باقی نہیں رہا جہاں اس فرقہ کا مشن نہ پایا جاتا ہو اور ہر مشن کے متعلق اتنے گرجے، شفاخانے، چھاپے خانے اور زمینداریاں وگرانٹ، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کے کارخانے اور مذہبی تعلیم کے مدارس ہیں کہ جن کے شمار سے عقل عاجز ہے۔

تحقیق کرنے والوں نے شمار کر کے بتایا کہ اس فرقہ کے دوسو پچاس مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ان شہروں کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ کس شہر میں کتنے مشن سرگرم عمل ہیں اسی سے آپ عیسائیوں کے دوسرے فرقوں کے وسیع نظام عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں، یہ مشن تعلیم وترقی کے نام پر اور مالی امداد کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے پوری قوت سے کوشاں تھے، جو لوگ عیسائیت کا شکار ہوجاتے تھے ان کی برابر خبرگیری اور مالی امداد بھی کی جاتی تھی، گورنمنٹ ان مشنریوں کی پوری امداد کرتی تھی اور ان کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتی تھی۔

مشنریوں کی جدوجہد رائیگاں نہیں تھی:

مختلف طبقات میں کچھ نہ کچھ عیسائیت کے جال میں گرفتار ہوجاتے تھے، کچھ اہل علم ہندوستانیوں نے بھی عیسائیت قبول کرلی اور انہوں نے بھی اپنی صلاحیتوں کو فروغ عیسائیت میں صرف کرنی شروع کردی، یورپین عیسائیوں کے علاوہ دیسی عیسائیوں نے قریہ قریہ جا کر لوگوں کے ذہن ومزاج میں اسلامی عقیدہ کی بنیادوں کو کمزور کرنا شروع کردیا، مسلمان گھرانوں کو جواب عیسائیوں سے زیادہ عیسائیت کے

فروغ میں مفید ثابت ہورہے تھے کیونکہ وہ اسلامی روایات سے واقف تھے اور جو زیادہ پڑھے لکھے تھے وہ قرآن کی تفسیروں میں اسرائیلی روایات کی خرافات کو اسلامی تعلیمات کہہ کر مسلمانوں کے ذہن وایمان کی دنیا میں زلزلہ پیدا کررہے تھے، مزید ستم یہ کہ ہندو گھرانوں سے جو تعلیم یافتہ افراد عیسائی ہوگئے تھے ان کا بھی نشانہ اسلام ہی تھا، ان میں سب سے مشہور نام ماسٹر رام چندر اور ٹھاکر داس کے تھے اول الذکر ایک اسکول میں ٹیچر تھے مگر جب وہ عیسائی ہوگئے تو ان کا اعزاز بہت بڑھا دیا گیا انہوں نے کئی کتابیں اسلام پر اعتراضات کے سلسلہ میں لکھیں۔

جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا:

انیسویں صدی کے آخر تک عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا عبدالحق انہیں دنوں اپنی تفسیر لکھ رہے تھے جو ۱۲۹۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے اس کا طویل ترین مقدمہ انہیں یورپین اور دیسی پادریوں کے ہفوات کے جوابات سے بھرا ہوا ہے، کسی تصنیف کا مقدمہ زمانۂ تصنیف کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ ہر مصنف کا قلم اس کے ماحول کی گرفت میں ہوتا ہے اس لئے کتاب کی ترتیب کے وقت جو حالات جذبات وخیالات اور تحریکات سماج کو متاثر کرتی ہیں ان کا تذکرہ کتاب کے مقدمہ میں اکثر آجاتا ہے، چونکہ تفسیر میں مناظرانہ رنگ کی بحثوں کی گنجائش ذرا کم ہی ہے اس لئے مولانا عبدالحق نے اصل تفسیر سے پہلے اپنے گردوپیش اور ماحول پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور اس دور میں پیدا ہونے والے فتنہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور اسلام کی ترجمانی کی ہے۔

سرسید کی تفسیر:

یہی زمانہ ہے جب سرسید نے اپنی تفسیر لکھی اور اسلام کے بہت سے حقائق کا انکار کیا اور ان کا مذاق اڑایا، اور ان کی مہمل اور خلاف حقیقت تاویلیں کیں اور اسلام

کے بہت سے عقیدوں کے بارے میں اپنے ذہن وفکر سے گھڑ کر ان کے چہروں کو مسخ کیا یہ سب کچھ انہوں نے صرف اس لئے کیا کہ یورپ کی نئی روشنی سے مرعوب تھے، پادریوں کے اعتراضات سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لئے جن باتوں پر وہ اعتراضات کرتے تھے ان کی ایسی خلاف واقعہ تاویلیں کرنا چاہتے تھے تا کہ ان کے اعتراضات سے بچا جا سکے چاہے اسلام کی تعلیمات کا حلیہ ہی بگڑ جائے اس کوشش میں انہوں نے چودہ سو برسوں کی متفق روایات کو ہفوات اور خرافات قرار دے دیا، اس سے آپ یوپین پادریوں کے اثرات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

انہیں اسباب کی وجہ سے مولانا عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں ان تمام اعتراضات کو نقل کر کے ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، میں جستہ جستہ اس مقدمہ کے اقتباسات دیتا ہوں تا کہ آپ کو ان اعتراضات سے اور دل آزار بکواس سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جائے جو انیسویں صدی کے اخیر دنوں تک عیسائیوں کی طرف سے جاری تھیں۔

سوال وجواب کے سلسلے جاری تھے:

مولانا عبدالحق اپنے مقدمۂ تفسیر میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

اسلام کے وہ مخالف لوگ کہ جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور انہوں نے حق وناحق اسلام کی توہین کا بیڑا اٹھا رکھا ہے بلکہ اس کی تنخواہ پاتے ہیں اور خدا ترسی کو عمل میں نہیں لاتے ہیں ایسی ایسی بے سند باتوں سے اسلام پر بڑا اعتراض کرتے ہیں، چنانچہ پادری فنڈر پادری عمادالدین پانی پتی اور پادری صفدر علی صاحب اکبر آبادی اور ماسٹر رام چندر صاحب دہلوی نے تو کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، اپنے ہم مذہبوں کو خوش کرنے کو بڑے بڑے ضخیم رسالے بنا کر مشہور کر دیئے کہ جن کا جواب ناچار اہل اسلام کو دینا پڑا، ماسٹر رام چندر صاحب نے ''تحریف قرآن'' کے نام سے پندرہ سولہ جزوں کا رسالہ اسی بیان

میں لکھا ہے فقیر نے اس کے جواب میں ''تعریف القرآن'' لکھ کر پادری صاحبوں کی ناحق زبان درازی بتلائی ہے (مقدمہ تفسیر حقانی ص ۶۱)

قرآن کو دنیا سے ناپید کرنے کا خبط:

پادریوں کی ریشہ دوانیوں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بھی آپ نے لکھا ہے، اگرچہ اس کی سند بہت قوی نہیں ہے لیکن عیسائی مشنریوں کی حرکات دیکھ کر دل یہ کہتا ہے کہ اگر ایسا انہوں نے سوچا اور اس پر عمل کیا ہو تو کوئی بعید بات نہیں، آپ پہلے واقعہ سن لیجئے مولانا عبدالحق نے اپنے مقدمہ کے صفحہ ۶۳ پر تحریر فرمایا ہے، وہ ہمیں بتاتے ہیں:

''ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب ابتداء عملداری انگریزی میں یہاں پادری لوگ آئے تو انہوں نے بخیال خام اس بات کے کہ یہاں مطابع تو ہیں نہیں، قلمی نسخوں پر مدار ہے مسلمانوں سے قرآن مجید کو گراں گراں قیمت پر خریدنے شروع کئے اور سالہا سال یہ معاملہ رہا چنانچہ میرٹھ اور دہلی کے بہت لوگ معمر اس کی شہادت دیتے ہیں وہ بزرگ کہتے ہیں کہ ایک پادری میرے دوست تھے میں نے ان سے پوچھا کہ سچ کہو یہ اس قدر نسخے تم کیوں خریدتے ہو؟ بالآخر بڑے اصرار سے اس نے یہ راز بتلایا کہ یہاں کے مشن کی رائے ہے کہ ان لوگوں سے نسخے خرید لئے جاویں اور پھر جب قرآن بہت نایاب ہوں تو لندن سے مختلف نسخے قرآن مجید کے طبع کرا کے یہاں کے مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کئے جاویں بس مسلمانوں میں بڑا اختلاف قرآن میں پڑ جائے گا اور دین مسیحی کا خوب ظہور ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ یہ خبط ہے اس سے کچھ بھی نہ ہوگا ناحق روپئے صرف کرتے ہو چنانچہ اس کی بات سمجھ میں آ گئی اور خرید نا موقوف کیا''

☆☆☆

دیسی پادریوں کی شرانگیزیاں:

اسلامی نام رکھنے والے پادریوں نے کیسی کیسی شرانگیزیاں کیں اور دل آزار باتیں لکھیں اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگی، مولانا عبدالحق اپنے اسی مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''پادری عمادالدین نے اپنی کتاب ''ہدایۃ المسلمین'' کے باب ہفتم اور فصل اول صفحہ ۲۵۱ سے لیکر صفحہ ۲۶۱ تک آنحضرت کا جو حال لکھا اس کے الفاظ ہیں، عرب میں ایک شہر مکہ ہے جس میں ایک مندر یعنی بت خانہ تھا جس کا نام کعبہ ہے، وہاں ہر سال میلہ لگا کرتا تھا محمد صاحب کے باپ دادا وہاں کے پجاری تھے جب محمد صاحب پیدا ہوئے اور جوان ہو گئے، جب روزگار اور کمائی کی فکر میں کئی جگہ سفر اختیار کیا، آخر کار خدیجہ کے نوکر ہو گئے، اور شام میں گماشتہ کے طور پر تجارت کے لئے گئے چونکہ محمد صاحب نے کئی جگہ عیسائیوں کی گفتگو سنی تھی اور بت پرستی کے عیوب ان پر ظاہر ہوئے تھے کیونکہ ذرا غور سے بت پرستی کے عیوب ظاہر ہو سکتے ہیں بس محمد صاحب نے کار تجارت اختیار کیا اور یہودیوں اور رومن کیتھولک عیسائیوں سے اور پارسیوں سے اور شہریوں اور برریوں سے اور بحریوں سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ معاملہ کیا اس لئے طبیعت کی وہ تاریکی جو بت پرستی کا سبب ہے دور ہوگئی اس لئے محمد صاحب دین حق کے متلاشی ہوئے، چنانچہ سورہ والضحیٰ میں لکھا ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى اے محمد تو گمراہ تھا پس تجھے ہدایت دی''

پادریوں کی انہیں بدزبانیوں سے کبھی کبھی علماء اسلام کی زبان سے بھی تیز وتند باتیں پادریوں کی بارے میں نکل جاتی تھیں لیکن پھر بھی حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے تھے مولانا عبدالحق پادریوں کی کچھ بکواس کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

آپ کی قوم کی حکومت بھی ترقی پر ہے اور اولوالعزم بھی ہے جس کی وجہ سے

کروڑ ہا روپیہ بطور چندہ کے جمع ہو کر پادری لوگوں کو مشنوں مین تقسیم ہوتا ہے جس پر پادری صاحب گھوڑوں اور بگھیوں پر چڑھے پھرتے ہیں، اور جس کا روح القدس سن کر عماد الدین کو ایسی ایسی ناپاک اور گندی باتیں انبیاء علیہم السلام کی نسبت کہلاتا ہے، اس پر بھی کوئی سچا عیسائی نہیں دکھائی دیتا اور جھوٹے نئے عیسائی بھی باوجود اس کوشش کے دس بیس چمار یا حلال خور یا بعض مسلمان وہنود ہیں، جو دنیا کی تنگی سے عاجز آ کر منافقانہ عیسائیوں میں جا ملتے ہیں، عماد الدین کو دو مہینے تنخواہ نہ ملے تو دیکھئے پھر کیا کرتے ہیں؟:

پادری عماد الدین ضمیر فروشی کے ساتھ ساتھ بدزبان و بدلگام بھی تھا منہ میں جو آتا تھا بک جاتا تھا، اپنی کتاب ''ہدایۃ المسلمین'' میں ایک جگہ لکھتا ہے جیسا کہ مولانا عبدالحق ہم کو بتاتے ہیں، اس کے الفاظ ہیں:

''محمد صاحب نے خاص وعام سب لوگوں کو یہ لالچ دیا کہ اگر میرے ساتھ جاؤ گے، عورتیں مفت لوٹ میں ہاتھ آئیں گی تم ان سے صحبت کرنا، خدا کا بھی اس میں گناہ نہیں''

اس طرح کی دل آزار تحریریں دیکھ کر علماء اسلام کا خون کھولنے لگتا تھا لیکن ان مرتد ہونے والے دیسی پادریوں کا دن رات یہی مشغلہ تھا وہ اسی کی تنخواہ پاتے تھے ان کی پشت پر عیسائی مشنریوں کا ہاتھ تھا اس لئے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں اور ہر مہینہ دو مہینہ پر کوئی رسالہ اس طرح کی تحریروں سے لبریز چھاپ کر مسلمانوں میں مفت تقسیم کرتے رہتے تھے جنہیں پڑھ کر بدن میں آگ لگ جاتی تھی، اور اب اس کا ردعمل مسلمانوں کی طرف سے بھی ہونے لگا تھا۔

یہی تمام رسالے اور کتابیں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہیں، اگرچہ سال دو سال انگریزوں کی دارو گیر کا سلسلہ جاری رکھنے کی وجہ سے سہما ہوا تھا لیکن چند ہی سالوں بعد حالات بدل گئے، فضا میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہوا اور مسلمانوں کی کچلی اور روندی ہوئی غیرت وحمیت میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے تو مسلمانوں نے مصلحت اور

احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا، احساسِ کمتری سے نجات حاصل کر لی اس لئے اب ہر مسلمان ہر ہر قدم پر ان پادریوں کا پیچھا کرتے تھے اگر مجمع عام میں زہر چکانی کرتے تو وہیں منہ در منہ ان کا جواب دیتے اور تریاق مہیا کر دیتے اگر وہ ایک رسالہ لکھتے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کے جواب میں متعدد رسالے شائع کئے جانے لگے۔

دیسی عیسائی اور پادری:

ہندوستان کے ہر قابل ذکر شہر میں قائم ہونے والے ان مشنوں کا آزادی سے قبل تک بڑا وقار تھا، ان مشنوں کے اسکول میں پسماندہ طبقات کے بچوں کو ان کے ماں باپ سے حاصل کر کے اپنی سرپرستی میں لے لیتے، ان کو مفت تعلیم دیتے، ان کو خوراک پوشاک کا انتظام کرتے اور اسکول کے ہوسٹل میں رکھتے ان لڑکوں کی تعداد ہر مشن اسکول میں سیکڑوں سے متجاوز ہوتی تھی، یہ سب کے سب لڑکے بعد میں عیسائی ہو جاتے، ان کے ماں باپ کو مشن کی طرف سے مالی امداد دی جاتی تھی، اس لئے ان بچوں کے عیسائی ہو جانے پر کوئی شکایت بھی نہیں ہوتی تھی، بڑے درجہ کے پادریوں کی کوشش سے کچھ اچھے گھرانوں کے لوگ بھی عیسائی ہو چکے تھے، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اگر یہ عیسائی ہونے والا مسلمان اسلامی علوم سے واقف ہے تو عیسائی ہونے کے بعد اس کو پادری کا عہدہ دے دیا جاتا، اس کا وقار بڑھا دیا جاتا اس کی بیش قرار تنخواہ مقرر کر دی جاتی اور آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگتا تھا ایسے عیسائی ہونے والوں کو علماء اسلام سے مناظرہ اور مباحثہ کی ذمہ داری سپرد کی جاتی اور اسلام کے خلاف ان سے کتابیں اور رسالے لکھوائے جاتے اور ان کو کئی زبانوں میں شائع کیا جاتا، پادری صفدر علی نے ایم پی کے شہر جبل پور میں ۱۸۶۵ء میں عیسائیت قبول کی اور اس کو پادری بنا دیا گیا، امرتسر کا عماالدین ۱۸۶۶ء میں عیسائی ہوا، ایک کو کلکتہ میں اور دوسرے کو لاہور میں پادری کے عہدے پر فائز کر دیا گیا، کنٹربری کے لاٹ پادری نے ڈاکٹر آف ڈیوی نٹی (علامہ الٰہیات) کی ان کو ڈگری دے کر ان کا

اعزاز اور بھی بڑھا دیا تھا، ان لوگوں کی سرگرمیاں انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہیں، صفدر علی نے ''نیاز مانہ'' لکھ کر مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کی مہم شروع کی، پادری عماد الدین نے مشن کی طرف سے شائع کی جانے والی کتابوں پر حاشیہ لکھ کر اور اسلام پر گندے اور ناپاک الفاظ تحریر کر کے ہندوستان کے عیسائیوں میں بڑا نام پیدا کیا۔

۱۸۵۷ء کے حادثہ کے بعد ساری قیامتوں سے گذرنے کے باوجود مسلمانوں کا دینی جذبہ سرد نہیں ہوا تھا، بلکہ اس میں علماء اسلام کی جدوجہد نے اضافہ ہی کیا تھا، ہر قابل ذکر شہر میں علماء اسلام ان پادریوں کا تعاقب کرتے ان سے مناظرے کرتے، ان کے جلسوں اور دعاؤں میں جا کر برملا ان پر اعتراض کرتے اور بحثوں میں پادریوں کو الجھاتے، حتی کہ مدارسِ اسلامیہ کے ذہین طلبہ بڑی دلچسپی سے ان مباحثوں میں حصہ لیتے، جمعرات یا جمعہ کو ان کے چرچوں میں جاتے اور جب پادری تقریریں کرتے تو یہ اعتراضات کرتے اور کبھی کبھی یہ بحث طویل ہوجاتی تو ان طلبہ کے اساتذہ بھی ان میں شریک ہوجاتے، دیسی پادری یورپین پادریوں کے ساتھ اس طرح رہتے جیسے مردہ خور گدھوں اور چیلوں کے ساتھ کوّے رہتے ہیں کہ ان کے منہ سے گوشت کی بوٹی گر جاتی تو ان کوؤں کے کام آتی، پادری صفدر علی پادری عماد الدین اور پادری محی الدین پشاوری اور دوسرے کئی مسلم نام رکھنے والے پادریوں کا یہی طریقہ کار تھا۔

نیا جال اور پرانے شکاری:

غدر ۱۸۵۷ء سے انگلینڈ نے ایک سبق سیکھا کہ اگر عیسائیت کی تبلیغ میں ذرا بھی بے احتیاطی یا سختی یا حکومت کا تعاون ہندوستانیوں کو نظر آ گیا تو دوسری بار اس سے بھی بڑی بغاوت رونما ہوسکتی ہے چونکہ انگریزوں کی تعداد ہندوستان میں بہت زیادہ نہیں تھی اس لئے انگریزی حکومت کی فوج ہندو سکھ اور مسلمانوں پر مشتمل تھی اور غدر ۱۸۵۷ء کا باعث بھی مذہبی جذبات ہی تھے، سور اور گائے کی چربی لگے کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کو فوجیوں نے یہی سمجھا کہ ہمارے مذہب کو تباہ اور ہمارے

دھرم کو حکومت بھرشٹ کرنا چاہتی ہے، اتنی بات پر پوری فوج باغی ہوگئی۔

اب تبلیغ عیسائیت کا سلسلہ ضرور جاری تھا لیکن انداز بدلا بدلا سا تھا اب پہلے جیسی سختی نہیں رہی، بحث ومباحثہ اور سوال وجواب کرنا ہر شخص کو کھلی آزادی تھی، پورے ملک میں مشن اسکول پھیلے ہوئے تھے ان اسکولوں میں بالعموم یورپین پادریوں کو رکھا جاتا تھا وہ اپنے اسکول کے طلبہ کے دل ودماغ میں عیسائیت کی تخم ریزی کرتے تھے، اور کبھی کبھی کسی گاؤں میں کسی میلے میں یہ پادری تبلیغ کے لئے بھی جاتے تھے اور لوگوں کے سامنے عیسائی مذہب کے فضائل اس کی برکات اور دنیا میں عیسائیوں کے عروج کی کہانیاں زور شور سے بیان کرتے تھے، کبھی کبھی کچھ لوگ ان کی باتوں سے اثر بھی لیتے تھے اور عیسائیوں سے قریب ہوجاتے تھے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کچھ ممتاز اور سر برآوردہ افراد کو یورپین پادری اپنی مجلسوں میں بہت اعزاز دیتے تھے ان کے ساتھ برابر کے دوستوں جیسا برتاؤ کرتے تھے ان لوگوں کی سفارشوں پر حکومت میں ملازمتیں دلوادیتے تھے اور سرکاری تقریبات میں ان کو مدعو کر کے ان کا اعزاز کیا جاتا تھا، اس طرح ان کے دلوں میں عیسائیت کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوجاتا تھا۔

مسلمان بھی چوکنا تھے:

اب پادریوں کا پہلا جیسا رعب داب نہیں تھا اور نہ ان کے دائیں بائیں پولیس اور تھانیدار چلتے تھے اس لئے جہاں بھی چھوٹے بڑے عالم تھے ان کا ناطقہ بند کرتے رہتے تھے اس کی وجہ سے پادریوں کی جدوجہد کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، دولت کا لالچ بھی اثر انداز نہیں تھا، غریب سے غریب مسلمان بھی کسی لالچ میں آکر عیسائیت نہیں قبول کرتا تھا، البتہ کچھ ضمیر فروش اور دولت کے حریص افراد عیسائیوں کو ضرور ہاتھ لگ گئے تھے اور انہوں نے چاندی کے چند سکوں کے عوض اپنا ایمان پادریوں کے ہاتھوں بیچ دیا تھا ان کی تنخواہیں مقرر تھیں اور عیش وآرام کی زندگی بسر

کرنے لگے تھے، یہی ان کی معراج کمال تھی ایسے ہی لوگوں میں پادری عمادالدین پادری صفدر علی پادری محی الدین جیسے لوگ شامل تھے۔

جس طرح خطرناک علاقوں میں چلنے والا مسافر اپنے پالتو کتوں کو اپنی حفاظت کیلئے ساتھ رکھ لیتا ہے اسی طرح یورپین پادریوں کے پالتو کتوں کی طرح زور زور سے بھونکنے لگتے تھے اور اپنے آقاؤں کی حفاظت کا فرض انجام دیتے تھے، شاہجہاں پور (اتر پردیش) کے میلہ خدا شناسی میں بھی ایسے کتوں کے بھونکنے کی آواز لوگوں نے سنی تھی۔

ہندو طبقہ میں عیسائیت:

ہندو طبقہ پر عیسائیت کے اثرات مسلمانوں سے زیادہ تھے ان کا خوشحال طبقہ زیادہ متاثر تھا، ماسٹر رام چندر اور شاہجہاں پور کے رئیس اور جاگیر دار منشی پیارے لال، اور منشی مکتا پرشاد بہت سے ناموں میں سے چند نام ہیں، آریہ سماج جو ہندوؤں ہی کی ایک شاخ ہے اس کا جنم ہی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ہے، اور پادریوں کے اثرات کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ فرقہ مورتیوں کی پوجا کا منکر ہے، یہ فرقہ یورپین پادریوں سے قریب تر تھا کیونکہ میلہ خدا شناسی چاند پور ضلع شاہجہاں پور میں آریہ سماجیوں کو پادریوں کے شانہ بہ شانہ دیکھتے ہیں اور مباحثہ میں وہ علماء اسلام کے مقابلہ میں پادریوں کی ہم نوائی کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔

منشی پیارے لال چاند پور ضلع شاہجہانپور کے جاگیر داروں میں سے تھے، شاہجہانپور مشن اسکول کے ماسٹر پادری نولس نے ان کو اپنے حلقہ اثر میں لے رکھا تھا اور اپنی تبلیغی جد وجہد میں ان کو استعمال کرتے رہے۔

پادری نولس نے انکو مشورہ دیا کہ آپ اپنی مملوکہ زمین اور باغات واقع موضع سرباننگ پور ملحق سوانہ چاند پور ضلع شاہجہاں پور میں میلہ خدا شناسی کے نام سے ہندو اور مسلمانوں کا اجتماع کرواور سب کو دعوت دو اور کوشش کرو کہ عوام کی بھیڑ اس میلہ میں شریک ہو، مقصد یہ تھا کہ مشہور پادریوں کو اس میلہ میں بلا کر عوام اور بالخصوص

مسلمانوں کو متاثر کیا جائے اگر پادریوں نے علماء اسلام کی زبان بند کردی تو پورے ہندوستان میں اسلام کی ہوا اکھڑ جائے گی، اور عیسائیت کا بول بالا ہو جائے گا اور در پردہ یہ سازش تھی کہ آریہ سماجی ہندوؤں کے اہل علم کو بھی بڑی تعداد میں مدعو کیا جائے بالخصوص آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی کو شریک مباحثہ کیا جائے، ایک طرف سے پادریوں کا اسلام پر حملہ ہو دوسری طرف آریہ سماجی اسلام کو نشانہ بنائیں، اس دوطرفہ حملہ کی مسلمان تاب نہیں لائیں گے، اس طرح ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔

میلہ خدا شناسی شاہجہاں پور:

چاند پور ضلع شاہ جہاں پور کے رئیس منشی پیارے لال نے پادری نولس کے حکم سے پہلی بار ۱۸۷۶ء میں اس بین المذاہب مباحثہ کا آغاز کیا اور اس کا نام میلہ خدا شناسی رکھا، اس اجتماع کے لئے باقاعدہ شاہجہاں پور کے انگریز کلکٹر مسٹر رابرٹ جارج گری سے اجازت لے کر پوسٹر چھپوائے گئے اور تقسیم کئے گئے، اخبارات میں اعلان کیا، اس مباحثہ میں حصہ لینے کے لئے یورپین پادریوں کے ساتھ دیسی پادریوں کو بھی مدعو کیا گیا، آریہ سماج کے نمائندوں اور سناتن دھرم کے پنڈتوں اور علماء اسلام میں سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی متکلمانہ تقریر نے ہوا کا رخ بدل دیا، کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس تقریر کے بعد اسلام پر اعتراضات کرے اسی کے ساتھ دو باطل مذاہب کے ناقابل عمل ہونے پر جو دلائل دیئے گئے اس کا جواب بھی دوسرے مذاہب کے نمائندوں سے نہ ہو سکا، مباحثہ کی کئی نشستیں ہوئیں اور بہت سے مسائل زیر بحث آئے اور ہر ایک میں علماء اسلام نے مرعوب کن اثرات ڈالے، اور عام طور پر عوام میں مسلمانوں کی فتح مندی کا شہرہ ہوا، اس مباحثہ کے دور رس اثرات ہوئے اس لئے دوسرے سال ۱۸۷۷ء میں پھر یہ میلہ منعقد کیا گیا اب کی بار اس کی شہرت اور زیادہ ہوئی اس لئے دور دراز سے بڑی تعداد میں لوگ اس میلہ میں آئے، اس لئے یہ مباحثہ ہندوستان گیر اثرات کا حامل ہو گیا اس لئے میں اس میلہ خدا شناسی کی تھوڑی سی تفصیل

آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہوسکے کہ علماء حق نے کس طرح کے ماحول میں اسلام کی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے اور کس طرح اپنی خداداد ذہانت سے کام لے کر اسلام کے نام کو سربلند کیا اور غلبہ اسلام کا دلکش نظارہ دنیا نے دیکھا کہ ایک طرف مسلمانوں کی فتح ونصرت اور اسلام کا پھریرا فضا میں پوری شان سے لہراتا رہا اور عیسائی پادری اپنی روسیاہی چھپانے کیلئے طرح طرح کی قلابازیاں کھاتے رہے، ان کے حوصلہ پست ہوگئے اور سارے وسائل کے باوجود ان کے حوصلے پست ہوگئے اور ان کے جذبات اور ولولوں پر اوس پڑ گئی۔

مباحثہ کا منظر:

ایک پرفضا باغ میں خیمے اور راوٹیاں کھڑی کردی گئی ہیں جن میں ہر مذہب کے اہل علم اور نمائندے اپنے اپنے مخصوص خیموں میں قیام پذیر ہیں ان خیموں سے کچھ دوری پر ایک بڑا شامیانہ تنا ہوا ہے، جس میں فرش بچھا ہوا ہے، لیکن جب مباحثہ کا وقت قریب آیا تو عوام کی اتنی بڑی بھیڑ اکٹھی ہوگئی کہ شامیانہ ناکافی ہوگیا اس لئے کھلے میدان میں یہ بزم مباحثہ منعقد ہوئی بیچ میں ایک بڑی میز رکھی گئی اور اس سے متصل تخت بچھا دیا گیا تاکہ اس چوکی پر کھڑے ہوکر ہر مذہب کا نمائندہ اپنی بات کہے اس چوکی کے پیچھے اور دائیں بائیں کرسیوں کی قطار رکھی گئی جن پر علماء کرام آریہ سماج پنڈت، سناتن دھرم کے وکلاء اور نمائندے اور دیسی ویورپین پادریوں کی جماعت بیٹھ گئی اس سے آگے منتظمین میلہ، اخباری رپورٹر، آنریری مجسٹریٹ اور ضلع انتظامیہ کے افراد اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ میلہ ۱۹/۲۰/مارچ ۱۸۷۷ء کو منعقد ہورہا ہے، مباحثہ کا پروگرام طریقۂ مباحثہ موضوع مباحثہ، سوال وجواب کے لئے وقت کی تعیین پر گھنٹوں صلاح ومشورے چلتے رہے، ہر معاملہ میں پادریوں کی رائے کو فوقیت حاصل تھی جو ان کی رائے ہوتی تھی اور جو وہ چاہتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے اسی طرح پروگرام بناتے، آریہ سماجی اور

سناتنی دونوں مذہبوں کے نمائندے ہر معاملہ میں پادریوں کے ہم نوا رہتے، علماء اسلام جورائے پیش کرتے اس کو دونوں حریف بہ لطائف الحیل ٹال دیتے، اس لئے مباحثہ کی ساری کارروائی پادریوں کی صوابدید کے مطابق آریہ سماجیوں کی حمایت سے چلتی رہی، مسلمانوں کی رائے سے بالقصد اختلاف کیا جاتا رہا اسی ماحول میں مباحثہ کی کارروائی ہوئی۔

شرکاءمباحثہ:

مباحثہ میں حصہ لینے والوں کی جو باضابطہ فہرست مجلس انتظامیہ کی طرف سے بنائی گئی اس میں مسلمانوں کے نمائندے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالمجید صاحب بنائے گئے دوسرے علماء میں جواس مباحثہ کے وقت اسٹیج پر تھے، مولانا ابوالمنصور صاحب دہلوی جو حضرت نانوتوی ہی کے ساتھ آئے تھے، مراد آباد سے مولانا محمد علی صاحب تھے جو آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں سے مناظرہ میں یکتا تھے ان کے علاوہ مولانا محمد طاہر صاحب اور دوسرے کئی علماء کرسیوں پر ایک طرف بیٹھ گئے۔

آریہ سماجیوں میں پنڈت دیانند سرسوتی بانی مذہب آریہ سماج اور سناتن دھرم کا وکیل منشی اندرمل کا نام لکھا گیا، یورپین پادریوں میں پادری نولس جو شاہجہانپور مشن میں کام کرتے تھے اور دوسرے پادری واکر تھے، پادری اسکاٹ جو مفسر انجیل کہے جاتے تھے وہ دوسرے دن کے مباحثہ میں شریک ہوئے، دیسی پادریوں میں پادری محی الدین پشاوری شریک مباحثہ تھے۔

مباحثہ کا نظم قائم رکھنے اور پروگرام چلانے کی ذمہ داری مذکورہ بالا چھ آدمیوں کو دی گئی لیکن عملاً صرف پادریوں کی رائے پر عمل ہوتا تھا، کیونکہ ان کی حمایتی آریہ سماجی اور سناتنی تھے اس طرح وہ مل کر چار ہو جاتے تھے اور مسلمان صرف دو، اس لئے انہیں کی صوابدید کے مطابق مباحثہ کی کارروائی ہوئی۔

موضوع مباحثہ:

مباحثہ کا موضوع بھی کمیٹی نے طے نہیں کیا بلکہ منتظم میلہ منشی پیارے لال نے درون خانہ مشورے کے بعد ایک اردو تحریر پیش کی کہ مندرجہ ذیل سوالوں پر مباحثہ ہوگا اور ہر فریق ترتیب وار انہیں مسئلوں کے جواب میں تقریر کرے گا، سوالات یہ ہیں:

(۱) خدا نے دنیا کو کس چیز سے بنایا؟ کس وقت! اور کیوں؟

(۲) خدا کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

(۳) خدا عادل بھی ہے اور رحیم بھی؟ دونوں کس طرح!

(۴) وید، بائیبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

(۵) نجات کیا چیز ہے؟ اور کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟

اب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ پہلے ان سوالات کے جواب کون دے؟

کوئی فریق پہلے تقریر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا، حضرت نانوتویؒ کا عذر یہ تھا کہ ہمارا دین سب کے بعد کا ہے اس لئے ہم سب کے بعد ان سوالات کے جوابات دیں گے، اسی بحث و تمحیص میں شام کے چار بج گئے، تو پادریوں اور دوسروں نے بھی حضرت نانوتویؒ پر زور ڈالا آپ ہی اس مباحثہ کا آغاز کریں اور سب سے پہلی تقریر آپ کی ہوجائے تو سلسلہ چل پڑے۔

حضرت نانوتویؒ کا معرکۃ الآرا بیان:

حضرت نانوتویؒ نے جب دیکھا کہ ہر مذہب کا وکیل اپنی مصلحتوں کا شکار ہے اور اعتراضات سے بچنا چاہتا ہے تو آپ نے حامی بھر لی اور آپ اسٹیج پر تشریف لائے، اور ایک گھنٹہ تقریر فرمائی آپ نے اپنی اس تقریر میں وجود باری، ذات باری، صفات باری، خدا کی ذات کا سارے عالم کو محیط ہونا، وحدانیت کا ثبوت، ردّ تثلیث، خدائے واحد کا واجب الاطاعت ہونا، انبیاء ورسل کی ضرورت، ان کا عام انسانوں سے بلند و بالا ہونا اور جامع صفات کمالیہ ہونا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا،

دوسرے تمام ادیان وملل کا منسوخ ہونا، شریعت اسلامیہ کا ساری دنیا کے لئے واجب الاطاعت ہونا، شریعت محمدیہ کا سابقہ شریعتوں کا ناسخ ہونا، معجزات نبوی کی حقیقت اور دوسرے انبیاء کے معجزات کا موازنہ، حضور کے معجزات کی اہمیت وبرتری، ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا خدا کی خدائی میں شرکت کا خلاف عقل ہونا، وید کا کلام الٰہی نہ ہونا، انجیل کا محرف اور نا قابل اعتماد ہونا اور ان کے بیان کرنے والوں کا سلسلہ سند نہ ہونے کی وجہ سے انسانوی کہانی ہونا ان تمام مسائل پر عقلی ونقلی مسلمات اور روز مرہ کے تجربات ومشاہدات کی روشنی اس طرح مدلل ومبرہن کیا کہ سارے موافق ومخالف اور دوسرے مذاہب کے وکلاء اور نمائندے دم بخود اور حیرت زدہ ہوکر رہ گئے، ان کے مذہبی جذبات امنگوں اور حوصلوں کو نکلنے کی راہیں مسدود نظر آنے لگیں وہ اس فکر میں غلطاں وپیچاں تھے ان حقائق اور مسلمات کا انکار کیوں کر ممکن ہوگا جس کی روشنی میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا گیا ہے، ساری تقریر اسلامی علم کلام کا شاہکار تھی جس کی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ہوا تک نہیں لگی یورپین پادری تو صرف خوف زدہ بندروں کی طرح مضحکہ خیز صورتیں بنائے بیٹھے رہے، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرم والوں کی مرعوبیت کا تو یہ عالم تھا کہ ایک لفظ ان کی زبانوں سے نکلنا دشوار تھا، چونکہ ساری تقریر جن مقدمات پر مشتمل تھی ان کے تسلیم شدہ ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کرنا اپنی عقل کا ماتم کرنا تھا، بہت سی دقیق باتیں ان کی موٹی عقلوں میں آتی بھی نہیں تھیں لیکن زور بیانی کا وہ عالم تھا کہ سب کی گردنیں خم تھیں سوائے خاموشی کے کوئی چارۂ کار نہیں تھا، آریہ سماج کے پنڈتوں اور سناتن دھرمیوں نے تو یہاں تک کہا کہ مولانا قاسم نانوتویؒ کی زبان سے علم کی دیوی بولتی ہے، پتھر کی مورتی کو پوجنے والے اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتے تھے اور کیا کہہ سکتے تھے۔

سوال وجواب:

حضرت نانوتویؒ کا سلسلہ بیان پورے ایک گھنٹہ جاری رہا، پادری نولس نے

مولانا نانوتویؒ سے کہا کہ گھنٹہ پورا ہوگیا، مولانا نے اپنی تقریر ختم کردی اعتراض کرنے والوں کو موقعہ دیا گیا کہ جس کو سوال کرنا ہے وہ مولانا موصوف سے سوال کرے اور کسی کی تو ہمت نہیں ہوئی البتہ پادری محی الدین پشاوری اٹھے اور انہوں نے چار غیر متعلق باتیں کہیں جن کا مولانا موصوف کی تقریر میں کوئی ذکر بھی نہیں تھا، اس کے جواب کا انہوں نے مطالبہ کیا، جب کہ تقریر مندرجہ ذیل آٹھ باتوں کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کیا گیا۔

(۱) خدا تعالیٰ کا ثبوت (۲) وحدانیت (۳) ذات خداوندی کا واجب الاطاعت ہونا۔ (۴) نبوت کی ضرورت (۵) نبوت کی علامات وصفات (۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت (۷) آپ کا خاتم الانبیاء ہونا۔ (۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد انہیں کی اتباع میں نجات کا منحصر ہونا۔

کسی بھی معترض کو اگر اعتراض کرنا تھا تو انہیں بیان کردہ حقائق پر اعتراض یا اس سے متعلق سوال کرنا چاہیئے تھا چونکہ ہر بات اتنی مدلل اور مبرہن تھی کہ مخالفین کو اعتراض کا کوئی پہلو ہی نظر نہیں آتا تھا مگر بے حیائی کا برا ہو کہ پادری محی الدین نے چار غیر متعلق اعتراض پیش کردیئے، یہ سوالات اتنے غیر متعلق تھے کہ موافق ومخالف سبھی ان کے بیان پر مسکرا پڑے، ان کا پہلا اعتراض انبیاء کی معصومیت پر تھا جب کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے تھے انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کو غیر معصوم ہونے کی دلیل میں پیش کیا، دوسری مثال حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق کہی کہ نعوذ باللہ انہوں نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا، تیسری مثال میں حضرت سلیمان کی بت پرستی کا ذکر کیا، دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قرآن میں ہے کہ ہر امت میں ''نذیر'' آیا، آپ کے نبی سے پہلے عرب میں کون پیغمبر آیا، تیسرا اعتراض تھا کہ آپ نے اپنے رسول کے معجزات کو قرآن سے ثابت نہیں کیا۔ چوتھا اعتراض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت پر تھا کہ آپ لوگ جو درود پڑھتے ہیں اس میں اپنے نبی سے ابراہیم علیہ السلام کو افضل مانتے ہیں۔

یہ سوالات اگرچہ موضوع مباحثہ سے غیر متعلق تھے لیکن مولانا نانوتویؒ نے کھڑے ہوکراس کے جواب میں فرمایا کہ

''آپ نے اب تک گناہ کا معنی ہی نہیں سمجھا اور اعتراض کرنے کھڑے ہوگئے''۔

پھر آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعات کولغزش ثابت کیا جو گناہ سے علیحدہ چیز ہے، اسی طرح تینوں سوالات کے جوابات دیئے، چونکہ جواب کے لئے دس منٹ مقرر تھے اس لئے چوتھا سوال ابھی زیر بحث ہی تھا کہ وقت ہوگیا۔

قرآن میں آپ کے بائبل کی تصدیق نہیں ہے:

پادری محی الدین نے دوبارہ کھڑے ہوکر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذات پر وہی ناپاک الزامات عائد کئے اور کہا کہ مانا کہ آپ کے قرآن میں ان واقعات کا ذکر نہیں لیکن بائیبل میں یہ واقعات بالتفصیل موجود ہیں، اور قرآن میں بائیبل کی تصدیق موجود ہے، اس لئے آپ کو بائیبل میں بیان کردہ واقعات کو تسلیم کرنا ہی ہوگا۔

مولانا نانوتویؒ پھر اسٹیج پر آئے اور پادری محی الدین کے جواب میں فرمایا کہ بیشک قرآن میں انجیل کی تصدیق موجود ہے لیکن اس انجیل کی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی، اس انجیل کی نہیں جو آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں کیوں کہ اس میں تحریف اور تغیر وتبدل ہو چکا ہے۔

اسی سخت جواب پر پادری محی الدین جھلا اٹھے اور غصہ میں کہا کہ اگر آپ انجیل میں تحریف ثابت کردیں تو ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے فرمایا ''ابھی سہی''۔

پھر آپ نے مولانا ابوالمنصو ر دہلوی سے فرمایا کہ آج صبح آپ نے جو درس مجھ کو دکھایا تھا وہ اسٹیج پر آکر ان کو سنا دیجئے اور اس پر جو حاشیہ ہے اس کو بھی بتا دیجئے، مولانا نانوتویؒ کے حکم پر مولانا ابوالمنصو ر صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ:

''تحریفات تو بہت ہیں میں صرف ایک ایسی تحریف پیش کرر ہا ہوں جو پوری انجیل کو نا قابل اعتبار بنا دیتی ہے، آپ نے کہا کہ درس ۷ پانچواں باب یوحنا کے خط میں ہے اس میں یہ عبارت ہے:

''تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں، باپ اور کلام اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں''

پھر آپ نے اس کی تفصیل بیان کی اور کہا کہ جب یہ کتاب مرزا پور میں اکابر پادریوں کی زیر نگرانی بڑے ہی اہتمام سے عبرانی اور یونانی زبان سے اردو میں ترجمہ ہو کر ۱۸۷۰ء میں چھپی تو درس مذکور کے بارے میں حاشیہ پر ان پادریوں نے جو اس اشاعت کے ذمہ دار تھے یہ تحریر کیا ہے:

''یہ الفاظ کسی قدیم نسخے میں نہیں پائے جاتے''

جب مولانا موصوف نے یہ تفصیل سنائی تو تمام پادریوں نے بیک زبان اس سے انکار کیا اور کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا، مشن کی طرف سے شائع کردہ انجیل کے کسی نسخے میں یہ عبارت ہو ہی نہیں سکتی، یہ جھوٹ ہے، یہ بیان نا قابل اعتبار ہے اور اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

پادریوں کا ہنگامہ اور شور وشغب جب بہت بڑھ گیا تو مولانا نانوتویؒ نے مولانا ابوالمنصور صاحب سے فرمایا کہ آپ خیمہ سے کتاب منگا لیجئے، فوراً ایک خادم دوڑا ہوا گیا اور خیمہ سے وہ کتاب اٹھا لایا، مولانا ابوالمنصور نے کتاب لے کر وہ مقام نکالا اور پادریوں کے سامنے رکھ دیا، کتاب کے صفحہ پر نظر پڑتے ہی پادریوں کا چہرہ فق ہو گیا اور سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور سب پر ایک سکتہ کی کفیت چھا گئی، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ذلت وندامت کے شدید احساس کے ساتھ ہر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔

پادریوں کی اس شرمناک شکست پر پورا مجمع اچھل پڑا اور ہر طرف زور وشور سے اظہار خیال کیا جانے لگا، ہر طرف سے آوازیں کسی جانے لگیں اور جواب کا مطالبہ کیا

جانے لگا، پادریوں کے لئے نہ اقرار کا موقعہ و ہمت نہ انکار کی گنجائش، مارے غصہ کے یورپین پادریوں نے پادری محی الدین کی طرف دیکھا کہ انہوں نے نہ اس طرح کا چیلنج کیا ہوتا اور نہ اس ذلت کا سامنا کرنا پڑتا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور رسوائے ذلت و رسوائی کے اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہ گیا تھا۔

آخری اجلاس:

۲۰/ مارچ کی سہ پہر کو مباحثہ کا تیسرا اور آخری اجلاس ہوا، اس میں تقریر کرتے ہوئے ایک یورپین پادری نے کہا کہ حضرت عیسیٰ مجمع الجہتین ہیں، یعنی انسان کامل بھی ہیں اور معبود کامل بھی، حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی صورت ایسی ہے جیسے لوہے کو آگ میں ڈالے رکھتے ہیں تو وہ لوہا بھی آگ بن جاتا ہے۔

مولانا نانوتویؒ نے پادری کی تقریر میں دخل اندازی کرتے ہوئے فرمایا کہ عیسائیو! دیکھو پادری صاحب تثلیث سے انکار کررہے ہیں، لیکن پادریوں کے پاس ایسی فہم رسا کہاں تھی کہ حضرت نانوتویؒ کے اس لطیف ریمارک کو سمجھ سکیں اس لئے جب آپ اپنی باری پر تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو آپ نے پادریوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پادری صاحب خود تثلیث کے عقیدے سے انکار کر گئے سچ ہے، بیوقوف وکیل تو صحیح کیس بھی ہار جاتا ہے یہاں تو باطل عقیدہ سمجھ کر پیش کیا جارہا ہے لیکن اس کو بھی ثابت کرنے کے بجائے خود ہی اپنے عقیدے کی تردید کر گئے، آپ نے فرمایا کہ پادری صاحب کی مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ایک ہے متعدد نہیں، اور حضرت عیسیٰ بندہ ہیں خدا نہیں آپ نے اپنے دعویٰ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> ”لوہا دیکھنے میں ظاہر پرستوں کو ہمرنگ آتش نظر آتا ہے پر حقیقت میں اس وقت بھی وہ لوہا ہی رہتا ہے، آگ نہیں ہوجاتا ہے، فقط پرتو آتش سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آگ سے علیحدہ کر لیجئے تو پھر وہ لوہا اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے، اگر واقعی لوہا آگ ہوجایا کرتا اور انگاروں کی طرح ساتھ

رہتا یا علاحدہ ہوجاتا تو دونوں حالتوں میں یکساں رہتا''۔

حضرت نانوتویؒ کا جواب ایسا برمحل اور بھرپور تھا کہ پادریوں کے ہوش اڑ گئے اور اتنی موٹی بات کہ ناخواندہ عوام بھی خوب سمجھ گئے، پادریوں کے پاس اس وقت بات کا کوئی جواب نہیں تھا، اس لئے ان پر خفت وذلت کی جھنجلاہٹ سوار ہوگئی اور خفیف الحرکاتی پر اتر آئے، حضرت نانوتویؒ کی بات ختم ہونے کے بعد کسی پادری میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسٹیج پر آکر مولانا نانوتویؒ کا جواب دیتا، فرار کی بھی ان کے پاس کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ ابھی مباحثہ کا معینہ وقت ختم نہیں ہوا تھا، علماء اسلام اپنی اپنی کرسیوں پر جمے بیٹھے تھے اور انتظار کررہے تھے کہ دیکھئے کوئی بے غیرت پادری سامنے آتا ہے یا نہیں، لیکن اسٹیج پر کسی کو آنے کی جرأت نہیں ہوئی البتہ اس میلہ خدا شناسی کے در پردہ اصلی داعی پادری نولس جہاں بیٹھے تھے وہیں پر کھڑے ہوکر چلا چلا کر اپنے مذہب کے فضائل بیان کرنے لگے اور اپنی جھینپ چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہے، دوسری طرف شور اور ہنگامہ میں اضافہ کرنے کے لئے پنڈت دیانند سرسوتی کھڑے ہوئے اور اپنا بھاشن شروع کردیا کہ مسلمانوں کا خدا کیسا ہے کہ اس نے اپنی حکومت میں شیطان کو چھوڑ رکھا ہے، انصاف پرور حکومتیں تو چور قزاق اور ڈاکوؤں کو سزا دیتی ہیں، گرفتار کرتی ہیں، اور انسانوں کو ان کی زیادتیوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں، یہاں شیطان کو پوری آزادی ہے اسی طرح انہوں نے جنت ودوزخ کا مذاق اڑایا اور چیلنج کرنے لگے کہ کسی میں ہمت ہے تو ثابت کردے کہ جنت کہاں ہے!

غرضیکہ پادریوں اور آریہ سماجیوں کے منہ میں جو کچھ آیا بکتے رہے کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا، ایک شور برپا تھا، بیک وقت کئی آوازوں کے شور میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے، اسی طوفان شوروشر میں مباحثہ کا آخری وقت آگیا اور صرف چند منٹ باقی رہ گئے۔

پادری نولس اور پنڈت دیانند سرسوتی آخر تھک کر خاموش ہوئے، تو حضرت

نانوتویؒ فوراً تخت پر آ گئے اور اعلان کیا کہ ہر ایک کی ہفوات کا جواب سن لیجئے، آپ لوگ سکون واطمینان سے بیٹھ جائیں مگر پادری سب کے سب آنکھوں میں اشارہ کر کے ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ وقت ختم ہوگیا ہم اب مزید کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔

بہت بے آبرو ہوکر......

یہ مباحثہ کا آخری اجلاس تھا اس اجلاس کے لئے موضوع مباحثہ طے کرنے میں کافی تاخیر ہوگئی تھی اس لئے شروع ہی میں پادریوں نے پنڈت جی سے مل کر طے کردیا تھا کہ یہ آخری اجلاس اپنے مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ زائد جاری رہے گا اور چار بجے کے بجائے ساڑھے چار بجے جلسہ ختم ہوگا، حضرت نانوتویؒ جب جوابی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو چار بجنے میں بھی چند منٹ باقی تھے اور یہ طے تھا کہ مزید آدھا گھنٹہ جلسہ چلے گا لیکن سارے پادری اٹھ کھڑے ہوئے کہ جلسہ کا وقت ختم ہوگیا، مسلمانوں نے بہت روکا اور سمجھایا، جب کسی طرح رکنے پر وہ تیار نہیں ہوئے تو حضرت نانوتوی نے کہا کہ ابھی چار بجنے میں چند منٹ باقی ہیں اتنی ہی دیر ٹھہر جائیں تاکہ ہماری باتیں سن لیں مگر پھر بھی وہ تیار نہیں ہوئے اور جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے، ایک طرف روکنے والوں کا اصرار کا سلسلہ جاری ہے دوسری طرف وہ جلد سے جلد جلسہ گاہ سے نکل جانے کی گھبراہٹ میں ہیں، عوام کی بھیڑ بھی پادریوں کی بدحواسی کے منظر کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کس طرح جلد از جلد اس مجمع سے نکل بھاگنے میں ہی اپنی نجات سمجھتے ہیں اس لئے مسلمانوں کے روکنے کے باوجود دامن جھٹک کر عجلت میں وہ جلسہ گاہ سے نکل گئے، ان کے فرار کے بعد دیکھا گیا کہ بدحواسی میں پادری صاحبان اپنی کئی کتابیں اسٹیج پر چھوڑ گئے ہیں۔

کیسی رسوائی ہوئی؟

مولانا نانوتویؒ عصر کی نماز سے فراغت کے بعد اسٹیج پر آئے افراتفری کا عالم ختم

ہوگیا تھا، آپ کے آتے ہی عوام کی بھیڑ اکٹھی ہوگئی تو آپ نے لوگوں سے صورت حال بیان فرمائی کہ ہم نے بہت چاہا کہ پادری صاحبان ہماری دو چار باتیں سن لیں لیکن مسلمانوں کے سوال وجواب سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت ان کو نظر نہیں آئی تو انھوں نے یہ حرکت کی اب مزید ذلت برداشت کرنے کی ہمت ان میں نہیں رہ گئی، ہمارے سوالوں میں سے ایک کا بھی جواب ان سے نہ ہوسکا اور ہم نے ان کے ایک ایک سوال کا مسکت اور دنداں شکن جواب دیا، اگر غیرت ہوگی تو وہ کبھی اہل اسلام کے منہ نہیں لگیں گے، اب بروئے انصاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہوگئی، اور کسی شخص کو بروئے انصاف کوئی عذر باقی نہیں رہا۔

حضرت نانوتویؒ کا عوام سے خطاب جاری تھا کہ اسی دوران پادری جان ٹامس گھبرائے ہوئے آئے اور کہا کہ ہماری دو کتابیں یہاں رہ گئی ہیں، ہندو اور مسلمانوں کا جو مجمع تھا اس میں ہر مزاج کے لوگ تھے ان میں سے بعض لوگوں نے پادری صاحب کو چھیڑنا شروع کردیا اور کہا پادری صاحب آپ اتنا گھبرا کیوں گئے کہ کتابیں بھی چھوڑ گئے؟ وہ کیا جواب دیتے گردن جھکائے ہوئے کتابیں لیکر چپکے سے نکل گئے اور زبان حال سے کہتے جارہے تھے

اس بھرے مجمعؔ میں کیسی ہائے رسوائی ہوئی

مباحثہ شاہجہاں پور کے اثرات:

یہ مباحثہ اگرچہ ضلع شاہجہاں پور کے ایک دورافتادہ گاؤں میں ہوا لیکن مغربی یوپی اور دہلی تک کے لوگ اس مباحثہ میں بڑی تعداد میں شریک تھے، پوسٹروں کے علاوہ اخباروں میں بھی اس مباحثہ کی خبریں شائع ہوتی رہیں اس لئے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی، اس مباحثہ میں اسلام کا غلبہ اتنا واضح اور نمایاں تھا کہ وہ کسی تاویل کی چادر سے چھپایا نہیں جاسکتا تھا، ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ مسلمان بازی جیت گئے، یہ پادریوں کی ایسی شکست تھی کہ وہ پورے ملک میں ذلیل ورسوا ہوگئے

اس لئے پادریوں کے حوصلوں اور امنگوں پر اوس پڑ گئی، پادری محی الدین پشاوری جو اس مباحثہ میں پیش پیش تھے اور یورپین پادریوں سے کہیں زیادہ سخت لب ولہجہ میں اسلام پر اعتراضات کرتے تھے لیکن یہی مباحثہ ان کی زندگی کا آخری مباحثہ ثابت ہوا، کیوں کہ اس کے کچھ ہی مہینوں بعد انہوں نے عیسائیت سے توبہ کر لی اور پھر خالص مسلمان ہو کر پوری زندگی گذاری اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہوا۔

مباحثہ شاہجہاں پور کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماءاسلام کی جرأت بڑھی جو اب تک حکومت کی پشت پناہی کی وجہ سے پادریوں سے مقابلہ کی ہمت نہیں کرتے تھے اب ملک کے کونے کونے میں پادریوں کو گھیرنے لگے، جیسا کہ کئی مشنوں کے پادریوں کی رپورٹوں میں اس کا ذکر ملتا ہے کہ مسلمان علماء عیسائیت کی راہ میں سنگ گراں بن رہے ہیں اسی طرح کی ایک رپورٹ ملتان کے پادری کی ہے وہ لکھتا ہے:

> ''ملتان کے ملا اور سید اور مخدوم سب اس بات کے لئے کوشش کررہے تھے کہ خدا کی روشنی کو داخل نہ ہونے دیں، یہ دو مشہور شخصیتوں یعنی مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے جنہوں نے اسلام کا طرفدار ہو کر ڈاکٹر فنڈر سے مباحثہ کیا تھا، دوست تھے''۔

یہ ضلع ملتان کے انچارج پادری فرنچ کی رپورٹ کے الفاظ ہیں، یہ علماء بلا کسی معاوضہ اور پشت پناہی کے محض اپنے جوش ایمانی کے زیر اثر ردِّ نصاریٰ میں اپنا وقت صرف کررہے تھے، ہر صوبہ اور ہر ضلع میں مناظرین اسلام کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد ردنصاریٰ کا فرض ادا کررہے تھے اگر کوئی خاص اور اہم مقابلہ اور مناظرہ ہوتا تھا تو مرکز سے علماء کرام ان کا مقابلہ کرنے کے لئے جاتے تھے جس سے پادریوں میں کھلبلی مچ جاتی اور عوام پر اس کا بہتر نتیجہ مرتب ہوتا تھا، یہ بات عیسائی مشنریوں کی رپورٹوں میں موجود ہے اگر چہ وہ مخالفانہ ومعاندانہ انداز میں ہے لیکن واقعات وتجربات کی تفصیل سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ علماء اسلام ہر ضلع میں ان کے مدمقابل تھے اور پادریوں کو چین سے کام کرنے کیلئے آزاد نہیں چھوڑتے تھے۔

علماء اسلام سے پادریوں کی مرعوبیت:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ چاند پور ضلع شاہجہانپور کے میلہ خدا شناسی میں دو سال شریک ہوئے، قدرت کو مولانا موصوف کے ہاتھوں عیسائیت کو ہندوستان میں ناکام ونامراد بنانا تھا، اس لئے دونوں سال حضرت نانوتویؒ کا نام ہندوستان کے عیسائی مشنریوں میں انتہائی مرعوبیت کے ساتھ لیا جاتا تھا، جیسا کہ متعدد ثقہ راویوں نے پادریوں کی خفیہ مجلسوں کی باتیں نقل کیں اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ میں پادریوں کو مسلمانوں سے مناظرہ ومباحثہ کی جو ٹریننگ دیجاتی تھی اس میں دو تین مسئلوں پر پادریوں کو تیار کیا جاتا تھا ایک تو یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے عیسائیوں سے علم حاصل کیا اور اس کو ایک مذہب کی شکل دے دی، دوسری بات یہ کہ قرآن آسمانی کتاب نہیں، پیغمبر کے زمانہ میں قرآن مرتب نہیں ہوا، اگر بالفرض قرآن آسمانی کتاب ہے تب بھی ہمارا دین غالب ہے، کیوں کہ مسلمانوں کے قرآن میں انجیل کی تصدیق موجود ہے، یہ وہ مسائل ہیں کہ علماء اسلام نے ان مسائل پر ہزاروں ہزار صفحات لکھ ڈالے ہیں اور خوب خوب داد تحقیق دے چکے ہیں اور ایسی ایسی دقیق عالمانہ بحثیں اس سلسلہ میں کی ہیں کہ پادریوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، علم کلام تو مسلمانوں کا اپنے گھر کا فن تھا، مولانا نانوتوی کا متکلمانہ انداز بیان جب پادری سنتے تھے تو بہت سی باتیں تو ان کے طائر فکر کی پرواز سے بھی بلند معلوم ہوتی تھیں، پھر ان کلامی بحثوں کو روزمرہ کے مشاہدات وتجربات سے اس طرح ثابت کر دیتے تھے کہ کسی کے لئے مجال انکار نہیں رہ جاتی تھی۔

یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے مباحثہ شاہجہاں پور کے بعد یورپین مناظرہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے اور اب صرف دولت کے بل بوتے پر پسماندہ طبقہ میں عیسائیت کی نشر واشاعت میں لگ گئے، البتہ چند مرتد مسلمان جو عیسائی ہو گئے جیسے پادری عمادالدین، پادری صفدر علی وغیرہ ہندوؤں میں ماسٹر رام چندر اور پادری

ٹھاکر داس جیسے لوگ چھوٹے چھوٹے رسالے اسلام کے خلاف لکھتے رہے لیکن کہیں بھی مسلمانوں سے اب مناظرہ کرنے کی غلطی نہیں دہرائی۔

ان دیسی پادریوں کے رسالوں اور کتابوں کے جواب میں علماء اسلام کی طرف سے برابر کتابیں لکھی جاتی رہیں، بعض کتابوں کے جواب عیسائیوں کی طرف سے دیئے جانے پر انعام کا بھی اعلان کیا جاتا رہا لیکن ان کا مبلغ علم چند رٹے ہوئے جملوں سے آگے کام نہیں کرتا تھا اس لئے علماء اسلام کی کتابوں کے جواب میں پادریوں کی طرف سے اکثر خاموشی ہی رہتی تھی۔

مشنریوں کے حوصلے پست ہو گئے:

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پچاس پچپن سال تک کبھی حکومت کی پشت پناہی کے بل بوتے پر کبھی اپنے فنڈ اور سرمایہ کی بدولت تبلیغ عیسائیت کا یہ کاروبار چلتا رہا، ابتداءً تو انگریزوں کے حوصلے بلند تھے اور ہزاروں میل دور لندن میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کی جاتی تھی کہ پورے ہندوستان کو چند سالوں میں ہم دام عیسویت میں شکار کرلیں گے اور بڑے ہی جوش وخروش سے کام کا آغاز کیا اور اس طرح کیا کہ جب پادری تقریریں کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آواز میں رعد وبرق کی کڑک تھی دو چار حرف اسلامی کتابوں کے یورپ سے پڑھ کر آئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ جاہل ہندوستان میں کون ہمارے مبلغ علم کو پہنچ سکتا ہے، ایک مہمل سی کتاب میزان الحق لکھ کر یورپ کو یقین دلا دیا کہ یہ کتاب الہام ربانی سے لکھی گئی ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس کا جواب نہیں دے سکتے اور جب وہ اس الہامی کتاب کو لے کر ہندوستان آئے تو ایک معمولی سی سوئی اس گیند میں چبھو دی گئی اور ساری ہوا نکل گئی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان صرف دو نفر نے یورپ سے درآمد پادریوں کی پوری فوج کو ۲۴ر گھنٹے میں وہ ذلت آمیز شکست دی کہ دس سال کی منصوبہ بندی مسلمانوں نے دو دنوں میں ملیامیٹ کردی اونٹ نے جب تک پہاڑ نہیں دیکھا تھا تب تک بلبلاتا رہا۔

لیکن پادریوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں کچھ تعلیم یافتہ ایمان فروش مسلمانوں نے اور دولت کے چند حریص اور جاہ پسند پڑھے لکھے ہندوؤں نے عیسائیت قبول کرلی اور وہ مزید دس بارہ سال عیسائیت کی شکستہ کشتی کو کھیتے رہے لیکن ان کا بھی علم اور ان کے طائرفکر کی پرواز محدود تھی جب اکابر علماء نے ردعیسائیت کے میدان میں بڑی تعداد میں قدم رکھا تو ان کے دل دہل گئے، مباحثہ شاہجہاں پور کے بعد پادری محی الدین پشاوری مسلمان ہوگئے چند بد باطن اور سیاہ ضمیر مسلمان نام کے پادریوں نے اس گرتی ہوئی عمارت کو کچھ دنوں اور تھامے رکھا لیکن جب چاروں طرف سے علماء اسلام نے مجاہدانہ یلغار کی تو ہندوستان میں عیسائیت دم توڑنے لگی اور انیسویں صدی پوری ہوتے ہوتے اس کی تجہیز و تکفین، تیجہ چہلم سب پورا ہوگیا۔

عیسائیت کی پناہ گاہیں:

آپ صرف اتر پردیش کے مرکزی شہروں میں جائیں تو آپ کو ہر جگہ یا مشن اسکول یا مشن اسپتال یا چرچ اس کے ساتھ کچھ بنگلے اور پارک وغیرہ نظر آئیں گے یہ تبلیغ عیسائیت کے مرکزی مقامات تھے یہیں سے ان کی ساری سرگرمیاں جاری ہوتی تھیں، یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں قائم کئے گئے اور آج بھی وہ رفاہی اداروں یا تعلیمی اداروں کی شکل میں زندہ ہیں۔ پہلے ان مقامات پر بڑی چہل پہل رہتی تھی، دیسی عیسائیوں کی اولاد یہاں تعلیم پاتی تھی، بہترین تعلیمی کارکردگی کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کو مشن اسکولوں میں داخل ہونے کو ترجیح دیتے تھے اسکول کے ٹیچر بالعموم عیسائی ہوتے تھے، ان معصوم بچوں کے ذہن میں مذہب عیسوی کی تخم ریزی کرتے تھے، تمام لڑکوں کو انجیل پڑھنا ضروری تھا، ان کو چرچ میں لے جاکر عبادت کرائی جاتی تھی، مشن اسپتال میں داخل مریضوں کو حضرت مریم کی تصویر کے سامنے لے جاکر ان سے دعا کرائی جاتی تھی، لیکن یہ ساری سرگرمیاں انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے عنقا ہوچکی تھیں، ان مشنوں کی رونق اور چہل پہل رخصت ہوچکی

تھی، چرچ میں دس پندرہ کالے کلوٹے جرائم پیشہ اقوام ڈوم، بھنگی، مسہر اور چماروں کے افراد عیسائیوں کا لباس پہن کر کارٹونوں کی طرح گھومتے پھرتے نظر آنے لگے تھے، یہ تبلیغ عیسائیت کی ناکامی کی انتہا تھی، اس لئے عیسائی مشنریوں نے شہری اور مہذب علاقوں کو ترک کر کے اپنی جدوجہد کا میدان ان علاقوں کو بنایا جہاں پست اقوام تہذیب وتمدن سے عاری ننگ دھڑنگ رہنے والی قومیں تھیں، مرزا پور کے پہاڑی علاقے، مدراس کا ساحلی علاقہ، کیرالہ اور اس کے اطراف وجوانب، ناگالینڈ، میزورم، تری پورہ، منی پور اور اڑیسہ کے جنگلی علاقوں میں جہاں اب بھی تیر کمان لے کر چلنے والے نیم وحشی انسان نیم عریاں مرد اور عورتیں رہتی ہیں تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کیا۔

نیم وحشی اقوام کے یہی مقامات ان کی شکار گاہیں بنیں، ان کی خوراک، پوشاک کا نظم کیا ان کی اولاد کو مشن اسکول میں داخل کر کے سارے اخراجات برداشت کئے اور ان کو لکھا پڑھا کر چھوٹی موٹی نوکریاں دلوادیتے، ان کی لڑکیوں اور عورتوں کو دایہ گیری زچہ گیری اور نرسنگ کی تربیت دے کر ان کی روزی روٹی کا بندوبست کرتے رہے، یہی وحشی اقوام عیسائیوں کے دام تزویر میں آئیں اور آج ایک کروڑ عیسائی جو ہندوستان میں ہیں ان کے آباء، واجداد وہی نیم وحشی قومیں تھیں، مسلمانوں کا غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل فرد بھی عیسائیوں کے دام میں گرفتار نہیں ہوا۔

عیسائیت کا فتنہ اپنی موت آپ مر گیا:

میری اس تفصیلی گفتگو سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ہندوستان میں عیسائیت کس جاہ وطمطراق کے ساتھ آئی تھی، اس کی پشت پر کتنی زبردست طاقت تھی اس کے وسائل وذرائع کتنے بے پناہ تھے، اس کے پاس کتنا بڑا فنڈ اور سرمایہ تھا اور کتنی بڑی کارکنوں کی تعداد تھی؟ یہی عیسائیت اپنے تمام مادی وسائل اور ہر قسم کے اسلحہ سے لیس

ہوکر مسلمانوں پر حملہ آور تھی، دوسری طرف مسلمانوں کا کیا حال تھا؟ اس کی حکومت چھینی جا چکی تھی، اس کے حساس اور بیدار مغز علماء اور رؤسا یا تو پھانسی پر چڑھا دیئے گئے تھے یا کالے پانی بھیجے جا چکے تھے، معاشی اعتبار سے جن مسلمانوں کے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے وہ لوگ اب نان شبینہ کے محتاج ہو چکے تھے، مزید ستم یہ کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے ہر طبقہ کو اور ہر قوم کو اپنا سکتی تھی لیکن مسلمانوں کو اپنا اتنا بڑا دشمن سمجھتی تھی کہ اس کے مادی وجود کو ختم کئے بغیر جیسے اس کو چین ہی نہیں مل سکتا، پھر ایسی بے بسی و مجبوری، مظلومیت و مقہوریت اور بے سروسامانی کے باوجود شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ آنے والی عیسائیت سے ٹکر لی اور عیسائی پادریوں کو ذلت آمیز شکست دی اور عیسائی حکومت کے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، ہندوستان میں علماء حق کا یہ بے مثال تاریخی کارنامہ ہے جسے ہندوستان کی مذہبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، اس فتنہ کا سر کچلنے میں ان لوگوں کا مرکزی کردار تھا جو دارالعلوم دیوبند کے معمار اولیں تھے، تعمیر دارالعلوم سے قبل شخصی طور پر اس کے مدمقابل تھے اور قیام دارالعلوم کے بعد ان بزرگوں نے اور پھر ان کے شاگردوں نے عیسائیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور ہندوستان میں عیسائیت کو ایک محدود خول میں بند کر دیا۔ **فللّٰه الحمد، جزاهم الله خير الجزاء.**

افکارِ عالم

فکر اسلامی کی روشنی میں

جلد دوم

جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

مولانا اسیر ادروی

شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم دیوبند

تفصیلات

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر انتظام

بدرالدین اجمل علی القاسمی، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلۂ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی (   )

نام کتاب : افکارِ عالم فکر اسلامی کی روشنی میں (جلد دوم)
تالیف : مولانا اسیر ادروی
سن اشاعت : شعبان ۱۴۲۹ھ اگست ۲۰۰۸ء
صفحات : ۴۱۶
تعداد اشاعت : بارِ اول، گیارہ سو
کمپیوٹر کتابت : محمد عیاض قاسمی، دیوبند
ہدیہ : =/

ناشر

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

فون: 01336-222429

ترتیب